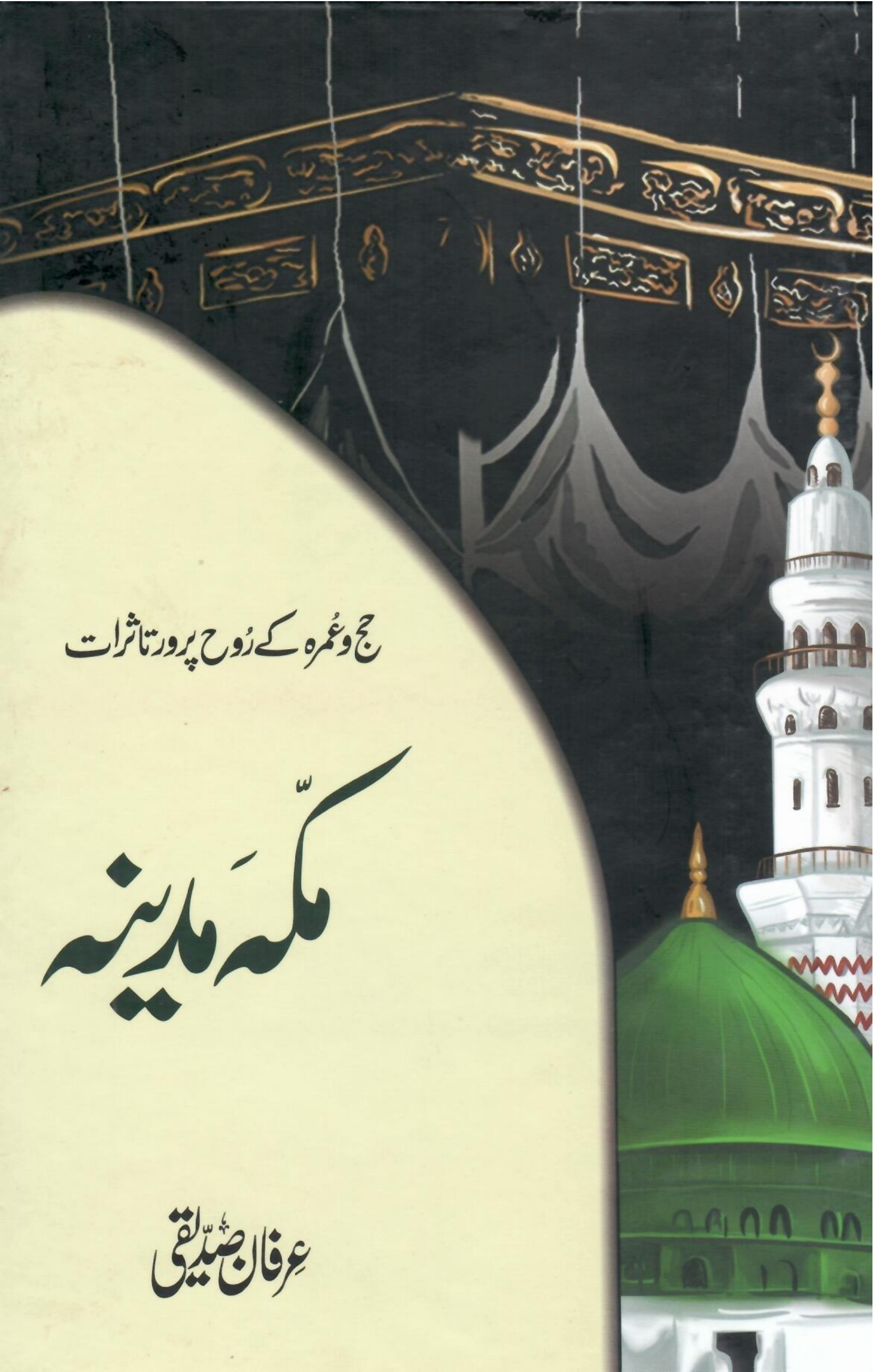


حج و عُمرہ کے رُوح پرور تاثرات

# مکّہ مدینہ

عِرفان صدّیقی

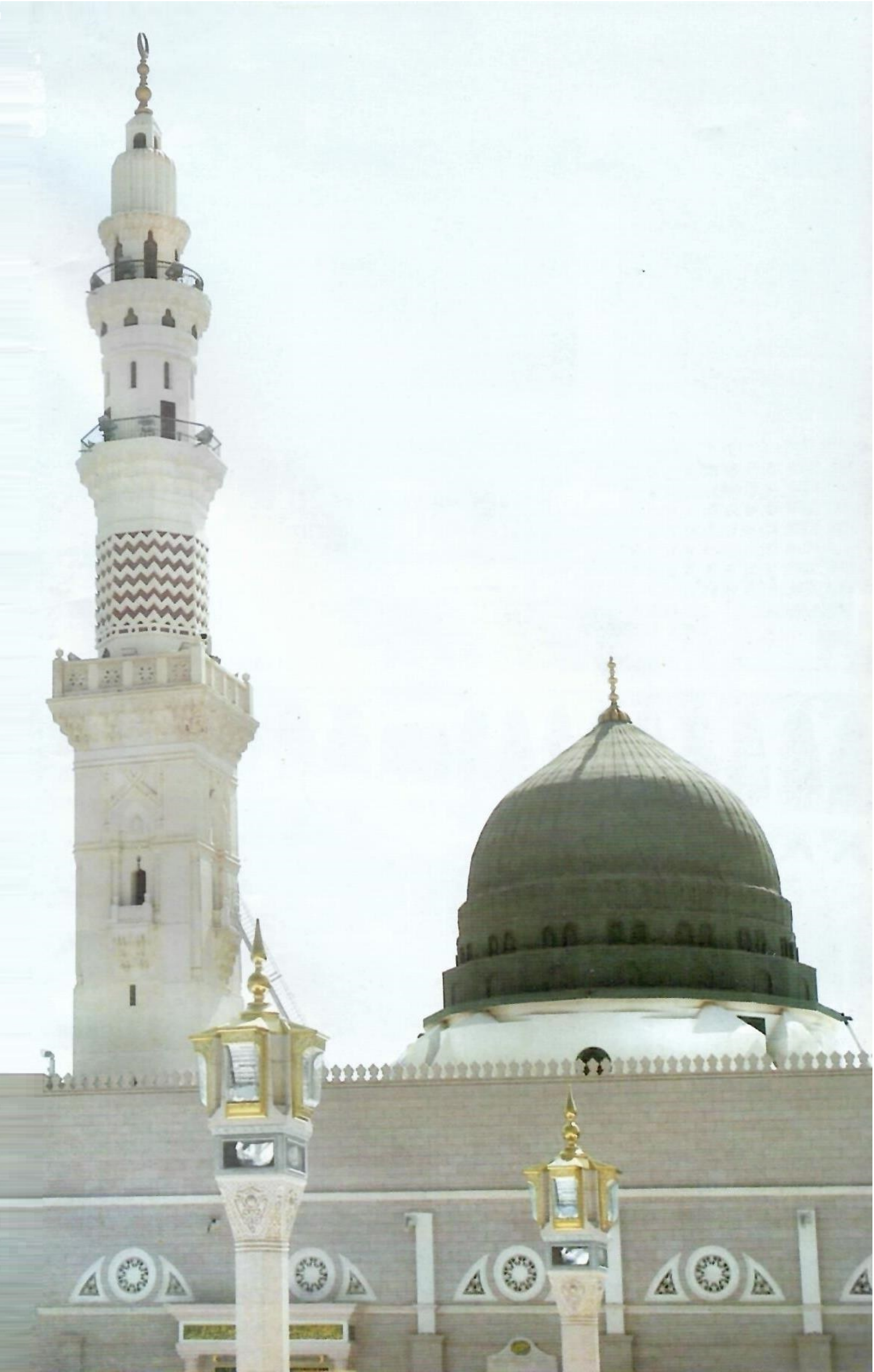
## 1978 میں پہلے حج کے موقع پر
## مدینہ منورہ سے الوداع ہوتے ہوئے

مرا مقام کہ یثرب کی سرزمیں دیکھوں!
مرا نصیب کہ ارض رسولؐ تک پہنچوں!
یہ بات میرے تخیل سے ماوراء تھی کہ میں
نبیؐ کے شہر میں پہنچوں نبیؐ کی نعت کہوں
عجیب سادگیِ عشق کے تقاضے ہیں
کہ خاک ہو کے ثریا کو چومنا چاہوں
یہ داغ داغ جبیں اور یہ تری دہلیز
ترے کرم کے کرشمے تری نظر کا فسوں
میں ایک بندۂ ناچیز راندۂ درگاہ
شکستہ پا و غریب و فتادہ و محزوں
خراب و بےکس و بے چارہ و تہی داماں
شکستہ حال و نحیف و نزار و خوار و زبوں
مری بیاضِ عمل نامۂ سیاہ کی طرح
مرے گناہ شمار و حساب سے افزوں
یہ چاہتا ہوں کہ پہنچوں قریب تر لیکن
قدم اُٹھاؤں تو سو بار ڈگمگا جاؤں
میں کس خیال سے لپٹوں ترے ستونوں سے؟
میں کس طرح ترے روضے کی جالیاں چوموں؟
دعا کو ہاتھ اُٹھاؤں تو لفظ ہی نہ ملیں
یہ سوچتا ہوں کہ مانگوں تو کس طرح مانگوں؟

26/13

محمد كمال الدين
18.04.2012





بسم الله الرحمن الرحیم

# مکہ مدینہ

## حج و عمرہ کے رُوح پرور تاثرات

عرفان صدیقی

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر: فواز نیاز

قیمت: 495/- روپے ریال 30 درھم 30 امریکن ڈالر 20$ پونڈ 15£

اشاعت: 2011ء

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-37213318 فیکس: 042-37213319

تقسیم کنندہ: سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار۔ فون: 042-37220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-32765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔ فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔ فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدر آباد: مکان نمبر 194/8، نزد علی مینشن، لجپت روڈ۔ فون: 022-2780128

جہانگیر بکس

Buy Online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

آصف صدیق پرنٹرز ابراہیم روڈ لاہور نے پرنٹ کی

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفٰے پنہاں بگیر

(اقبالؒ)

''اے خدا! تو دونوں جہانوں سے غنی ہے اور میں ایک درماندہ فقیر ہوں۔ تیرا کرم ہوگا کہ قیامت کے دن میری معافی قبول کر لے اور مجھے بخش دے اور اگر تو کسی وجہ سے میرا حساب کتاب کرنا اور میرے اعمال نامے کا جائزہ لینا ضروری خیال کرے تو اتنا کرم کرنا۔ میری فردِ گناہ، آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں سے چھپا کر رکھنا۔''

والدہ ماجدہ اور والدِ محترم

کے نام

جن کے ہمراہ میں نے پہلی بار مکہ مدینہ دیکھے

# حرفِ اوّل

کچھ کیفیتیں ایسی ہوتی ہیں جب علم، شعور اور آ گہی کی چکا چوند ماند پڑ جاتی ہے، فلسفہ گنگ ہو جاتا ہے، حافظے کی لوح سطحِ آب کی طرح صاف ہو جاتی ہے، پس منظر اور پیش منظر کے سارے نقوش پھیکے پڑ جاتے ہیں، اپنا آپ بھول سا جاتا ہے اور روح کے اندر سے اٹھتی ایک گھٹا انسان کو ہر سمت سے گھیر لیتی ہے۔ یہ گھٹا نہ گرجتی ہے نہ برستی ہے لیکن انسان دور اندر تک بھیگتا اور شرابور ہوتا رہتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان مکہ مدینہ جا کر بھی اس کیفیت سے نہیں گزرتا، اس کے حواس، علم و آ گہی کی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ اس کی گرفت میں رہتے ہیں، اس کے اندر سے کوئی گھٹا نہیں اٹھتی اور وہ ساون بھادوں جیسی بارش میں جل تھل نہیں ہوتا تو وہ یقیناً محروموں میں سے ہوتا ہے۔ شاید مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے۔ یہ اللہ کا اپنے بندے اور نبی رحمت ﷺ کا اپنے امتی سے معاملہ ہے۔ کون جانے کس کی دعا بارگاہ الٰہی میں مستجاب ٹھہرتی اور کس کی ادا درگاہِ نبوی ﷺ میں باریاب ہوتی ہے۔ شاید دعا کے قبول اور ادا کے مقبول ہونے کا کوئی پیمانہ وضع ہی نہیں ہو سکا۔ کون محروم رہا اور کس کی جھولی بھر دی گئی، اس کی خبر پانا آسان نہیں۔ اس کا اندازہ شاید محروم رہنے اور مالا مال ہو جانے والے کو خود بھی نہیں ہوتا۔

مجھے پہلی بار مکہ مدینہ جانے کی سعادت 1978ء میں نصیب ہوئی۔ تب میرے والدین زندہ تھے۔ سفرِ حج کا اہتمام میرے چھوٹے بھائی اعجاز صدیقی نے کیا تھا جو اُن دنوں جدہ میں ملازم تھے۔ والدین کی ہمراہی میں مکہ مدینہ کا قیام اور مناسکِ حج کی تکمیل نُور اور سُرور سے معمور ایسا تجربہ تھا جو تین عشرے گزر جانے کے بعد بھی میرے دل و دماغ میں بکُل مارے بیٹھا ہے۔ اب مکہ بتیس برس پہلے والا مکہ نہیں رہا۔ مدینہ میں بے شمار تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ حرمین شریفین کے آس پاس ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور چھوٹے کچے پکے مکانات کی جگہ اب آسمان کو چھوتی عمارات کے جنگل سے اُگ آئے ہیں۔ دونوں شہروں کی رعنائی جمال آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ ہم کتابوں میں پڑھے مکہ اور مدینہ کو ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں جو اب کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ بس دو حرم ہیں جو عہد بہ عہد اور انتہائی تیزی کے ساتھ توسیع اور جدت سے ہمکنار ہونے کے باوجود خانہ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ کو اپنی آغوش میں لئے بیٹھے ہیں۔ یہی وہ روشن علامتیں ہیں جن کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں سلگتی اور اس کے خوابوں میں مہکتی رہتی ہے۔

اب مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی بار دیارِ حجاز جا چکا ہوں۔ کبھی ارادے اور تیاری کے ساتھ اور کبھی یکا یک بلاوے اور طلبیدگی پر۔ ایک بار اہلِ خانہ کے ساتھ عمرے کا عزم کیا۔ پاسپورٹوں پر ویزے لگ گئے۔ سیٹیں کنفرم ہو گئیں۔ سفری انتظامات کرنے والے صاحب، سامان، پاسپورٹ اور ٹکٹ لے کر ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ پرواز سے کوئی گھنٹہ بھر قبل ہم ہوائی اڈے جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ان صاحب کا فون آیا۔ سعودیہ

ائیر لائنز والوں نے بتایا کہ ان ویزوں کے لئے لگا کوئی خصوصی کوڈ کھل نہیں رہا۔ میں نے سعودی سفیر سے رابطہ کیا۔انہوں نے اپنی سی کوشش کر لی اور مجھے بتایا۔'' سعودیہ میں کوئی پرابلم آرہا ہے مجبوری ہے۔'' گھنٹے بعد ہمارا سامان، پاسپورٹ اور ٹکٹ گھر آ گئے اور ہم ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے چپ چاپ بیٹھ گئے۔

اور یہ 2007ء کا موسم الحج تھا۔ حج میں کوئی پانچ سات دن باقی تھے اور ہم عید قربان کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں کچھ دوستوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا کہیں جا رہا تھا کہ سعودی سفیر عزت مآب عصیری کا فون آیا۔ تفصیل آپ کو کسی کالم میں مل جائے گی۔ مختصر یہ کہ میں اپنی بیگم اور بیٹی کے ہمراہ حجاز جانے والی آخری خصوصی پرواز کے ذریعے حج سے عین ایک روز قبل مکہ معظمہ میں تھا۔ واقعی

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے

2002ء سے اب تک، میں جب بھی حج وعمرہ کے لئے مکہ مدینہ گیا، اپنے تاثرات جذبے کی شدت اور احساس کی حدت کے ساتھ قلم بند کرتا رہا۔ یہ تاثرات ومشاہدات پہلے ''نوائے وقت''، اور بعد ازاں ''جنگ'' میں میرے کالم ''نقش خیال'' میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں خاصی تعداد ایسے کالموں کی ہے جو میری شعوری کاوش کے بجائے واردات قلبی کے عکاس ہیں۔ آخر میں کچھ کالم شہید ناموسِ رسالت ﷺ عامر چیمہ اور جامعہ حفصہؓ لال مسجد کے المناک سانحہ کے حوالے سے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ آخری کالم والدہ ماجدہ کی وفات پر لکھا گیا تھا۔ یہ کالم اُن کی روح کی آسودگی کے لیے اس مجموعے کا حصہ ہے۔

ایک مدت سے میرے قارئین ان کالموں کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اب یہ تقاضا اصرار میں بدل گیا تھا۔ ان کالموں کو جمع کرنے میں میرے بہت سے قارئین کا ہاتھ ہے۔ جواں سال عزیزی عمران شاہد نے تو خاصی تگ ودو کی اور عملاً انہیں مرتب کیا۔ اللہ عمران اور میرے قارئین کو اجر عظیم سے نوازے۔

میں جب بھی دیار حجاز جاتا ہوں، اپنے مرحوم والدین کو ہر کہیں اپنے آس پاس موجود پاتا ہوں۔ اللہ اُن کی قبروں کو مکہ مدینہ کی مشکبو ہواؤں سے بھر دے اور انہیں وہ مقام عطا کرے جو اس نے اپنے نیک بندوں کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ میں یہ عقیدت نامہ اُنہی کے نام سے منسوب کر رہا ہوں۔

اور جہانگیر بکس کے برادر عزیز فواز نیاز اور شاہدہ شفیق کا خصوصی شکریہ جنہوں نے اس میں اپنی محبت و عقیدت کا رنگ بھرتے ہوئے اس کے حسن طباعت پر بھرپور توجہ دی۔

اور آخری التماس کہ اس کتاب کے کسی قاری کو مکہ مدینہ کی سعادت ملے تو وہ مجھ جیسے تہی داماں کو بھی ضرور یاد رکھے۔

عرفان صدیقی

# فہرست

# مدینہ دُور ہے......!

کیا انقلاب آفرین دن ہے کہ جس نے زمانوں کے انداز بدل ڈالے۔ تہذیب انسانی کے قرینے تبدیل کر دیئے۔ انسانیت کی روشن قدروں کو یوں متعارف کرایا کہ اندھیروں کے بطن سے سورج، چاند، ستارے جنم لینے لگے۔ ازل سے ابد تک لامتناہی وسعتوں پر محیط ابرِ کرم، ہر زمانے کی تاریکیوں میں نیزے کی انی بن کر اُترتی روشنی کی جادواں کرن، زمین پر ماتھا رگڑتی زبوں حال قوموں کے لیے عظمت و وقار کا سرمدی پیغام، انسانی فکر و عمل کی لازوال رفعتوں کا امین، نڈھال، شکستہ حال اور لاچار لوگوں کا ملجا و ماوا، خطا کاروں سے درگزر اور بد اندیشوں کے دل میں گھر کرنے والا۔ وہ کہ جس کے نام کی برکتیں لازوال اور جس کے ذکر کی رفعتیں بے کنار ہیں۔ لاکھوں درود اور کروڑوں سلام اُس صاحب جلال و جمال پر کہ جس کا اُمتی ہونا، میرے آباؤ اجداد کا سرمایہ افتخار تھا، جو میرا توشۂ آخرت ہے اور جو قیامت تک میری آنے والی نسلوں کا اثاثۂ سعادت رہے گا۔

12 ربیع الاوّل کا مبارک دن ڈھل رہا ہے۔ اہل پاکستان کے دل عشق رسول ﷺ کی دائمی خوشبو سے مہک رہے ہیں اور عقیدت کی شفق سے اُن کے چہرے گلنار ہوئے جا رہے ہیں۔ فضاؤں میں بکھری، نعتوں کی مشکبو گونج کیف و سرور کی لذتیں بکھیر رہی ہے...... لیکن میری آنکھیں شدتِ غم سے سلگ رہی ہیں۔ اگر میں شہر جاناں تک پہنچ پاتا تو روضہ اقدس کی دیواروں سے لپٹ کر اتنا روتا اتنا روتا کہ میرا سارا بدن تحلیل ہو جاتا۔ میری خاک کوئے دلدار کی گلیوں میں بکھر جاتی۔ میں رحمت دو عالم ﷺ سے وہ سب کچھ کہتا جو صحرا کے بگولے کی طرح میرے سینے میں گھمن گھیریاں ڈال رہا ہے اور جو کہنا چاہوں تو کہہ نہیں سکتا، لکھنا چاہوں تو لکھ نہیں سکتا۔ آگہی کا آشوب میرے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ میری نس نس میں چنگاریاں سی بھر گئی ہیں۔ میری ہر سانس خنجر کی طرح دل کو چھید رہی ہے......اور مدینہ دُور ہے!

میں ابھی تک افغانستان کے سادہ و معصوم شہیدوں کے دُکھ سے سنبھل نہیں پایا۔ پھول جیسے بچے خاک و خون میں نہا گئے۔ کتنی ہی عفت مآب بیٹیاں، پت جھڑ کی رُت کا خس و خاشاک ہو گئیں۔ گلابی گالوں اور شہابی آنکھوں والی کوہ قاف کی پریاں، امریکہ کے بازاروں میں نیلام ہو گئیں۔ لمبی عباؤں، بھاری پگڑیوں اور گھنی ڈاڑھیوں والے اہل جنون قلعہ جنگی کے زندانوں اور تورا بورا کے غاروں کا رزق ہو گئے۔ ملا محمد عمر جیسا صاحب ایمان ویقین، نامعلوم پہاڑوں اور بے نام گھاٹیوں کی طرف دھکیل دیا گیا۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ سب کچھ بھول جاؤں۔ کبھی شمالی اتحاد کی فرماں روائی کے بارے میں سوچتا ہوں، کبھی حامد

کرزئی کے دل کشا تصور سے دل بہلاتا ہوں۔ کبھی کابل میں کُھل جانے والے میکدوں کا خیال کرتا ہوں۔ کبھی موسیقی کی تانوں کا تصور کرتا ہوں۔ لیکن دل ہے کہ بہلتا نہیں۔ کبھی لاٹھی ٹیکتا ملا حسن رحمانی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی قندھار کا وجیہہ و شکیل مروجری، کندھے پر کالی چادر ڈالے پاس سے گزر جاتا ہے۔ کبھی ایک غریب و سادہ سی قبر سے نعت کے زمزمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ کبھی احمد شاہ بابا کے مزار کے پہلو میں بنی پُر شکوہ عمارت میں رکھے تین جستی صندوقوں کا خیال بے کل کر دیتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں طالبان کی رگ گلو پر خنجر چلا رہا ہوں، میرے ہاتھ کہنیوں تک لہو سے لتھڑ گئے ہیں اور میں چیخ روکنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیتا ہوں لیکن سسکیاں رُکنے میں نہیں آتیں۔

پھر مجھے بوسنیا کا خیال آتا ہے جہاں چشم فلک نے بربریت کو عریاں حالت میں دیکھا۔ مجھے مانسہرہ کی ہری بھری شاداب ڈھلوانوں کے آس پاس پھیلے، گورے چٹے، گلابوں کی طرح دہکتے چہرے یاد آ جاتے ہیں جنہیں میں نے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ مجھے فلسطین کے آتش بجانوں کا خیال آتا ہے جو اسرائیل کی ریاستی دہشت گردی کا ایندھن بن گئے۔ مجھے جنین کے مہاجر کیمپ کا خیال آتا ہے جہاں ''امن کے سفیر'' نے ایک بار پھر صابرہ اور شتیلہ کی انسانیت سوز تاریخ دہرائی ہے۔ مجھے امام شامل کی سرزمین شیشان (چیچنیا) کی یاد آتی ہے جو روس کے پنجہ استبداد میں جکڑی سسک رہی ہے۔ میں یہ سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن دل کی دھڑکنیں قابو میں نہیں آتیں۔ میں ڈھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا ہوں لیکن تماشا بن جانے کے خوف سے ڈر جاتا ہوں۔ بے چارگی اور بے بسی زہریلے ناگ کی طرح ڈسنے لگی ہے۔ اور...... مدینہ دُور ہے!

اب مجھے بتایا جا رہا ہے کہ پاکستان نے اپنی سرزمین ہر قسم کی دہشت گردی کے لیے بند کر دی ہے۔ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین، مجاہد اول سردار محمد عبدالقیوم خان ''جہاد اصغر'' کے دنوں میں آزاد کشمیر کو تحریک حریت کا بیس کیمپ کہا کرتے تھے۔ اب خبر آئی ہے کہ بیس کیمپ ''جہاد اکبر'' کی نذر ہو گیا ہے اور طے پایا ہے کہ وہاں سے بھی حریت کی کوئی للکار نہیں اُٹھے گی۔ کولن پاول کے فون تھمنے میں نہیں آ رہے۔ برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کہتا ہے کہ ''پاکستان کو دہشت گردی بند کرنا ہوگی۔'' جاپان کا وزیر اعظم یہی سندیسہ دیتا ہے۔ یورپی یونین کا کمشنر برائے اُمور خارجہ ''کرس پیٹن'' کہتا ہے کہ ''پاکستان کچھ کرے ورنہ بھارت کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو ہے۔'' کوفی عنان کہتا ہے ''تمہارا خط مل گیا لیکن پہلے دہشت گردی بند کرو اور 12 جنوری کی تقریر کو عملی جامہ پہناؤ۔'' امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا نائب ترجمان ''فلپ ریگر'' کہتا ہے ''بھارت کا غم و غصہ بجا ہے۔ پاکستان ضروری اقدامات کرے۔'' امریکہ اور روس کے صدر مل کر آواز لگاتے ہیں ''ریاستی حمایت یافتہ دہشت گردی بند کی جائے۔'' واجپائی بتاتا ہے کہ ''جنگ کے بادل چھٹ گئے ہیں۔'' اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ موسم نے اچانک یہ کروٹ کیسے لی ہے؟

نہ جانے کیوں میرا دل جھیل ڈل کے نیلگوں پانیوں میں غوطے کھا رہا ہے۔ اَسّی ہزار نورانی قبریں اور اُن کے اُوپر ہلکے پھلکے لطیف بادلوں کی طرح اُڑتی معصوم رُوحیں مجھے کچھ یاد دلا رہی ہیں۔ میں ندامت کے بوجھ سے نڈھال آنکھیں چرا رہا ہوں لیکن ایک سیل ہے کہ کسی آن موج خون کی طرح میری آنکھوں سے رواں ہونے کو ہے۔

12 ربیع الاوّل کی دوپہر ڈھل رہی ہے۔ سلام درود کی محفلیں رات گئے تک جاری رہیں گی۔ میں گھر کے ایک کونے میں جھولی پھیلائے کھڑا ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک رکھے ہیں کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ لیکن لاوہ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

میں ڈھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا ہوں لیکن مدینہ دُور ہے۔ بہت دُور ہے۔

اِدھر بھی کوئی ابر رحمت کا چھینٹا
اِدھر بھی نظر بے سہاروں کے والی

[26-05-2002]

# ہر ایک آنکھ کی ٹھنڈک، ہر ایک دل کا سرور

بے پایاں رحمتوں، لامحدود شفقتوں، بے کراں عنایتوں، جاودانی محبتوں اور بے انتہا برکتوں والا عظیم دن۔ اُفق تا اُفق پھیلی دائمی روشنیوں کی تابندہ علامت۔ زندگی کے اُجلے قرینوں، شفاف جذبوں اور مصفی سوچوں کا امین دن جو حیات انسانی کے ہر گوشے میں نور افشاں ہے۔ جو اَنفس و آفاق پر ٹھنڈی چھاؤں کے سکوں بخش خیمے کی طرح تنا ہوا ہے۔ وہ ایک دن جو زمانوں پر محیط ہے۔ درود و سلام کی محفلیں، نعت کے زمزمے، معطر تذکروں سے مشکبو اجتماعات، پھیلے ہوئے دامن، دعاؤں بھرے ہاتھ، کپکپاتے ہونٹ، اشکبار آنکھیں، جگمگاتی پیشانیاں، تمتماتے چہرے۔

لیکن عشق و محبت کے ان مظاہر کے باوجود زندگی بدل کیوں نہیں رہی؟ ہمارے دلوں میں وہ گداز کیوں پیدا نہیں ہو رہا جو دعاؤں کو مستجاب اور رحمتوں کو بے حساب کر دیتا ہے؟ ہمارا تن بدن اتنا ویران کیوں ہو گیا ہے کہ سینے میں نہ کوئی چراغ آرزو ہے نہ شرارِ جستجو۔ ہماری طلب کا شجر اتنا بے ثمر کیوں ہے؟ ان منور تعلیمات کا عکس جمیل ہمارے کردار و عمل کے کسی پہلو میں جلوہ گر کیوں نہیں ہو رہا جن تعلیمات نے صحرائے عرب کے حدی خوانوں کو زمانے کا پیشوا بنا دیا تھا؟ ہم کہ گالیاں کھا کر دعائیں دینے والے کا اسم مبارک آتے ہی اُنگوٹھے چوم لیتے ہیں، باہمی نفرتوں اور کدورتوں کی آگ میں کیوں بھسم ہو رہے ہیں؟ امیری میں فقیری کرنے والے کے غلام ہو کر بھی ہماری ہر سانس آسائشوں اور آرائشوں کی آلائشوں سے کیوں بندھی ہے؟ ہم جو میلاد محمد ﷺ کے حوالے سے تقریبات سجاتے اور اپنا جوہر خطابت دکھانے کے لیے حرف و بیاں کی طرحداریوں اور لہجے کی طراریوں کو نکتہ کمال پر لے جاتے ہیں، اپنی نجی زندگی میں اتنے چھوٹے کیوں ہو جاتے ہیں کہ اقتدار کی راہ داریوں میں حشرات الارض کی طرح رینگنے کو بھی سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں؟ میلاد ﷺ کے جلسوں میں ہماری شعلہ بیانی، چند ثانیوں کے اندر اندر صاحبان جاہ و حشم کی قصیدہ خوانی میں کیسے ڈھل جاتی ہے؟ شہنشاہ کون و مکاں ﷺ کی جوتیوں کی خاک ہونے کو سعادت کبریٰ سمجھنے والے چھوٹی چھوٹی لذتوں اور ذرا ذرا سی رعایتوں کے لیے اپنے آپ کو جنس بے مایہ کیوں بنا لیتے ہیں؟ عشق مصطفیٰ ﷺ کو اپنا اعزاز و امتیاز بنانے والے، بدلتے موسموں کے حضور عجز و انکسار کی تصویر بن جانا کیسے گوارا کر لیتے ہیں؟ ان کی آنکھیں سیر اور ان کے دل غنی کیوں نہیں ہوتے؟ درود و نعت کی سوغاتوں اور درد بھری مناجاتوں کے باوجود سورج سوا نیزے پر کیوں کھڑا ہے؟

آج کسی اُلجھن میں پڑنے، کسی مسئلے میں اُلجھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ کوئی پچیس سال پہلے والدین کے

ہمراہ فریضہ حج کی ادائیگی کے دوران، مدینہ منورہ میں قیام اور وہاں سے رُخصت ہوتے ہوئے ایک عجیب وغریب سی کیفیت خود بخود شعروں میں ڈھلنے لگی تھی۔ یہ اشعار انہی دنوں ایک شعری انتخاب کا حصہ بنے تھے۔ آج میں آپ کو بھی اس کیف میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

مرا مقام کہ یثرب کی سرزمیں دیکھوں!
مرا نصیب کہ ارضِ رسول ﷺ تک پہنچوں!
یہ بات میرے تخیل سے ماوراء تھی کہ میں
نبی ﷺ کے شہر میں پہنچوں نبی ﷺ کی نعت کہوں
عجیب سادگی عشق کے تقاضے ہیں
کہ خاک ہو کے ثریا کو چومنا چاہوں
یہ داغ داغ جبیں اور یہ تری دہلیز
ترے کرم کے کرشمے تری نظر کا فسوں
میں ایک بندۂ ناچیز راندۂ درگاہ
شکستہ پا و غریب و فتادہ و محزوں
خراب و بے کس و بے چارہ و تہی داماں
شکستہ حال و نحیف و نزار و خوار و زبوں
مری بیاض عمل نامۂ سیاہ کی طرح
مرے گناہ شمار و حساب سے افزوں
یہ چاہتا ہوں کہ پہنچوں قریب تر لیکن
قدم اُٹھاؤں تو سو بار ڈگمگا جاؤں
میں کس خیال سے لپٹوں ترے ستونوں سے؟
میں کس طرح ترے روضے کی جالیاں چوموں؟
دعا کو ہاتھ اُٹھاؤں تو لفظ ہی نہ ملیں
یہ سوچتا ہوں کہ مانگوں تو کس طرح مانگوں؟
حضور ﷺ رحمت کون و مکاں ہے آپ کا نام
ہر ایک درخت کا سایہ، ہر ایک چھت کا ستوں
ہر ایک درد کا درماں، ہر ایک غم کی دوا
ہر ایک آنکھ کی ٹھنڈک، ہر ایک دل کا سکوں

یہ تیرے دامن رحمت سے ہے بعید کہ میں
تری گلی سے تہی دست لوٹ کر جاؤں
حضورﷺ آپ کی دہلیز پر کھڑا ہوں میں
جو آپ سے نہ کہوں حال دل تو کس سے کہوں
حضورﷺ کب سے ہوں ناآشنائے لذتِ عشق
نہ میری آنکھ میں آنسو نہ میرا دل پُر خوں
نہ میں جنوں سے شناسا نہ شوقِ آبلہ پا
نہ چشم نم، نہ تمنائے غم، نہ سوزِ دروں
حضورﷺ میری نظر خوگرِ تماشا ہے
حضورﷺ آتشِ خاموش کو ترستا ہوں
حضورﷺ بارگہ فیض سے عطا ہو مجھے
وہ کیف و درد کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں
وہ آگ دے کہ پگھل جاؤں موم کی صورت
حریم دل کو اُجالوں مثالِ شمع جلوں
مرے وجود کی قاشیں بکھر بکھر جائیں
میں تیرے شہر کی گلیوں کی دُھول بن جاؤں
عطا ہو دولت عرفان و آگہی مجھ کو
ہزار کوس پہ جا کر بھی تیرے پاس رہوں

میں نے کوئی سال بھر پہلے ایک کالم لکھا تھا "مدینہ دُور ہے"۔ مدینہ اُس دن سے مجھے آواز دے رہا ہے۔ ہر سانس پر قدرت رکھنے والے مالک و خالق نے چاہا اور رحمت دو جہاں ﷺ کی کرم فرمائی ہوئی تو اس ماہ کے اواخر میں دیارِ پاک جانے کا قصد ہے۔ سانسیں ابھی سے اُکھڑ رہی ہیں اور آنکھیں ابھی سے سلگنے لگی ہیں۔

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

[15-05-2003]

# مکہ مدینہ (1)

رات کا آخری پہر اپنا دامن سمیٹ رہا تھا کہ میں حرم کعبہ میں داخل ہوا۔ وہ حرم کعبہ جہاں رات نے کبھی قدم ہی نہیں رکھا اور جہاں ازل سے ابد تک اُجالوں کا راج ہے۔ میں باب عبدالعزیز سے گزر کر صحن حرم میں داخل ہو رہا تھا اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔ یکا یک اذان فجر کی نورانی گونج کچھ اس انداز سے بلند ہوئی کہ میری دیوارِ جاں تک لرز گئی۔ اللہ کی کبریائی کا اظہار کرتے، اُس کی وحدانیت اور حضور ختمی مرتبت ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتے فوز و فلاح کی روشن راہوں کی طرف بلاتے خالق ارض و سما کے حضور سجدہ ریز ہونے کی تلقین کرتے اور رُوحِ بلالی کے گداز میں گندھے وہ مشکبو کلمات جو چودہ سو سال سے کرہ ارضی کے ہر گوشے میں ہمہ وقت بلند ہو رہے ہیں۔ غلاف کعبہ کو چومتے، حرم کی جگمگاتی محرابوں اور نور میں نہائے میناروں سے قوس در قوس بغل گیر ہوتے اور مکہ کی فضاؤں میں دائرہ در دائرہ بکھرتے کلمات نے میرے قلب و احساس میں عجیب سی ہلچل پیدا کر دی۔ نگاہیں خانہ کعبہ پر پڑیں اور اس کے بعد کی کہانی حرف و بیاں کی وسعتوں میں سمیٹی نہیں جا سکتی۔

جب 7 اکتوبر 2001ء کے دن، امریکہ نے افغانستان کے جنگ زدہ مفلوک الحال عوام کے خلاف اپنے کروسیڈ کا آغاز کیا تو میرا دل دُکھ سے اس قدر بھر گیا کہ زندگی کا رنگ ڈھنگ تبدیل ہونے لگا۔ رات کی سیاہی پھیلتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے گھر کی چھت کے عین اُوپر سے کوئی امریکی طیارہ گزر رہا ہو گا جو تھوڑی دیر بعد کابل یا قندھار یا ہرات یا نہ جانے کہاں، ٹنوں بارود گرائے گا۔ نیند اُڑ جاتی۔ اذیت ناک وسوسے دائرہ در دائرہ بھنور بنانے لگتے جیسے صحرا میں کوئی بگولہ سا اُٹھتا ہے یا جیسے ٹھہرے پانی کی جھیل میں کنکر پھینکنے سے حلقے ٹوٹنے بننے لگتے ہیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ میری کھلی آنکھیں بنجر پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بنی گارے کی کچی بستیوں پر ڈیزی کٹر بموں کی ایسی برسات دیکھتیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ بغیر بستر کی کھرّی چارپائیوں پر اپنی شکستہ حال ماؤں کی بانہوں سے لپٹے معصوم بچوں کے پرخچے اُڑتے دیکھتا اور کھلی کھڑکیوں سے آتی اکتوبر کی خنک ہواؤں کے باوجود میرا کمرہ بارود کی بو سے بھر جاتا اور میں چپکے سے دروازہ کھول کر کھلی فضا میں چلا جاتا۔ وہ دن اور وہ راتیں بھی کس قیامت کی تھیں۔ تب صرف وسوسے، واہمے اور خدشے ہی تھے۔ تب ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت پاکستان نے اس جہادِ اکبر میں شرکت کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور ہماری سرزمین یا اس کی فضا کسی جنگی کارروائی کے لیے ہرگز استعمال نہ ہو گی۔ تب کسی کو معلوم نہ تھا کہ شہاب الدین غوری، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کی

آل اولاد پر ستاون ہزار آٹھ سو حملے پاکستان کی زمین اور فضا سے ہوئے۔ بے خبری کے باوجود زندگی کی ہر سانس صحرا کی دہکتی ریت پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور میرا بہت جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی پوٹلی اُٹھاؤں اور مکہ مدینہ جا کر اتنا روؤں کہ میرا وجود تحلیل ہو جائے۔ میں ایسا نہ کر سکا اور پھر کوفہ و بغداد سے شعلے اُٹھنے لگے۔علی اسماعیل کے کٹے بازوؤں اور فلوجہ کے جواں مرگ بیٹوں کا نوحہ لکھتے وقت میرا قلم ہچکیاں لیتا اور میرا دل مکہ مدینہ کے لیے مچلتا رہا کہ شاید رحمت و عافیت کے ٹھنڈے خیموں تلے بیٹھ کر میری بے کلی کو قرار آ جائے۔ میرے آنسوؤں کا بند ٹوٹ جائے اور میرے اندر تنے سارے جالے صاف ہو جائیں لیکن دیر ہوتی رہی۔

مئی کے اوئل میں میں نے طے کر لیا کہ انشاء اللہ اختتام پر عمرہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جاؤں گا۔ 24 مئی کی تاریخ کا تعین بھی ہو گیا کہ اچانک امریکہ بیچ میں کود پڑا۔ میرے دل میں دنیا دیکھنے اور لوگوں سے ملنے کی خواہش اُس وقت سے ہے جب میں راولپنڈی کے ایک سکول میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ڈرائنگ پڑھانے والے وضع دار اور طرح دار اُستاد نے کمرہ تدریس میں ایک خوبصورت پینٹنگ آویزاں کر رکھی تھی۔ سربلند سرسبز پہاڑ، شفاف دریا، رنگا رنگ پھول، چرند پرند، آبادی، لوگ، اس تصویر کے نیچے ایک مختصر سی قرآنی آیت لکھی تھی جس کا ترجمہ تھا...... ''کیا تم دنیا کی سیر و سیاحت نہیں کرتے؟'' ہم جیسے لوگ کہ عمر بھر وسائل اور مسائل کی کشمکش میں سرمہ ہوتے رہتے ہیں، دنیا دیکھنے اور اہل دنیا سے ملنے کی خواہش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتے۔ میں عمرے کے پروگرام کی تفصیلات طے کر رہا تھا کہ شکاگو میں قائم امریکی پاکستانیوں کی ایک تنظیم کا خط ملا۔ انہوں نے مجھے 21 سے 25 مئی تک امریکہ آنے کی دعوت دی تھی اور ٹکٹ کا اہتمام بھی کر دیا تھا۔ دوستوں نے کہا کہ ضرور جاؤ اور واپسی پر عمرہ بھی کر آؤ۔ میرے اندر وسوسوں کی دُھند چھانے لگی۔ شکاگو سے پُراصرار فونوں کا تانتا بندھ گیا۔ میرا دل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ اچانک روشنی کی ایک کرن سی پھوٹی ''میرے پاس تو امریکی ویزا ہی نہیں۔ اور یہ جوئے شیر لانا کوئی آسان کام بھی نہیں۔'' میں نے شکاگو کے دوستوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایک طریقہ سوچا۔ ویزے کی درخواست دوں گا 16 مئی تو ہو چکی ہے اتنی جلدی ویزا لگنے کا امکان ہی نہیں۔ سو بات رہ جائے گی۔ میں نے ویزا فارم پُر کیا۔ جمعہ 16 مئی صبح آٹھ بجے امریکن سفارت خانے کے متعلقہ سٹاف سے بات کی انہوں نے کہا کہ آ جایئے۔ ساڑھے آٹھ بجے صبح مجھے امریکن سینٹر کے گیٹ پر ہی ایک خط تھما دیا گیا اور کہا گیا کہ امریکن ایکسپریس کے دفتر چلے جائیں۔ 9 بجے وہاں پہنچا۔ انہوں نے فیس وصول کی۔ پاسپورٹ دیکھا۔ فارم ملاحظہ کیا اور کہا کہ آپ امریکی سفارت خانے تشریف لے جائیں۔ پونے دس بجے میں ایمبیسی پہنچ گیا۔ دس بجے کے لگ بھگ ایک امریکی اہلکار نے شرف ملاقات بخشا۔ ''السلام علیکم'' کہہ کر اُس نے گفتگو کا آغاز کیا جو صرف اڑھائی منٹ جاری رہی۔ اُس نے کہا......

''آپ آدھ گھنٹے بعد دوبارہ آ جائیں۔'' قریب ہی میرے شاگردعزیز ایس پی احسان صادق کا دفتر تھا۔ میں وہاں جا بیٹھا۔ چائے پی۔ آدھا گھنٹے بعد میں واپس آیا تو اُسی اہلکار نے مسکراتے ہوئے میرا پاسپورٹ مجھے تھما دیا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ پانچ سال کا ملٹی پل ویزا لگا تھا۔ میری ساری سکیم غارت ہوگئی۔

ساڑھے آٹھ بجے شروع ہونے والی کارروائی ساڑھے دس بجے ختم ہوگئی۔ مشوروں کی ایسی برکھا برسی کہ جل تھل ہوگیا۔ لیکن دل میں ایک پھانس سی چبھی تھی اور چین نہیں آ رہا تھا۔ میں امریکہ جانا چاہتا تھا۔ اُن لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ اُنہیں بتانا چاہتا تھا کہ میرا قلم تمہارے خلاف کیوں زہر اُگل رہا ہے...... لیکن مکہ مدینہ بیچ میں کھڑا تھا۔ میں نے 20 مئی کی صبح عمرے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔ اپنے دوست خالد بٹ کے دفتر گیا۔ سیٹ کنفرم کروائی۔ ٹکٹ پر او کے سٹکر لگوائے۔ عمرہ کسی بھی وقت ہوسکتا تھا لیکن ''امریکی مداخلت'' کے باعث 24 مئی کی تاریخ میری ضد سی بن گئی۔ ہاں اگر عمرے کے بعد امریکی پاکستانیوں کے پروگرام میں شرکت ممکن ہوتی تو میں ضرور جاتا۔ جس وقت خالد بٹ، کنفرم ٹکٹ لفافے میں ڈال کر میرے حوالے کر رہا تھا میرے موبائل فون پر گھنٹی بجی۔ تجسس، بھید اور حیرت کے لبادوں میں لپٹا یہ فون ایک پوری کہانی بیان کرتا ہے لیکن اس حکایت کو کچھ دنوں کے لیے اُٹھا رکھیے۔

میں پچھلے تین دنوں سے مکہ معظمہ میں ہوں۔ اس سے کیا مانگوں؟ وہ تو دلوں کی عمیق ترین گہرائیوں کے اندر سات غلافوں میں لپٹی آوازوں سے بھی باخبر ہے۔ وہی شعر گنگنا کر خاموش ہو جاتا ہوں جو 1978ء میں اِسی شہر جمال میں کہا تھا۔

رحمتیں بھیج عنایات کی ارزانی کر
مجھ کو مہمان بلایا ہے تو مہمانی کر

[27-05-2003]

# مکہ مدینہ (2)

اللہ کا گھر ہر لمحہ، ہر ثانیہ، ہر پل یونہی آباد رہتا ہے۔ عقیدتوں سے نہال، محبتوں سے مالا مال، کعبۃ اللہ کے گرد، دن رات اور دھوپ چھاؤں کی تمیز کے بغیر خلق خدا کا دائرہ پیہم حرکت میں رہتا ہے۔ رُکن یمانی کی طرف لپکتے ہاتھ کبھی ساکت نہیں ہوتے۔ حجر اسود کے رُخساروں پر عشق کی تمازت سے دہکتے بوسوں کی برسات کبھی نہیں تھمتی۔ ملتزم سے لپٹے سینہ چاکان حرم کی وارفتگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ مقام ابراہیم علیہ السلام سے قریب تر ہو کر سجدہ ریز ہونے کے آرزومند آج بھی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ تشنگان عشق آب زمزم سے سیراب ہونے کے لیے مچلتے رہتے ہیں۔ میزاب رحمت کے عین نیچے، حطیم کے نیم دائرے میں نوافل ادا کرنے والوں کی بے کلی کا چودہ سو سال سے یہی عالم ہے۔ صفا و مروہ کی عفت مآب پہاڑیوں کے درمیان قافلہ شوق صدیوں سے رواں دواں ہے۔

حرم کعبہ ہمیشہ کی طرح آج بھی آباد ہے۔ ابھی عمرہ کا موسم عروج پر نہیں آیا۔ پاکستانیوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن دنیا کے ہر خطے سے آئے اہل حرم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ایران، ترکی اور انڈونیشیا سے آئے عشاق کی تعداد سب سے نمایاں ہے۔ **لبیك اللهم لبیك** کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ چہرے عقیدت کی آنچ سے تمتما رہے ہیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب جاری ہیں۔ آہیں اور سسکیاں تھمنے میں نہیں آرہیں۔ مرد بھی، عورتیں بھی، بچے بھی، بڑے بھی، جوان بھی اور لب گور پہنچ جانے والے بھی۔ کچھ طواف کر رہے ہیں، کچھ نوافل ادا کر رہے ہیں اور کچھ سعی میں مصروف ہیں۔ کچھ تسبیح پر اوراد و وظائف پڑھ رہے ہیں۔ کچھ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں اور کچھ گردوپیش سے بے نیاز خانہ کعبہ پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ان سب کے دل عبودیت اور بندگی کے احساس سے لبالب بھرے ہیں۔ سب اپنی خطاؤں پر نادم ہیں۔ سب خدائے رحیم و کریم سے عفو و درگزر کے خواستگار ہیں۔ سب کی گردنیں عجز و انکسار سے جھکی جا رہی ہیں۔ سب آلائشوں بھری دنیا سے کٹ کر ایک ایسے جزیزۂ عافیت میں آبیٹھے ہیں جہاں زندگی کا انداز و اُسلوب بدل گیا ہے۔ جہاں فکر ایک فرحت بخش آسودگی اور رُوح ایک طمانیت بھری بالیدگی محسوس کر رہی ہے۔ جہاں نئے انسان تخلیق ہو رہے ہیں۔ جہاں آلودگیوں سے پاک اور منزہ مخلوق سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا دم بھرنے والی ہر سانس اُس کی خوشنودی اور رضا جوئی کی ڈور سے باندھے رکھنے والی ماضی پہ شرمسار، حال پر نادم اور مستقبل کے لیے نیکوکاری کا عہد کرنے والی مخلوق، انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلی مسلم ریاستوں میں بسنے والے، غیر مسلم ممالک میں

اقلیتوں کی زندگی گزارنے والے سب کھنچے چلے آرہے ہیں۔ چودہ سو سال سے صحن حرم یونہی آباد ہے۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی ابابیلوں کے جھنڈ اسی طرح اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے ہیں اور حرم کا معطر دالان سرمئی کبوتروں سے لبالب بھرا ہے۔

لیکن ایسا کیوں ہے کہ ہم لوگ جو حرم میں داخل ہوتے ہی اپنے اندر ایک جہاں نو کروٹیں لیتا محسوس کرتے ہیں اور ہمارے احساس و خیال کی دنیا میں زلزلہ سا بپا ہو جاتا ہے حرم سے نکلتے اور اپنے آشیانوں کو لوٹتے ہی، سارے لطیف احساسات اور ساری منوّر سوچوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایک اُجاڑ اور سوکھا سڑا پیڑ یکایک ہرے بھرے پتوں، خوش رنگ پھولوں اور رسیلے پھلوں سے بھر جاتا ہے اور پھر ایکا ایکی اس کے برگ وثمر جھڑنے لگتے ہیں اور وہ پہلے جیسا ٹنڈ منڈ خزاں رسیدہ درخت بن جاتا ہے۔

مسلم ممالک مسلسل گرداب بلا کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے افغانستان آگ اور خون میں نہا گیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بصرہ و بغداد پر قیامت ٹوٹ گئی۔ فلسطین، کشمیر اور چیچنیا میں درندہ صفت سامراجوں کی بھوک مٹنے میں نہیں آرہی۔ ہم کہ سوا ارب سے زائد سر اور اس سے دُگنے ہاتھ رکھتے ہیں۔ بے چارگی اور بے بسی کی تصویر بنے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ تماشا نہیں دیکھ رہے بلکہ خود اپنے کندھے ان بندوقوں کو پیش کر رہے ہیں جو ہمارے جیسے اہل حرم کے سینے چھلنی کر رہی ہیں۔ اب تو دست ستم گر خود بول اُٹھا ہے کہ افغانستان کے جگر چاک کرنے والے سارے میزائل پاکستان کی سرزمین اور فضاؤں سے برسائے گئے۔ عراق پر برسنے والی آگ کا ہر شعلہ پاس پڑوس کے اسلامی ممالک کی بھٹیوں میں تخلیق ہوا۔ اگر اس کھیل کو محض حکمرانوں کی مفاد پرستی قرار دے ڈالیں، تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوا ارب انسان کیا کر رہے ہیں؟ اگر اتنی چنگاریاں بھی بہم ہو جائیں تو جانے کتنے سامراج بھسم ہو جائیں لیکن ایسا کیوں نہیں ہو رہا؟ ممکن ہے اس سیاہ بختی کا ایک سبب سائنس اور ٹیکنالوجی سے محرومی بھی ہو۔ لیکن بلا شبہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عشق کی آگ بجھ چکی ہے اور مسلمان راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔ ہماری صفیں کج، دل پریشاں اور سجدے بے ذوق ہیں۔ ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت سرد پڑتی جا رہی ہے اور ہمارا کردار و عمل ان تعلیمات سے دُور ہوتا جا رہا ہے جو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہم تک پہنچائیں۔ اسلام نے فوز و فلاح اور فتح و نصرت کے لیے بعض کڑی شرائط رکھی ہیں۔ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے ہر فرد پر ان شرائط کی پابندی لازم ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو ان شرائط کے سانچے میں نہیں ڈھالتا تو وہ اللہ کی تائید و حمایت کے استحقاق سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بندہ مومن کے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اُس کا ہاتھ، اللہ کا ہاتھ نہیں رہتا۔ نہ غالب و کار آفریں نہ کار کشاؤ کارساز۔

میں حجر اسود کے عین سامنے بیٹھا، غلاف کعبہ پر نظریں جمائے سوچتا رہا کہ ایسی ہریالی، ایسی زرخیزی اور ایسی شادابی کے بعد بھی ہمارے دل و نگاہ کا شجر یکایک ٹنڈ منڈ کیوں ہو جاتا ہے؟ حج اور عمرے، طواف

اور سعی، اوراد اور وظائف، عبادتیں اور زیارتیں، سب کچھ پُر بہار موسم کی خوشبو بھری پھوار کی طرح آتے اور گزر جاتے ہیں اور ہم ایک بار پھر دنیاداری کے لق و دق صحرا میں غرق ہو جاتے ہیں۔ ہمارے وجود کے ایک ایک مسام سے یوں دھواں اُٹھنے لگتا ہے جیسے زندگی بھر ہمارا کسی بہار بہ داماں جزیرے، کسی چمنستان اور کسی نخلستان سے کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے وقت ہمارے ایک ہاتھ میں آبِ زمزم کا کنستر اور دوسرے ہاتھ میں کھجوروں کی پوٹلی ہوتی ہے اور صحنِ حرم میں عطا ہونے والے جذب و کیف اور رُوح و فکر میں بپا ہونے والے انقلاب کی گٹھڑی ہم اُسی میقات پر چھوڑ آتے ہیں، جہاں سے احرام باندھ کر حدودِ حرم میں داخل ہوتے ہیں۔

[28-05-2003]

## مکہ مدینہ (3)

مدینہ منورہ، چمنستانِ ہستی کا ایک سدا بہار پھول ہے جس کی لطافت سب سے جُدا، جس کے رنگ سب سے منفرد اور جس کی خوشبو سب سے مسحور کن ہے۔ اس کی ہواؤں میں کچھ ایسا جادو اور فضاؤں میں کچھ ایسا حسن ہے کہ کسی بھی خطہ ارضی سے آنے والا انسان اپنے جذبات و احساسات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ مکہ مکرمہ کے پُرشکوہ جلال کے دائرے سے نکل کر مسجد نبوی ﷺ کے احاطہ جمال میں داخل ہوتے ہی قلب ونظر ایک سراسر مختلف کیفیت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کی سرشاری اور سرمستی کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو برسوں کوچہ جاناں تک پہنچنے کی آرزو میں سلگتا رہا ہو۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ حضوری و حاضری کی تمنائے بے تاب سے مہکتا رہا ہو۔ جس نے انتظار کی لمبی راتیں اور آتشیں دن گزارے ہوں۔ جو صرف اس لیے جیتا رہا ہو کہ مرنے سے قبل اپنی آنکھوں کو گنبد خضریٰ کے عکس جمیل سے منور کر لے۔ عشق، محبت اور عقیدت کے والہانہ پن کے جو مظاہر، ہر روز حرم نبوی ﷺ کے در و دیوار اور منقش محرابوں پر رقم ہوتے ہیں، وہ اہل حرم کے دلوں میں موجزن طوفانوں کا محض ایک ہلکا سا ارتعاش ہیں۔ زندگی بھر جلتے بلتے صحراؤں میں پابرہنہ بھٹکنے والا انسان جونہی مدینہ کی آغوش میں قدم رکھتا ہے، اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی نخلستان میں آ گیا ہے جہاں ہری بھری مخملی گھاس اُس کے قدموں تلے بچھی جا رہی ہے۔ جہاں چاروں طرف ایک ممتا بھری آسودگی رچی بسی ہے۔ جہاں ایک معطر سی پھوار ہمہ وقت گرتی اور دل کی اُجاڑ کھیتیوں کو شاداب کرتی چلی جاتی ہے۔ جہاں عمر بھر کی بے خوابیوں کی ڈسی آنکھیں ایک عجب کیف آگیں آسودگی سے نہال ہو جاتی ہیں جیسے کوئی سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے لوری دے رہا ہو۔ جیسے کوئی رستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔ جیسے کسی نے شکستہ پا نڈھال مسافر کو گرتے گرتے یکا یک سنبھال لیا ہو۔ جیسے کڑی دھوپ میں چلتے چلتے اچانک گھنے بادل کے کسی ٹکڑے نے سر پر سائبان سا تان لیا ہو۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ ”تم نے اتنی دیر کر دی؟ جتنا عرصہ تم یہاں آنے کے جتن کرتے رہے ہو، اتنا ہی عرصہ میں تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ آؤ۔ میرے قریب آؤ۔“ جیسے دلوں کے اندر ہی اندر ایک سرگوشی سی اُٹھ رہی ہو۔ ”تم جو کچھ بھی ہو میں تمہارا ہوں۔“ جیسے کسی مسیحا نفس کے خیال کے لمس نے سارے دُکھ دُور کر دیئے ہوں۔ جیسے اُجڑے ہوئے چمن میں یکا یک بہار آ جائے۔ جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے۔

جب میں مکہ مدینہ کے لیے رخت سفر باندھ رہا تھا تو میرے ایک دوست نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ”بارگاہ نبوی ﷺ میں جاؤ تو کچھ نہیں مانگنا۔ بس دست بستہ کھڑے ہو کر سلام پیش کرنا۔ اپنی

حاضری کو سوالوں اور مطالبوں سے بوجھل نہ بنا دینا۔ بس کھڑے رہنا اور ..........'' اُس کی آواز بھرا گئی تھی اور اُس نے فون بند کر دیا تھا۔ میں نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قدم رکھا تو چند ہی ثانیوں بعد مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد میں سلام پیش کرنے کے لیے اُٹھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کس طرح روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔ کیا دعا مانگی۔ کس کس کا سلام پیش کیا۔ کس کس کا سندیسہ پہنچایا۔ اتنا یاد ہے کہ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میرے وجود پر ہلکی سی کپکپی طاری تھی اور میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد پڑ رہا ہے کہ میرے آس پاس بیسیوں آدمی کھڑے تھے لیکن چند لمحوں بعد مجھے یوں لگا تھا جیسے میں بالکل اکیلا ہوں۔ اور جب میں نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلانے کی کوشش کی تھی تو میری گھگھی بندھ گئی تھی اور میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔ میں کہ لفظوں سے کھیلتا رہتا ہوں، اُس گھڑی گونگا بہرا ہو گیا تھا اور عرض تمنا کے لیے مجھے ایک بھی ایسا لفظ نہیں مل رہا تھا جو شہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کے شایان شان ہو۔ مجھے خواب کی طرح یاد پڑتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی بے چارگی کا مداوا چاہا تھا لیکن میری جھولی لفظوں کی سوغات سے محروم رہی تھی۔ میں نے بے بسی کے عالم میں حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی چھت کی طرف دیکھا اور میری اشکبار آنکھوں کے پانیوں پر ایک لوح سی تیرنے لگی۔ جس پہ لکھا تھا

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پنہاں بگیر

''اے خدا! تو دونوں جہانوں سے غنی ہے اور میں ایک درماندہ فقیر ہوں۔ تیرا کرم ہو گا کہ قیامت کے دن میری معافی قبول کرلے اور مجھے بخش دے اور اگر تو کسی وجہ سے میرا احساب کتاب کرنا اور میرے اعمال نامے کا جائزہ لینا ضروری خیال کرے تو اتنا کرم کرنا۔ میری فرد گناہ، آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں سے چھپا کر رکھنا۔''

پچیس سال قبل میں اپنے والدین کے ہمراہ جب مکہ سے مدینہ آ رہا تھا تو بس مصری نوجوانوں سے بھری تھی۔ شوخ و شنگ نوجوان جن کے بدن میں پارہ بھرا تھا۔ ایک دوسرے سے چہلیں کرتے، گپیں لگاتے، لطیفے سناتے، شوخیاں کرتے نوجوان جو کسی یونیورسٹی کے طالب علم لگتے تھے۔ اگلے دن مجھے ان نوجوانوں کا قافلہ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں کھڑا نظر آیا۔ دھاڑیں مارتے، آہیں بھرتے اور عشق بلاخیز کی سرمستیوں سے مغلوب نوجوان جنہیں گرد و پیش کا کچھ پتا ہی نہ تھا۔ انہیں شاید اپنے وجود کا احساس بھی

نہیں تھا۔ یہ یکا یک انہیں کیا ہو گیا تھا؟ اور اُن سب کو کیا ہو جاتا ہے جو چاہے عمر کے کسی بھی حصے میں ہوں، بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوتے ہی طفل شیر خوار بن جاتے ہیں۔ بلکتے ہوئے، روتے ہوئے، ایڑیاں رگڑتے اور چھوٹی چھوٹی مٹھیاں لہراتے ہوئے۔

......اور ان شیر خوار بچوں کے منہ میں زبان نہیں ہوتی لیکن محبتوں، شفقتوں و رعنائیوں میں گندھی ممتا کو سب خبر ہوتی ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ سب جانتی ہے کہ اس کی طلب کیا ہے۔ وہ سب سمجھتی ہے کہ اس کی بے کلی کیا تقاضا کر رہی ہے۔ اللہ سے صرف تڑپنے پھڑکنے کی توفیق مانگتے رہنا چاہیے۔ یہ نہ رہے تو اظہار کا کوئی وسیلہ ہی نہیں رہتا۔

[30-05-2003]

# ریاض میں پاکستان

''پاکستان کلچرل گروپ'' کو قائم ہوئے 23 سال ہو چکے ہیں اور اب اُسے ریاض کی ایک سنجیدہ، معتبر اور مؤثر تنظیم کا درجہ حاصل ہے۔ ہر سال اس نوع کی ایک یا دو تقریبات منعقد کرانا اس کے معمولات کا حصہ ہے۔ پاکستان سے بلائے گئے مہمانوں کے ساتھ مل بیٹھنے، احوالِ وطن سننے اور دردِ دل بانٹنے کی ان تقریبات کو بڑی خوش سلیقگی اور انتہائی اعلیٰ معیار کے ساتھ منعقد کیا جاتا ہے۔ سیاسی وابستگیوں سے بالاتر رہتے ہوئے ملک وقوم کو درپیش مسائل سے آگاہی حاصل کرنا اور اُن کے حل کی تدابیر پر غور کرنا گروپ کے بڑے مقاصد میں سے ایک ہے۔ ضرورت مند پاکستانیوں کی مالی مدد کرنا اور اُن کی مشکلات میں اُن کی دست گیری کرنا بھی کلچرل گروپ کے منشور کا حصہ ہے۔ پاکستان کے فلاحی اور رفاہی اداروں کے منتظمین کے دورہ ریاض کے دوران یہ گروپ بھاری فنڈز کی فراہمی کے لیے بڑا فعال کردار ادا کرتا ہے۔ عام طور پر اس طرح کی تنظیمیں اپنے سفارت خانوں کی بے اعتنائی کی شاکی رہتی ہیں لیکن گروپ کے عہدے دار پاکستانی سفارت خانے کے تعاون کا کھلے دل سے تذکرہ کرتے ہیں۔ ریاض میں مقیم پاکستانی سفیر ایڈمرل (ر) عبدالعزیز مرزا نے بھی گروپ کی کاوشوں کو تعمیری اور مثبت قرار دیتے ہوئے تعریف کی۔ مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ ماضی کے مقابلے میں اب پاکستانی سفارت خانے کے بارے میں عمومی تاثر کافی بہتر ہے اور مرزا صاحب کی سادہ مزاج شخصیت سے اس رعونت کی بُو نہیں آتی جو ہمارے بیشتر سفیرانِ کرام کے ہر مسام میں رچ بس گئی ہے۔

یہ ایک عمدہ تقریب تھی جس کا آغاز نمازِ عشا اور بے حد پُرتکلف عشائیے کے بعد ہوا۔ دوپہر کو محدود ظہرانے کے دوران جناب عبدالعزیز مرزا اور نیب کے چیئرمین لیفٹیننٹ جنرل منیر حفیظ سے ملاقات ہو چکی تھی بلکہ شریک طعام حضرات کے سوالات اور اُن کے جوابات کے باعث یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ رات کی تقاریر کا رُخ کیا ہوگا۔ تقریب میں تین ساڑھے تین سو افراد نے شرکت کی جنہیں خصوصی دعوت ناموں پر بلایا گیا تھا۔ خواتین کی نشستیں الگ تھیں۔ یہ ریاض میں مقیم اُن پاکستانیوں کا اجتماع تھا جو مختلف کمپنیوں، محکموں اور اداروں میں اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ڈاکٹرز، انجینئرز، بینکرز، بزنس منیجرز اور اہل فکر و دانش کے چہروں سے آسودگی اور خوشحالی ٹپک رہی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی بے پناہ مشقت، لگن، خلوص اور محنت کے ساتھ اپنے شعبے میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور کٹھن حالات کے باوجود اپنا مقام بنایا ہے۔ انہیں وہ سب کچھ حاصل ہے جو رزق روزی کی کشادگی کے ساتھ وابستہ ہے لیکن

پاکستان ہر ایک کے دل میں خیمے گاڑے بیٹھا ہے اور وہ ڈھیروں مصروفیات کے باوجود وطن کو درپیش مسائل کا درد ہر آن ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

پاکستانی تقریبات کے برعکس، اس تقریب میں صرف پاکستان سے آئے ہوئے تین مدعوئین کو آدھ آدھ گھنٹے کی تقریر کا موقع دیا گیا۔ سب سے پہلے لیفٹیننٹ جنرل منیر حفیظ نے اپنے ادارے کی کارکردگی کا احوال بیان کیا اور مؤثر طور پر اس نکتے کو اُجاگر کیا کہ نیب کے بعد بالائی سطح کی کرپشن کی داستانیں ختم ہو چکی ہیں اور عمومی کلچر میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ انہوں نے بعض بین الاقوامی اداروں کی رپورٹس کے اقتباسات پڑھ کر سنائے جن سے پاکستان میں گڈ گورننس اور اقتصادی بہتری کی تصدیق ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو جاری رہے گا اور وقت کے ساتھ ساتھ صورت حال مزید بہتر ہوتی چلی جائے گی۔ اُن کے بعد حامد خان ایڈووکیٹ نے ملک کی آئینی اور سیاسی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ تھیوری پیش کی کہ 12 اکتوبر 1999ء کے فوراً بعد عدلیہ اور فوجی حکمرانوں کے درمیان ایسی مفاہمت پیدا ہوگئی جو جاری ہے اور جب تک یہ رشتہ قائم ہے، مسائل اُلجھتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے اس تاثر کی نفی کی کہ انتخابات ایل ایف او کے تحت ہوئے ہیں اور کہا کہ ایل ایف او کو نومبر میں باضابطہ شکل دی گئی جب کہ انتخابات اکتوبر میں ہو چکے تھے۔ حامد خان کی تقریر کے دوران تالیاں گونجتی رہیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اہلِ ریاض کی اکثریت ملکی معاملات کو کس طرح دیکھ رہی ہے۔ میری باری آئی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے لیکن ہال پوری طرح تازہ دم تھا۔ میں نے وہی کچھ کہا جو میں ایک عرصے سے لکھ رہا ہوں۔ گفتگو کا آغاز میں نے منیر نیازی کے اس شعر سے کیا۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیرؔ مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

میں نے 1958ء سے لے کر 1999ء تک کے واقعات کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ایک مخصوص پیٹرن بن چکا ہے۔ کس طرح 1970 سے لے کر 1996 تک ہونے والے سات قومی انتخابات کے نتائج کو ناکارہ بنایا گیا اور کس طرح آئین کو اپنے محدود مفادات و مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ میں نے اعداد و شمار کی مدد سے واضح کیا کہ فوجی حکومت سے قبل اور فوجی حکومت کے تین سالہ دور کے بعد ملکی اکانومی کی صورت حال کیا تھی۔ اختتام اس سوال پر ہوا کہ پاکستان پر حکمرانی کا حق کسے ہے اور وسیع تر قومی مفاد کا فیصلہ کرنے کا مجاز کون ہے؟

تقاریر کے بعد حاضرین کے سوالات شروع ہوئے جو گھنٹہ بھر جاری رہے۔ رات ڈھل چکی تھی اور کسی چہرے پر بیزاری کے آثار نہ تھے۔ سوال و جواب کے اختتام پر سفیر محترم ایڈمرل عبدالعزیز مرزا نے

خطاب کیا۔ انھوں نے کہا تنقید آسان کام ہے لیکن ہمیں اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیے کہ ہم وطن عزیز کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ اگر ہم میں سے ہر ایک اپنا کردار دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا شروع کر دے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

سچی بات یہ ہے کہ اتنی بھر پور، خوبصورت، منظّم اور عمدہ تقریب ایک عرصے کے بعد دیکھنے کو ملی۔ پاکستان کلچرل گروپ کے سینئر عہدے داروں، جناب عبدالحمید ابو فاروق، ڈاکٹر ریاض خواجہ، جناب طارق جاوید، جناب خورشید احمد، جناب جاوید شمیم، جناب وحید قریشی اور اُن کے رُفقاء تقریباً رُبع صدی سے ایک مشن کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی کاوشوں میں برکت ڈالے۔

میں رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ اپنے کمرے میں واپس آیا تو ایڈمرل عبدالعزیز مرزا کی تلقین کی روشنی میں اپنا دل ٹٹولا لیکن وہ غائب تھا۔ ساری رات بے کلی میں گزری۔ اب صبح طلوع ہو چکی ہے۔ سہ پہر کو میرا طیارہ شہر جاناں کی طرف اُڑان بھرنے والا ہے اور میرا دل گزشتہ رات ہی سے مدینہ کی کسی گلی میں پڑا کروٹیں بدل رہا ہے۔ ریاض میں میرے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہے اور میں باہر جھانک رہا ہوں لیکن سارا منظر بدل چکا ہے۔ کھجوروں کے درختوں کے بیچوں بیچ سبز رنگ کے ایک گنبد کے سوا مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

[14-09-2003]

# مدینہ دُور نہیں (1)

سعودیہ ائر لائن کے بوئنگ 707 نے ابھی پرنس محمد بن عبدالعزیز ائر پورٹ کے رن وے کو نہیں چھوا تھا۔ پائلٹ باری باری جہاز کے پروں کو دائیں بائیں جھکا اُٹھا رہا تھا اور میں شہر جاناں کے چاروں طرف بکھرے چھوٹے بڑے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سرکار مدینہ ﷺ کی مبارک نگاہیں ان میں سے کسی نہ کسی پہاڑ پر تو ضرور پڑی ہوں گی۔ ممکن ہے آپ یہاں سے گزرے بھی ہوں۔ ممکن ہے ان پر بکھرے پتھروں میں سے کسی کو حضور ﷺ کی قدم بوسی کا اعزاز بھی حاصل ہوا ہو۔ میرا ذہن چودہ سو سال پہلے کے منظروں سے جھلکنے لگا۔ اعلان ہوا کہ اُترتے وقت اپنا دستی سامان ساتھ لے جانا نہ بھولئے۔ میں نے اپنے دونوں بیگوں پر نظر ڈالی۔ اچانک ایک بجلی سی کوندی اور میں نے اپنے سینے کے بائیں جانب ہاتھ رکھ کر اپنا دل ٹٹولنے کی کوشش کی۔ وہ بدستور غائب تھا۔

میں اس دل سے عاجز آتا جا رہا ہوں۔ عمر بھر اسے سمجھاتا رہا لیکن وہ من مانی سے باز نہیں آیا۔ میں اسے دانش و حکمت کے گراں قدر مشوروں اور گریز و مصلحت کے بیش قیمت ثمرات سے آگاہ کرتا رہا۔ زندگی کے ان سلیقوں اور قرینوں کا درس دیتا رہا جن پر عمل کرنے سے دُنیوی کامرانیوں کے باب وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں اسے بڑے لاڈ پیار سے وہ سب کچھ بتاتا رہا جو میرے مخلص اور بہی خواہ دوست پہروں میرے پاس بیٹھ کر مجھے بتاتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ زندگی بار بار نہیں ملتی اور اسے خواہ مخواہ کے خود ساختہ اُصولوں کی بھٹی میں جھونک دینا دانش مندی نہیں۔ وہ ہمدردی سے سرشار لہجے میں تلقین کرتے ہیں کہ جب انسان کی جھولی میں بہت کچھ آ رہا ہو اور وہ دامن جھٹک کر کسی بے ثمر راستے پر چل پڑے تو اسے کمال درجے کی حماقت کہا جاتا ہے۔ وہ مجھے نصیحت کرتے ہیں کہ تھوڑی سی لچک، تھوڑی سی نرمی، تھوڑی سی آمیزش، تھوڑی سی مصلحت کیشی، تھوڑی سی بے اُصولی اور تھوڑی سی گریز پائی سے کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مجھے تاریخ کے اوراق پر کندہ کامیابی کی ولولہ انگیز داستانیں سناتے اور کامرانی کی بلند فصیلوں پر کمندیں ڈالنے والے کامران لوگوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ میں گم صم اُن کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ جب وہ چلے جاتے ہیں تو میں کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنے ذہن کے دروازے پر دستک دیتا ہوں اور میرا دماغ بلند آواز میں میرے دوستوں کے اقوال زریں کی تصدیق کرتا ہے۔ میں حتمی فیصلہ کر لیتا ہوں کہ کل صبح لاحاصلی کے دشت رائیگاں سے ناتا توڑ کر سنہری مسندوں اور روشن منزلوں کی طرف جانے والی کامران راہوں پر نیا سفر شروع کروں گا لیکن کوئی شے اچانک میرے سینے کے بائیں پہلو میں خنجر سا گھونپ دیتی

ہے اور میرا دل زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ ایک آتشیں گولے کی طرح میرے اندر ہی اندر گھمن گھیریاں کھانے لگتا ہے۔ میری نیند اُڑ جاتی ہے اور اعصاب میں پگھلا ہوا سیسہ رینگنے لگتا ہے۔

ریاض میں میرے دوست مجھے شہر کے خوبصورت مقامات دکھانے لے گئے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد انہوں نے شاہان عالی مقام کے پُرشکوہ محلات کا علاقہ دکھایا۔ سینکڑوں ایکڑ پر محیط بیسیوں محل بغل در بغل تمام تر شان و شوکت و عظمت کے ساتھ کھڑے تھے۔ کچھ کے مکین برسوں پہلے دنیا سے رُخصت ہو گئے اور اب کسی کو معلوم نہیں کہ ان محلوں میں کون مقیم ہے۔ میں مزے لے لے کر اپنے دل کو بتاتا اور جتاتا رہا کہ دیکھو! اسے کہتے ہیں جاہ وجلال۔ ایسی ہوتی ہیں کامران زندگیاں۔ اس طرح حاصل ہوتی ہے وہ چکا چوند جس سے دنیا کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ محل عظیم سعودی فرمان روا شاہ فیصل شہید کا مسکن رہا۔ محل کی چار دیواری کئی کلومیٹرز تک پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے میزبان سے کہا ”کیا ممکن ہے کہ شاہ فیصل کے مزار پر حاضری دی جائے؟“ وہ بولا ”اُن کا کوئی مزار نہیں ہے۔“ میں حیرت زدہ ہو کر اُسے دیکھنے لگا تو اُس نے وضاحت کی ”یہاں کسی شاہ یا شہزادے کا مزار نہیں ہے۔ کوئی الگ شاہی قبرستان بھی نہیں ہے۔ مرنے کے بعد بادشاہوں کو بھی عام قبرستانوں میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ اُن کے سرہانے نہ کوئی لوح مزار ہوتی ہے نہ کوئی تختی نہ کوئی امتیازی نشان۔ نہ چراغ نہ گلے۔ چند ماہ بعد بادشاہ کی قبر بھی مٹی اور پتھر کی ہزاروں ڈھیریوں میں سے ایک ڈھیری رہ جاتی ہے۔ اب ان ڈھیریوں میں شاہ فیصل کی قبر تلاش کرنا ممکن نہیں۔“ میرے دل نے ایک زور کی چٹکی لی اور میں شرمندہ سا ہو کر محل کے بجائے سامنے سڑک کو دیکھنے لگا۔

اور اب میرا دل مجھے چھوڑ چھاڑ کر نہ جانے مدینہ کی کس گلی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ میرا جسم فضا میں معلق تھا اور میری رُوح اُحد پہاڑ کے آس پاس بسی خوشبو کے تعاقب میں دُور نکل گئی تھی۔ جہاز کے پہیوں نے رن وے کو چھوا تو سورج پہاڑوں کی اُوٹ میں ڈوب رہا تھا۔ میں اپنا مختصر سا سامان اُٹھائے باہر آیا۔ پاکستان ہاؤس کی گاڑی کے علاوہ میرا ایک دوست بھی اپنی کار کے ساتھ موجود تھا۔ سامان پاکستان ہاؤس کی گاڑی میں رکھ کر میں دوست کے ساتھ بیٹھ گیا تو وہ کہنے لگا ”تم نے کیوں کہا تھا کہ مدینہ دُور ہے؟ اب دیکھو! تین ماہ کے اندر اندر حضور ﷺ نے تمہیں دوسری بار بلا لیا ہے، بھلا مدینہ بھی کبھی دُور ہوتا ہے۔“ میری آنکھیں بھر آئیں اور ضبط کے باوجود ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میری منحنی سی آواز تو اسلام آباد کے ایوانوں تک نہیں پہنچتی، یہ اتنا لمبا سفر طے کر کے مدینہ تک کیسے آ گئی؟ کیا مدینہ اتنا قریب ہے کہ رات کے پچھلے پہر کی سسکیاں اور بے چین رُوحوں کی ہچکیاں تک سن لیتا ہے؟ میرے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ میرے دوست نے گاڑی چلاتے چلاتے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور

بولا ''ان آنسوؤں سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ یہ کسی کسی کو عطا ہوتے ہیں۔ یہ آنسو نہیں۔ تمہارا دل ہے جو قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے۔''

یکا یک ایک بار پھر مجھے اپنا دل یاد آ گیا۔ میں اپنے دوست سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تم نے یہاں مسجد نبوی ﷺ کے آس پاس کسی کوچے، کسی گلی میں میرا دل تو نہیں دیکھا؟ میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ وہ مجھے دیوانہ خیال کرے گا۔ جب میں عشاء کی نماز سے کوئی گھنٹہ بھر قبل مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے نماز مغرب ادا کر کے باہر گیا تھا۔ کیا مدینہ اتنا قریب ہے؟ بھیڑ کم تھی اور روضۂ رسول ﷺ تک پہنچتے زیادہ دیر نہ لگی۔ منبر رسول ﷺ کے پہلو سے گزر کر جب میں نے روضۂ رسول ﷺ کی جالیوں کا رُخ کیا تو ایک بار پھر سب کچھ بھول گیا۔ ذہن کی لوح کورے کاغذ کی طرح سفید ہو گئی۔ مجھے اُن میں سے کسی کا نام یاد نہ رہا جنہوں نے بارگاہ رسول ﷺ میں سلام نیاز پیش کرنے کے لیے کہا تھا۔ دعاؤں کی وہ گٹھڑی جو میں اسلام آباد سے ساتھ لے کر آیا تھا اچانک کھل گئی اور ساری دعائیں تتلیوں کی طرح مسجد نبوی ﷺ کی فضاؤں میں بکھر گئیں۔ میں ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور پھر یوں لگا جیسے میں اس ستون کا حصہ بن گیا ہوں۔ میں نے صرف ایک بار نظریں اُٹھا کر سنہری جالیوں کے سوراخوں سے اندر جھانکا اور میری نگاہ سبز رنگ کے ایک غلاف پر پڑی جس پر 'محمد الرسول اللہ ﷺ' کے الفاظ نقش تھے اور پھر برکھا برستی رہی اور میرا بدن گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہا۔ خود فراموشی کے اس عالم میں کسی نے میرے کان میں رس بھری سرگوشی سی کی۔ ''تم تو کہتے تھے مدینہ دُور ہے!'' اور ایک بار پھر میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ ایک مرد بزرگ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور اس کے ساتھ ہی میرے سینے کے بائیں جانب جنبش سی ہوئی۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس طرف اُٹھ گیا میرا دل واپس آ گیا تھا۔ میں نے روتے روتے پوچھا ''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر اتنا روئے اتنا روئے کہ دیوارِ جاں تک لرزنے لگی۔

[15-09-2003]

# مدینہ دُور نہیں (2)

میرے حواس بحال ہوئے تو میں روضہ رسول ﷺ کی جالیوں سے ذرا ہٹ کر سامنے والی دیوار کے پاس پڑا سسک رہا تھا اور میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کوئی کپڑا نچوڑ کر تیز دھوپ میں ڈال دیا گیا ہو اور اس سے بخارات اُٹھ رہے ہوں۔ جسم کی ساری توانائی سمیٹ کر جالیوں کی طرف نگاہ کی تو یکایک ذہن کا دریچہ کھل سا گیا اور مجھے وہ سارے عزیز، اقربا اور احباب ایک ایک کر کے یاد آنے لگے جنھوں نے حضور ﷺ کے لیے سلام نیاز کا نذرانہ بھیجا تھا۔ اب میرا دل بھی میرے پہلو میں تھا۔ میں ہمت کر کے ایک بار پھر اُٹھا اور جالیوں کے سامنے درود وسلام کی رم جھم سے بھیگتے ہجوم میں گم ہو گیا اور حضور ﷺ کی امانت اُن کے قدموں پر ڈھیر کر دی۔ دعاؤں کی تتلیاں گھوم گھام کر لوٹ آئیں اور میرے آس پاس منڈلانے لگیں۔ لیکن اس مقام پر دعاؤں کو لفظوں کی حاجت نہیں ہوتی یہاں تو عشق ومستی اور وجد و کیف کی وہی پرانی لغت کام آتی ہے جس میں نہ کوئی حرف ہے، نہ لفظ، نہ کوئی معنی، نہ مفہوم۔ میرے ہونٹ سوکھے پتوں کی طرح تھرتھراتے رہے اور دل مجھے تھپکیاں دیتا رہا کہ تم چپ رہو یہ تمہارا کام نہیں۔

عشق کے رنگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ وہ ایک سیر چشم اور آسودہ حال شخص ہے۔ دنیا داری کے سارے تقاضے نباہنے والے اس شخص کے دل میں عشق رسول ﷺ کی ایسی تڑپ ہے کہ سرکار مدینہ ﷺ کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی اُس کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اُس نے مجھے رُخصت کرتے وقت کہا تھا ''ہو سکے تو مکہ مدینہ کی تھوڑی سی خاک ضرور لے آنا۔''

عصر اور مغرب کے درمیان میں مسجد نبوی ﷺ سے نکلا اور بے سمت سی راہوں پر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے میں بھول گیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور مجھے کس کی تلاش ہے لیکن حسین وطرح دار ہوٹلوں سے نکل کر جب میں عقبی علاقے میں پہنچا تو اندازہ ہوا کہ میں تو مدینہ تلاش کر رہا ہوں۔ محمد عربی ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا مدینہ۔ مجھے اپنے دوست کے لیے مدینہ کی خاک چاہیے تھی اور میں مدینہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ دُھول سے اٹی کچی گلیاں، گھروندوں جیسے گھر، کھجور کے ستونوں والے برآمدے، اُونچے نیچے ٹیلے، قدیم طرز کے کنوئیں، کچے احاطوں میں جگالی کرتے اُونٹ، ڈیوڑھیوں میں ممیاتی بکریاں، کھجوروں کے باغات، چھوٹی سی مسجد نبوی ﷺ اور پھر وہ مردان صفا کیش جن کے جسموں پر کھردرے لباس اور سینوں میں ایمان و یقین سے دمکتے ہوئے دل تھے۔ وہ کہ جوارض وسما کا حاصل اور

کائنات کا حسن تھے اور وہ کہ جن کی اُمیدیں قلیل اور مقاصد جلیل تھے اور وہ کہ جو غالب و کار آفریں بھی تھے اور کار کشاؤ کارساز بھی اور وہ کہ جن کا دلِ بے نیاز ہر دو جہاں سے غنی تھا اور وہ کہ جو حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزمِ حق و باطل میں شمشیر جوہر دار تھے اور پھر اُن عالی نسب لوگوں کا سردار کہ جو ختم المرسلین ﷺ بھی تھا اور محسن انسانیت ﷺ بھی، جو ازل سے ابد تک آنے والے انسانوں میں افضل ترین تھا۔ جس کی حیات پاک کا ہر لمحہ قرآن کی روشن تعلیمات کی تفسیر تھا۔ جس نے عرب کے اُن حدی خوانوں کو زمانے بھر کا رہنما بنا دیا تھا۔ میں ٹریفک کے شور اور لبالب بھری مارکیٹوں کی گھما گھمی سے بے نیاز خیال و خواب میں بسا مدینہ تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔ فٹ پاتھ کے کنارے ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر میں بے بسی سے بڑبڑایا۔

"یارمن! میں تمہارے لیے کہاں سے خاک پاک تلاش کروں، مدینہ بھی تو ملے۔"

پچیس سال پہلے جب اپنے والدین کے ہمراہ حج کی سعادت نصیب ہوئی تو ہم لوگ مسجد نبوی ﷺ سے صرف پانچ منٹ کی مسافت پر ایک بہت پرانے گھر کے بوسیدہ سے کمرے میں ٹھہرے تھے۔ ہمارے بستر زمین پر لگے تھے اور کمرہ دن کے وقت بھی تاریکی میں ڈوبا رہتا تھا۔ ایک بوڑھا عرب اس گھر کا مالک تھا جو حج کے زمانے میں گھر کے سارے کمرے کرائے پر اُٹھا دیتا تھا۔ پیرانہ سالی کے باعث اُس کی کمر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ اُس نے دو تین بکریاں بھی پال رکھی تھیں۔ ہم لوگ نماز فجر سے فارغ ہو کر آتے تو وہ گھر سے باہر گلی میں ایک چولہا دہکائے بیٹھا ہوتا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ چائے کا پانی رکھ دیتا اور پھر بکری کے تازہ دودھ کی چائے کانچ کے گلاسوں میں ڈال کر پیش کرتا۔ کبھی کبھار وہ بڑی ترنگ میں ہوتا۔ میں چائے کے پیسے دیتا تو کہتا "مجھے شرمندہ نہ کرو۔ تم تو حضور ﷺ کے مہمان ہو۔" اور پیسے لیے بغیر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

پچیس سال پہلے کا مدینہ بھی کتنا مختلف تھا؟ آج مدینہ منورہ کشادہ سڑکوں، فراٹے بھرتی گاڑیوں، بلند و بالا عمارتوں، شاندار پلازوں، بڑے بڑے بینکوں، مصروف تجارتی مرکزوں، ملٹی نیشنل کمپنیوں، آراستہ پیراستہ دفتروں، لشکارے مارتی مارکیٹوں، وسیع و عریض سپر سٹوروں اور عالی شان ہوٹلوں کا شہر ہے جس کے بیچوں بیچ مسجد نبوی ﷺ نگینے کی طرح جڑی ہے۔ مدینہ کی تلاش سے مایوس ہو کر میں واپس پلٹ آیا۔ مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہونے کے لیے میں نے باب جبریل میں قدم رکھا تو یکا یک مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ میرے دل میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی یاد سرخ گلاب کی کونپل کی طرح پھوٹی اور خوشبو بکھیرتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ مدینہ تو وہی ہے چودہ سو سال پہلے والا شہر خوش جمال۔ اُس وقت بھی عین اِسی مقام سے اذان کی مشکبو گونج بلند ہوتی تھی اور آج بھی یہ عطر بیز صدا اسی انداز میں اپنے نورانی پنکھ پھیلائے پرواز کر رہی ہے اور اب تو یہ آواز کرہ ارضی کے ہر گوشے سے اُٹھ رہی ہے۔ سرکار

مدینہ ﷺ کا پیغام پھیلتا جا رہا ہے۔ آج کی مسجد نبوی ﷺ اُس وقت کے پورے شہر مدینہ کو اپنی آغوش میں لے چکی ہے۔ میں تو خواہ مخواہ اسے باہر تلاش کر رہا تھا۔ آج اس مسجد کی چھتوں تلے ساڑھے چھ لاکھ بندگان خدا نماز پڑھ سکتے ہیں۔ بیرونی احاطوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ گنجائش دس لاکھ انسانوں تک پھیل جاتی ہے۔ پچاس سال پہلے حجاج کرام کی تعداد صرف دس ہزار تھی۔ اب ہر سال تیس لاکھ سے زائد فرزندان توحید فریضہ حج ادا کرنے آتے ہیں۔ مدینہ تو پھیلتا جا رہا ہے۔ کراں تا بہ کراں، اُفق تا بہ اُفق۔ سمندروں، میدانوں اور پہاڑوں کو عبور کرتا، براعظموں کی حدیں توڑتا، سنگلاخ تہذیبوں میں اپنا راستہ بناتا۔ چند لمحے پہلے میرے اندر کروٹیں لیتی مایوسی یکا یک چھٹ گئی اور مدینہ کی لامحدود وسعتوں نے مجھے مالا مال کر دیا۔

اگلے روز نماز فجر کی ادائیگی کے بعد جب میں مدینہ سے رُخصت ہوا تو میرے دونوں ہاتھوں میں بیگ تھے اور لافانی آسودگی سے سرشار دل میرے سینے میں دھڑک رہا تھا۔ جہاز کی کھڑکی سے سبز گنبد اور سر بلند میناروں کو آخری سلام پیش کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کا مدینہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اُفق تا بہ اُفق، کراں تا بہ کراں۔ پھر مجھے عابد علی عابدؔ کا ایک بے محل سا شعر یاد آیا

وقت رُخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

میں عمرے کا احرام باندھے جہاز کی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا تھا اور مدینہ خوشبو بھرے کاجل کی طرح میری بھیگی آنکھوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔ سیٹ بیلٹ سے ذرا اُوپر میرے دل نے کروٹ سی لی اور ہولے سے بولا۔ ''تم تو کہتے تھے مدینہ دُور ہے۔''

[16-09-2003]

# حرم کعبہ

مدینہ منورہ سے جدہ تک ساری پرواز کے دوران 'شہر جاناں' میرے ساتھ ساتھ رہا۔ شاید میرا دل ریاض سے اِسی خاطر مدینہ چلا گیا تھا کہ وہاں کے رنگ، وہاں کی خوشبوئیں سمیٹتا رہے۔ اس نے رنگوں اور خوشبوؤں کی وہ پوٹلی عین اُس لمحے میرے حوالے کر دی تھی جب میں روضۂ رسول ﷺ کی جالیوں کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے کے سفر میں یہ رنگ مسلسل میری آنکھوں کے سامنے جھلملاتے رہے اور زمانے بھر کی لطافتوں کی امین ایک کیف آگہی سی خوشبو میری سانسوں میں رچی بسی رہی۔

گاڑی ابھی دو چار کلو میٹر دُور رہی تھی کہ میری نگاہ بلند پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بنے شہر مکہ پر پڑی۔ یہ شہر کا وہ حصہ ہے جہاں فلک بوس عمارتوں کے بجائے عام سے رہائشی گھر بنے ہیں۔ گھنی آبادی کے اس گنجان سے شہری علاقے کی پہلی جھلک کے ساتھ ہی میں صدیوں پیچھے چلا گیا اور تاریخ کے کئی ورق اس تیزی کے ساتھ میرے ذہن کی لوح کو چھوتے ہوئے گزر گئے کہ میں خودخزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپانے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو کتنے بڑے اعزاز سے نوازا کہ اپنے محبوب ﷺ کی جائے ولادت کے لیے منتخب فرمایا۔ ایک فلم سی چلنے لگی اور پہاڑوں پر بنے رہائشی مکانات یکا یک ایک بہت بڑی سکرین میں بدل گئے۔ میرے ذہن میں معصوم سے سوال آمد بہار کے قافلہ نو کی طرح کھلنے لگے۔ حضرت عبدالمطلبؓ نے کس طرح اپنے پوتے کو ہاتھوں میں اُٹھایا ہوگا؟ وہ کس طرح خانہ کعبہ میں داخل ہوئے ہوں گے؟ محمد ﷺ نام تجویز کرتے وقت اُن کے دل و دماغ میں کس طرح کے جذبات و احساسات کا بسیرا ہوگا؟ حضرت آمنہؓ کے دل میں کیسی آرزوؤں کے کنول کھل اُٹھے ہوں گے؟ اُس روز کا سورج کس آب و تاب سے نکلا ہوگا اور اُس رات کے چاند نے ریگ زارِ عرب میں اپنے سے لاکھوں گنا حسین چاند کا چہرہ دیکھ کر کیا محسوس کیا ہوگا۔ خیالات کی رو چلتی رہی۔ اُس لمحے کا تصور کر کے میرا دل بھر آیا جس لمحے حضور انور ﷺ اپنے دادا کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے ہوں گے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ دادا، پھر میری نگاہیں حضرت ابو طالبؓ کی حویلی کی طرف اُٹھ گئیں جس کی نرم و گرم آغوش نے میرے حضور ﷺ کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ اور پھر وہ لمحہ کہ جب حضور انور ﷺ نے اپنے شفیق چچا سے کہا کہ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور ایک ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں وہ کچھ کہنے سے باز نہیں آؤں گا جو کہہ رہا ہوں۔ زمانی اور واقعاتی ترتیب کے بغیر میرا ذہن ماضی کی پگ ڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ غار حرا، ابرہہ کا لشکر جرار، حضرت عبدالمطلبؓ کے اُونٹ، ابابیلوں کے جھنڈ، کھایا ہوا بھس، قریش کے مظالم، ابی طالب کی

گھاٹی، صفا کا پہاڑ...... مکہ میری نظروں کے عین سامنے تاریخ میں ڈھلتا رہا اور میں آج کے مکہ پر نگاہیں جمائے چودہ سو سال پہلے کا مکہ دیکھتا رہا۔

عصر کی اذان کے ساتھ ہی میں حرم کعبہ میں داخل ہوا۔ حج اور عمرہ کی کتابوں والے بتاتے ہیں کہ جس بھی دروازے سے داخل ہو، سب سے پہلے خانہ کعبہ پر نظر ڈالو اور پھر مخصوص دعائیں پڑھو۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ حرم کعبہ میں داخل ہوتے وقت خانہ کعبہ کے سوا کچھ سجھائی اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔ انسان جس بھی دروازے سے داخل ہوا، جس بھی زاویے سے دیکھے اُس کے سامنے سیاہ قبا میں ملبوس خانہ کعبہ اپنے تمام تر جلال و جمال کے ساتھ آ کھڑا ہوتا ہے۔ اُسے دیکھنے کے لیے کسی شعوری کوشش کی ضرورت ہی نہیں۔ تشنگی سے سلگتی آنکھیں کسی مقناطیسی کشش کے تحت خود بخود اُس کی طرف مڑ جاتی ہیں اور پھر اُسی کا حصہ بن جاتی ہیں۔

نماز اور عمرہ ادا کرنے کے بعد میں حجرِ اسود اور رُکن یمانی کی درمیانی دیوار کے سامنے بچھی صفوں پر بیٹھ گیا۔ میں جب بھی آتا ہوں، کوشش کرتا ہوں کہ اس علاقے میں تھوڑی سی جگہ مل جائے اور مجھے ہر مرتبہ یوں لگتا ہے جیسے میں ابھی ابھی یہاں سے اُٹھ کر آبِ زم زم کا گلاس پینے گیا تھا۔ زمان و مکان کے بہانے عجب ہیں کہ بعض اوقات صدیاں ثانیوں میں سمٹ آتی ہیں اور بعض اوقات ثانیے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں۔ میں یہاں بیٹھ کر اللہ کے گھر اور اُس کے بندوں کو دیکھتا رہا۔ وہ طواف کر رہے تھے۔ بلند آواز میں تلبیہ پڑھ رہے تھے۔ اُن کے بدن پر کفن جیسی دو چادریں تھیں۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے ان فرزندانِ توحید میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ایک لباس، ایک زبان، ایک جذبہ، ایک احساس۔ نہ کوئی شہنشاہ عالی مقام نہ کوئی گدائے بوریا نشیں، سب عشق کی دھیمی دھیمی آنچ میں جل رہے تھے۔ سب کی آنکھیں نم ناک تھیں اور سب زندگی کی ساری آلائشوں کو چھوڑ کر ایک ایسے جزیرے میں آ اُترے تھے جہاں رحمتوں، شفقتوں، محبتوں اور عنایتوں کی رم جھم جاری تھی اور دُور دُور سے آئے لوگ دُھل رہے تھے۔ صحن حرم لبالب بھرا تھا۔ عمرے کا موسم شروع ہو چکا ہے اور اہلِ عشق کے قافلے پیہم اُتر رہے ہیں۔

حجاج کرام کی تعداد تیس لاکھ سے اُوپر جا چکی ہے۔ معلوم نہیں کتنے لاکھ لوگ پورا سال عمرے کے لیے سرزمین حجاز آتے ہیں۔ مجھے ابھی تک رمضان المبارک میں یہاں آنے کی سعادت نہیں ملی لیکن بتاتے ہیں کہ ان دنوں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں موجود عشاق کی تعداد حج کے اجتماع کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب اس مقام و منزلت کا مرکز و محور نہیں رکھتا۔ لیکن یہ سب کچھ عالم اسلام کے اتحاد اور باہمی اُخوت کے سانچے میں کیوں نہیں ڈھل رہا؟ مجھے یہ سوال ہمیشہ دُکھی کر دیتا ہے اور اس مرتبہ بھی مجھے شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ خانہ کعبہ جس مرکزیت اور جس رُوحانی و فکری وحدت کا درس دیتا ہے ہم اسے اپنے احرام کے کسی پلو میں باندھ کر ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ کسی نہ کسی کو اس پہلو پر ضرور غور کرنا

چاہیے۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی تنظیمیں بڑے بڑے مقاصد کے ساتھ قائم ہیں جن کے پاس وافر وسائل بھی موجود ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ کعبتہ اللہ کی اس مرکزیت کے تناظر میں عالم اسلام اور دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے مابین اتحاد فکر و نظر پیدا کرنے اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں یکساں سوچ اُبھارنے کے لیے کچھ کریں۔

میں اس طرح کی سوچوں کے جنگل میں بھٹک رہا تھا کہ میرے عقب سے کسی نے زوردار ہچکی سی لی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گھنی سفید داڑھی والا نہایت بوڑھا شخص رو رہا تھا۔ اُس کی بجھتی ہوئی آنکھیں خانہ کعبہ پر جمی تھیں۔ اُس نے سوکھی لکڑیوں جیسے بازو اُٹھا رکھے تھے اور ان بازوں کے سروں پر رکھے دو ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اُس کے آنسو داڑھی کے سفید بالوں میں موتیوں کی طرح دمک رہے تھے اور وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ میرا دل اُسے دیکھ کر بھر آیا۔ ساری سوچیں یکا یک معدوم ہو گئیں اور آنکھوں میں ایک سیلاب سا کروٹیں لینے لگا۔ میں نے بوڑھے سے آنکھیں پھیر کر خانہ کعبہ کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کی جلالت و عظمت اور اپنی کم مائیگی کے احساس سے میری رُوح کپکپانے لگی اور پھر......

جب عشاء کی اذان بلند ہوئی تو میں چونکا۔ حرم لبالب بھرا تھا۔ طواف جاری تھا۔ حجرا سود اور رُکن یمانی کی دیوار نے بے پناہ شفقت سے میری طرف دیکھا اور میری رُوح طمانیت کے احساس سے بھر گئی۔ میں نے چاہا کہ بوڑھے کو تسلی دوں کہ اللہ کی رحمتیں بے پایاں ہیں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن وہ نہ جانے کہاں جا چکا تھا۔ شاید بہت پہلے حرم کعبہ کی دیواریں اُسے یہ پیغام دے چکی تھیں۔

[18-09-2003]

# روشنی ہی روشنی

میں شاید اُونگھ سا رہا تھا کہ کسی نے زور زور سے دل کے دروازے پر دستک دی اور میں ہڑ بڑا کر جاگ گیا۔ سعودیہ کا دیو قامت بوئنگ طیارہ اندھیرے کو چیرتا جا رہا تھا۔ مسافر نیم تاریک سے ماحول میں ادھ سوئے ادھ جاگے سے پڑے تھے۔ کچھ احرام میں، کچھ میری طرح احرام کے بغیر۔ میں نے نگاہیں کھڑکی کے شیشے سے لگا کر دیکھا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ نیچے پہاڑ ہیں کہ دریا، سمندر ہے کہ صحرا۔ جہاز ڈھلوان پکڑ چکا تھا۔ یکا یک مجھے دُور بہت دُور روشنیوں کا کارواں سا نظر آیا جیسے لاکھوں کروڑوں سار بان شمعیں روشن کیے کسی وسیع و عریض دشت کے بیچوں بیچ، ہولے ہولے سفر کر رہے ہوں۔ میں نے جہاز میں لگی ٹی وی سکرین پر نظر ڈالی۔ منزل جاناں کوئی زیادہ دُور نہ تھی۔ ایک بہت بڑے سے طشت میں رکھی روشنیوں کی لو تیز ہو رہی تھی۔ میں نے آسمان کو یوں زمین پر اُترتے کم کم ہی دیکھا ہے۔ طیارہ مسلسل پروں کو تولتا ہوا نیچے آ رہا تھا اور میرے بدن کا ایک ایک مسام ان جھکتے اُٹھتے پروں کے ساتھ کبھی گہرا غوطہ لگاتا کبھی سطح پر اُبھر آتا۔ پچھلی بار میں اس بستی کو آیا تھا تو میرا دل کسی گھاٹی میں کھو گیا تھا۔ غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ سینے پر دل کی جگہ کی طرف اُٹھ گیا۔ وہ وہیں موجود تھا لیکن دہکتی انگیٹھی جیسا۔ اچانک میری سانس تیز تیز چلنے لگی۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں نے نگاہیں پھر کھڑکی پر مرکوز کر دیں لیکن دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے آن کی آن میں سینہ شق کر کے باہر آ جائے گا۔ روشنیوں کا بے کراں سمندر کچھ اور قریب آ گیا تھا اور سنہری مشعلوں کے نور میں نہایا صحرا آنکھوں میں سمائی نہیں کھا رہا تھا۔ فضائی میزبان نے اعلان کیا کہ ہم مدینہ منورہ کے پرنس محمد بن عبدالعزیز ایئر پورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ میری رُوح کی اتھاہ گہرائی میں کسی نے چپکے سے کہا ''تم ہی نے کہا تھا نا مدینہ دُور ہے۔ اب دیکھو مدینہ تمہیں کس طرح بلا رہا ہے۔ بار بار، جلدی، جلدی۔''

جہاز نیچے آیا، اور نیچے۔ تب میری نگاہ حرم نبوی ﷺ کے پُرشکوہ میناروں پر پڑی جو روشنی کے سر بلند سفیروں کی طرح نصف شب کی ان ساعتوں میں نگراں کھڑے تھے۔ ان سے پیہم نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ سبز رنگ کا گنبد منور میناروں میں کہیں چھپ گیا تھا لیکن اس کی گونج ایک مشکبو سرگوشی کی طرح رس گھول رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے کوئی بلا رہا ہے۔ اس نے زمانے بھر کی مٹھاس میں گندھے شفیق لہجے میں کہا ''مدینہ دُور نہیں۔ آتے جاتے رہا کرو۔ زیادہ دیر نہ لگایا کرو۔ جو دیر تک اِدھر نہیں آتے، انہیں زنگ لگ جاتا ہے۔'' میرا ماتھا پسینے سے تر ہو گیا۔ بار بار آنے کے باوجود میری رُوح پر جما، زنگ کیوں نہیں اُتر رہا؟

میرے کانوں میں رس گھولنے والی آواز شاید طیارے کے سب مسافروں کو سنائی دے رہی تھی۔ اُن کے چہروں پر وصل کی شفق کا رنگ گہرا ہو رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگے تھے۔ عقیدت و محبت کی پھوار سے سارا جہاز بھیگ رہا تھا۔ بوئنگ نے درود و سلام کی صداؤں میں اس سرزمین پر قدم رکھا جہاں جنید و بایزید کو بھی اپنے اُوپر قابو نہ رہا تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ حرم نبوی ﷺ مقفل تھا۔ میں فجر کی اذان سے بہت پہلے مسجد میں آ گیا۔ عقیدت مندوں کے ریلے رنگ و نور کے سیلاب میں لہریں اُٹھا رہے تھے۔ بھنور بنا رہے تھے اور آخرِ شب کی ان سعید ساعتوں میں ساری کائنات اس کے دالان میں سمٹ آئی تھی جس کے لیے بنائی گئی تھی۔ تہجد اور نوافل کے بعد جب میں روضۂ اقدس کی طرف جانے لگا تو مجھے کچھ زیادہ خبر نہ تھی کہ یہ کیسا سفر ہے۔ میں جب بھی یہاں آیا ہوں، یہی لگا ہے کہ پہلی بار آیا ہوں اور جب بھی ہوش ٹھکانے آئے تو یوں لگا ہے جیسے میں تو صدیوں سے یہیں رہ رہا ہوں۔ ڈگمگاتے قدموں پر قابو پاتا، کچھ ڈولتا، کچھ کانپتا، منبر رسول ﷺ کے قریب سے گزر کر میں اس طرح سبز جالیوں کی طرف بڑھا جیسے جنم جنم کا پیاسا ایک ناتواں پرندہ اپنے شکستہ پروں کی ساری توانائیاں سمیٹ کر نیلگوں پانیوں والی کسی شفاف جھیل کی طرف بڑھتا ہے۔ عقیدت مندوں کے غول گردوپیش سے بے نیاز ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ ہچکیاں لے رہے تھے۔ سلام پیش کر رہے تھے۔ ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کتابیں اُٹھائے دعائیں پڑھ رہے تھے۔ میں اس غول میں چھپتا چھپاتا، حضور رسالت مآب ﷺ کی خواب گاہ کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔ اپنے اعصاب کی تمام تر قوت کو مجتمع کر کے میں نے آنکھوں کے پپوٹے اُوپر اُٹھائے جو پتھر کی سل کی طرح بھاری ہو رہے تھے۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں اُٹھا کر اس سرچشمہ نور کی طرف دیکھنے کی کوشش کی جس کی جہاں تاب کرنیں ابد تک تاریکیوں کا جگر چیرتی رہیں گی۔ میں آج تک ہاتھوں میں کوئی کتابچہ لے کر دربار نبوی ﷺ میں حاضر نہیں ہوا۔ میں جب بھی آپ ﷺ کے حضور دست بستہ کھڑا ہوتا ہوں، عربی کی ساری دعائیں بھول جاتا ہوں۔ اب کی بار بھی ایسا ہی ہوا۔ کچھ لمحے حیرتوں میں غلطاں رہنے کے بعد جب حواس بحال ہوئے تو میں دل کی بیاض کھول کے بیٹھ گیا۔ رحمت دو جہاں ﷺ کی ڈھیروں شفقتوں نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ ہمیشہ یہی کچھ ہوتا ہے۔ حضور ﷺ مجھے اپنی آغوش رحمت میں لے لیتے ہیں اور میں کھلونوں کے لیے مچلتے معصوم بچے کی طرح جانے آپ ﷺ سے کیا کیا کچھ کہتا رہتا ہوں۔ ان باتوں کی کوئی زبان ہوتی ہے، نہ لغت، لفظ، نہ جملے۔ اُسلوب گفتار نہ پیرایہ اظہار۔ یہ گہرے سکوت کے بھاری غلاف میں لپٹی کوئی بے نام سی التجا ہوتی ہے، ماں کی نرم و گرم آغوش میں پڑے بچے کی غوں غاں سے بنتی کہانیوں جیسی۔

مجھے پاکستان کی یاد آئی۔ اس کے چاک دامانوں کی یاد آئی۔ کشمیر کی عفت شعار بیٹیوں اور سینہ فگار

فرزندوں کی یاد آئی۔ فلسطین کی گلیوں میں ذبح ہوتے بچوں اور میزائلوں کا لقمہ بنتے آتش بجانوں کی یاد آئی۔ افغانستان کی اُجاڑ بستیوں کی یاد آئی۔ بھاری پگڑیوں، گھنی داڑھیوں اور لمبی عباؤں والی رُومانوی مخلوق کی یاد آئی۔ مجھے کوفہ و بغداد اور نجف و کربلا کے کوچہ و بازار میں نقش و نگار بناتے لہو کی یاد آئی۔ مجھے فلوجہ کے سخت جانوں اور اُن کی عظیم ماؤں کی یاد آئی۔ پھر مجھے اپنی ماں یاد آئی جس کی دعائیں ریگستانی سفر کی کڑی دھوپ میں ٹھنڈی گھٹا کی طرح میرے سر پر سائبان سا تانے رکھتی ہیں۔ جانے ساری دنیا کی مائیں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں؟ پھر مجھے چیچنیا کے جان باز یاد آئے۔ عالم اسلام کے سینے کا ایک ایک زخم میری التجاؤں میں انگاروں کی طرح دہکنے لگا۔ اے ختمی مرتبت ﷺ میری بستی کے ایک شاعر، الطاف حسین حالی نے ایک سو سال پہلے کہا تھا ''اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے''۔ اے خاصہ خاصان رسل ﷺ! یہ کڑا وقت ختم ہونے میں کیوں نہیں آ رہا؟ آگ اور نمرود کو ہمیشہ اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہی کا امتحان کیوں مقصود ہوتا ہے؟ کیا دنیا بھر کے اسلحہ خانوں کی خوں آشام مشینوں ہماری بستیوں کے لیے ہی بنی ہیں؟ کیا میزائلوں کے باپ اور بموں کی مائیں ملت بیضا ہی کا لہو پینے کے لیے بنتی ہیں؟ میرا دل بیٹھنے لگا اور میری آنکھیں درخت سے کٹی تازہ شاخ کی طرح سلگنے لگیں۔ آنسوؤں سے میرا چہرہ تر ہونے لگا۔ میں نے یہ آنسو پونچھنے کے لیے ہاتھ اُوپر اُٹھایا تو میری آستین سے تازہ لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس لہو میں کابل و قندھار اور کوفہ و بغداد کی خوشبو تھی۔ میں تھر تھر کانپنے لگا اور کھسکتا ہوا ایک گوشے میں جا بیٹھا۔

جی بھر کر رو لینے کے بعد میں کچھ ہلکا ہوا تو ایک بار پھر جالیوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ روشنی ہی روشنی۔ نور ہی نور۔ پروانے منڈلا رہے تھے۔ جل رہے تھے۔ بھسم ہو رہے تھے اور زندہ جاوید ہو رہے تھے۔ مجھے حفیظ تائب یاد آ گیا۔ اُس کی رُوح یقیناً حضور پاک ﷺ کے انوار ازلی و ابدی کے کسی متبرک ہالے میں ہو گی۔ اُس نے عشق و مستی کے کن کیف آگیں لحات میں کہا تھا۔

خواب ہی میں رُخِ پُرنور دکھاتے جاتے
تیرگی میرے مقدر کی مٹاتے جاتے
اُس خنک شہر کو جاتی ہوئی اے نرم ہوا
ساتھ لے جا میرے جذبات بھی جاتے جاتے
غار کو چشمۂ انوار بنانے والے
اُفقِ دل سے بھی مہتاب اُگاتے جاتے
کاش طیبہ میں سکونت کا شرف مل جائے
دیکھتے روضہ سرکار ﷺ کو آتے جاتے

اللہ اکبر اللہ اکبر! فجر کی اذان نے سحر پھونکا اور حرم نبوی ﷺ اس کی معطر گونج سے بھر گیا۔ میں نے ایک بار پھر روضۂ رسول ﷺ کی طرف دیکھا۔ روشنی کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ کون ہے جو اس روشنی کو گل کر سکے؟ تاریکیاں یونہی پیچ و تاب کھاتی رہیں گی اور جہانوں کو منور کرنے والی یہ روشنی اسی طرح پھیلتی رہے گی۔ کراں تا بہ کراں، اُفق تا بہ اُفق، روشنی ہی روشنی۔

[01-07-2004]

---

# یاحیّ یا قیّوم

یہ پہلا موقع تھا کہ میں اسلام آباد سے براہ راست مدینہ منورہ آ گیا۔ ایسا کرتے وقت میرے پیش نظر یہ معصوم سی آرزو تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کے قریب تر رہتے ہوئے مدینہ منورہ سے احرام باندھوں۔ بس اسے ایک طفلانہ سی طلب کہہ لیجئے ورنہ ہم تو ان راہوں کی دُھول بھی نہیں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کی سعادت و فضیلت حاصل ہوئی۔ بیئرعلی کی مسجد ذی الحلیفہ سے احرام باندھنے اور نوافل ادا کرنے کے بعد جب میں گاڑی میں بیٹھا اور میرے میزبان نے میری سیٹ کو کچھ اور آرام دہ بنانے کے لیے اس کا لیور دبایا اور گرمی سے بچنے کے لیے ائیر کنڈیشنر پوری رفتار سے چلایا تو میرے اندر سے کسی نے سرگوشی کی تم تو سنت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر رہنے کا سوچ کر آئے تھے۔ کچھ اندازہ ہے کہ وہ سفر کیسا تھا؟ کچھ جانتے ہو کہ اُن دنوں موسموں کی شدت کا کیا عالم تھا؟ کچھ خبر ہے کہ چودہ سو سال پہلے یہ پہاڑ، یہ گھاٹیاں، یہ صحرا اور یہ پتھریلی پگ ڈنڈیاں کس حال میں تھیں؟ کچھ گمان کر سکتے ہو کہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا کارواں کس ساز و سامان کے ساتھ نکلا ہوگا؟ اُن کی سواریوں، اُن کے سامان خوراک، ان کے زادِ راہ کا کچھ اندازہ ہے؟ کچھ قیاس کر سکتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فاصلہ طے کرتے کتنے کٹھن دن اور کتنی کڑی راتیں ان چٹیل پہاڑوں میں گزارنا پڑی ہوں گی؟ جانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کن کن گھاٹیوں کی کیسی کیسی چڑھائیوں اور کیسی کیسی ڈھلوانوں سے گزرنا پڑا ہوگا؟ جب رحمت دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم تھکن سے چور کسی منزل پر پڑاؤ کرتے ہوں گے تو جانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجوریں اور ستو بھی میسر آتے ہوں گے کہ نہیں؟ میرے ساتھی نے ایک سرخ لبنانی سیب میری طرف بڑھایا۔ گاڑی مدینہ مکہ موٹروے پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر رہنے کی آرزو شرمسار سی ہو کر میرے دل میں بکل مار کر بیٹھ گئی تھی۔

ساڑھے تین گھنٹوں کے سفر کے دوران میری نگاہیں سڑک کے دونوں طرف بکھرے سیاہ رنگ پتھروں، اُن کے عقب میں پھیلے ریت کے ٹیلوں اور اُن کی پشت پر کھڑے چٹیل پہاڑوں پر جمی رہتی ہیں۔ اپنے دوست کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتے ہوئے بھی میں اُس کے پاس موجود نہ تھا۔ میری سوئی اس بات پر اٹکی ہوئی تھی کہ جانے ان میں سے کس پہاڑ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک پڑی ہوگی۔ جانے کون سی گھاٹی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کو چوما ہوگا؟ جانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُونٹنی نے کس جھاڑی کی کونپلیں کھائی ہوں گی؟ بیتے زمانے کی گمشدہ ساعتوں کی تلاش میں، میں اتنی دُور نکل گیا کہ میرے دوست کو گلہ ہونے لگا۔

مغرب کی اذان فضاؤں میں ایک ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی جب میں حرم کعبہ میں داخل ہوا۔ حرم کے زائرین کی تعداد مدینہ منورہ سے کہیں زیادہ تھی۔ عمومی مشق کے مطابق عقیدت مندوں کے کارواں اکثر و بیشتر مکہ معظمہ میں ہی اُترتے اور کچھ دن یہاں گزار کر سرکار مدینہ ﷺ کے حضور سلام پیش کرنے روانہ ہو جاتے ہیں۔ حرم کعبہ کی شام میں ایک عجب طرح کی دلربائی و زیبائی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی مسافر صدیوں کے لمبے سفر کے بعد کسی شام اپنے گھر لوٹ آئے یا جیسے کوئی پرندہ دن بھر رزق کی تلاش میں بھٹکنے کے بعد سرِ شام اپنے گھونسلے میں پلٹ آئے۔ یہ شام اپنے اندر وصل کی ایک ایسی لذت رکھتی ہے جسے کوئی نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی سرشاری وہی محسوس کر سکتا ہے جو گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر خانہ کعبہ کو دیکھتا رہے۔ ٹکٹکی باندھ کر، آنکھ جھپکے بغیر۔

نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

نرگس کی آنکھ سے دیکھنے والوں کو وہ کچھ نظر آتا ہے جو جستجو اور تجسس کرنے والی نگاہ صدیوں میں نہیں دیکھ سکتی اور پھر جب شام چپکے سے رات میں تحلیل ہونے لگتی ہے اور حرم کے سارے چراغ جل اُٹھتے ہیں اور اللہ کے گھر کا جلال و جمال حد کمال کو پہنچتا دکھائی دیتا ہے اور طواف کرنے والوں کا دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے تو حرم کا دالان رب ذوالجلال کی کبریائی کے مشکبو تذکروں سے مہکنے لگتا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے دیکھے جو چپ چاپ بیٹھے حرم کعبہ کو ٹک ٹک دیکھتے رہتے ہیں۔ نہ اُن کی آنکھیں جھپکتی ہیں نہ اُن کے لب ہلتے ہیں لیکن پتھر جیسے اُن کے چہروں پر تازہ گلابوں کی لطافتیں کھلی ہوتی ہیں۔ اُن کے گرد بندگی اور عبودیت کا ایک ایسا نورانی سا ہالا ہوتا ہے کہ آنکھ بھر کر اُدھر دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور حرم کی صبح خوش جمال کا حسن شام کی رعنائی اور رات کی زیبائی کو سنولا دیتا ہے۔ فجر کی نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کچھ ایسا سماں باندھتی ہے جیسے آیات مقدسہ آسمانوں سے اُتر رہی ہوں۔ لیکن صبح، شام اور رات پر کیا منحصر، اللہ کے گھر کی تو ہر ساعت کا اپنا حسن، اپنا جادو ہے۔

نماز مغرب، طواف، سعی اور نماز عشاء سے فارغ ہونے کے بعد میں ایک گوشے میں بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ دنیا کے نگر نگر سے آئے مختلف چہروں، مختلف لباس، مختلف زبانوں اور مختلف طور طریقوں والے لوگ جب ایک ہی انداز میں ''لبیك اللّٰهم لبیك'' کی صدا بلند کرتے ہیں تو ایک عجب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ سماں بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن اکثر میں سوچتا ہوں کہ اللہ کی کبریائی پر یقین رکھنے اور یوں ببانگ دہل اس کا اعلان کرنے والے ہم لوگ، چڑیوں موملوں کی طرح مرکیوں رہے ہیں؟ ہزار سجدوں سے نجات دینے والے صرف ایک سجدے پر یقین رکھنے کے باوجود ہم چھوٹی چھوٹی چوکھٹوں پر ماتھا کیوں

رگڑ رہے ہیں؟ اللہ کے گھر کی دہلیز پر کھڑا ہو کر اتنا کھلا اور دوٹوک اعلان کرنے والے بندگان خدا اتنے خوف زدہ کیوں رہنے لگے ہیں؟ ہم یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ بندۂ مؤمن کا ہاتھ، اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے، غالب وکار آفریں بھی اور کارکشاؤ کارساز بھی۔ ہمیں کیوں یاد نہیں رہا کہ موت تو مومن کی عروسہ ہوتی ہے۔

حرم کا صحن بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ برآمدوں میں فروزاں ہزاروں یا شاید لاکھوں برقی قمقموں اور فانوسوں کی روشنی خانہ خدا کی طرف لپک رہی ہے۔ برآمدوں کی چھت پر نصب 144 انتہائی طاقت ور سرچ لائٹس، 144 ننھے منے سورجوں کی طرح دہک رہی ہیں۔ قطار اندر قطار بیٹھے ان ہزاروں لاکھوں زائرین میں سے کچھ اللہ کے ایسے پُر اسرار بندے بھی ہیں جن کے زمانے عجیب اور جن کے فسانے غریب ہیں۔ ان میں ایک ساٹھ پینسٹھ سال کا نحیف ونزار بوڑھا بھی ہے وہ حرم سے نکلتا ہی نہیں۔ کسی گوشے میں دو تین گھنٹوں کے لیے سو جاتا ہے۔ تہجد کی نماز کے لیے اُٹھتا اور عشاء کی نماز کے بعد تک حرم کی حدود سے باہر نہیں جاتا۔ اکثر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ طواف کعبہ اس کا محبوب ترین عمل ہے۔ دہکتی دھوپ میں بھی وہ کعبہ کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ عشاء کے بعد وہ آدھے گھنٹے کے لیے حرم سے نکلتا اور قریبی ریستوران چلا جاتا ہے۔ وہاں اُس کا کھانا پیک ہوتا ہے۔ وہ اُٹھاتا اور چپ چاپ واپس چلا جاتا ہے۔ مجھے اُس سے ملنے کا بڑا شوق ہے۔ مل گیا تو آپ کو بھی اُس کی کہانی سناؤں گا۔

عقیدتوں اور محبتوں کے ان مراکز میں بھی ہم لوگ اپنی جوتیوں کے شاپنگ بیگز اور دنیاداری کی پوٹلیاں ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ مسجد نبوی ﷺ اور حرم کعبہ میں نماز کے دوران، طواف کے دوران، روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے دوران موبائل فون مسلسل بجتے رہتے ہیں۔ صفا ومروہ کی سعی کے دوران میں نے ساتوں چکروں میں ایک پاکستانی کو فون پر گفتگو کرتے دیکھا۔ لیکن یہ میں کیسی باتیں لے بیٹھا ہوں۔ اللہ کے گھر میں دل کھلا رکھنا چاہیے۔ نہ جانے اُسے کون کتنا عزیز ہے۔ اگلے دن مغرب کی نماز سے ذرا پہلے ایک ایرانی نوجوان میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اذان کی آواز بلند ہوتے ہی اُس نے جھٹ سے کوئی نمبر ملایا، لحہ بھر کو بات کی اور پھر فون بند کیے بغیر ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ اذان ختم ہوئی تو اُس نے فون بند کر دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا ''میری ماں نے کہا تھا کہ مجھے حرم شریف کی اذان ضرور سنانا۔'' میں نے کہا تھا نا۔ ساری دنیا کی مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

میں مسلسل کعبہ کے غلاف کو دیکھ رہا ہوں۔ حجر اسود کے عین اُوپر، چھت کے قریب سنہری ریشے سے بنے الفاظ **یاحیّی یا قیّوم**، میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ شام رات میں تحلیل ہو رہی ہے لیکن ہزاروں لاکھوں برقی قمقموں کی روشنی نے حرم کے دالان کو نور میں نہلا دیا ہے۔ ایک دو دن بعد جب میں یہاں

سے چلا جاؤں گا تو بھی یہ دالان، یہ روشنیاں، یہ بیت اللہ اِسی طرح موجود ہوں گے۔

یاحیّی یا قیّوم۔ میں تو شاید پھر سے دنیا کے جھمیلوں میں تجھے بھول جاؤں، لیکن تو مجھے یاد رکھنا۔ تو نے بھلا دیا تو میں کہاں جاؤں گا؟

[02-07-2004]

# بامِ حرم کا کبوتر

آج میں نے اُسے ڈھونڈ نکالا۔

مجھے معلوم ہوا تھا کہ دُبلا پتلا چھوٹے سے قد کا بابا عشاء کی نماز کے فوراً بعد باب عبدالعزیز کے عین سامنے سڑک کی ایک بغلی گلی میں واقع ریستوران میں آتا ہے۔ اُسے کسی سے سوال کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ریستوران کا مالک یا اُس کے عملے کا کوئی فرد ڈبے میں پیک چکن بریانی اور پیپسی کا ایک کین اُس کے حوالے کرتا ہے اور وہ انہی قدموں لوٹ کر چلا جاتا ہے۔ مجھے ایک پاکستانی نوجوان نے جو خود پچھلے کئی سالوں سے مکہ معظّمہ میں مقیم ہے، بتایا تھا کہ یہ پُراسرار بابا کئی سالوں سے حرم کے اندر ہی رہ رہا ہے۔ وہ مستقل آنے والوں کو کسی نہ کسی گوشے میں بیٹھا مل جاتا ہے۔ تلاوت کرتے ہوئے، تسبیح پڑھتے ہوئے، ذکر کرتے ہوئے یا خانہ کعبہ پر نظریں گاڑے ٹک ٹک، اُسے دیکھتے ہوئے۔ اگر وہ کہیں بیٹھا نہ ملے تو پھر وہ طواف کرتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ کسی سے کم ہی بات کرتا ہے۔ اپنے آپ میں مگن کسی اَن دیکھی سی دنیا کا یہ باسی کسی کی طرف دیکھتا بھی کم کم ہے۔ اس مردِ پُراسرار کا تذکرہ سن کر مجھے تجسس ہوا کہ اس سے ملنا چاہیے لیکن ملنے کی کوئی صورت نہ بنی۔ میرے گائیڈ نے حرم میں اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ عشاء کے بعد اس ریستوران پر ناکا لگایا جائے جہاں وہ کھانا لینے آتا ہے۔

یہ ایک پاکستانی ریستوران ہے جس کے مالک دو ہندوستانی بھائی ہیں۔ محمد شبیر اور محمد شفیع۔ بے حد نفیس اور ٹوٹ کر محبت کرنے والے۔ انہوں نے اپنے ریستوران کا نام ہی پاکستانی ریستوران رکھا ہوا ہے۔ سبز ہلالی پرچم کا ایک بڑا سا بورڈ اس کی خاص نشانی ہے۔ میں نے محمد شفیع سے کہا کہ میں عشاء کے فوراً بعد آجاؤں گا۔ اور اگر بابا مجھ سے پہلے آجائے تو اُسے جانے نہ دینا۔ عشاء پڑھ کر میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ریستوران آگیا اور اُس کے وسیع دالان میں دری بچھا، تکیہ لگا کر بابے کا انتظار کرنے لگا۔ محمد شفیع میری آؤ بھگت میں لگ گیا اور پھر اچانک اُس نے نعرہ لگایا ''بابا آگیا۔'' وہ واقعی دُبلا پتلا بھی تھا اور چھوٹے قد کا بھی لیکن اُس کے بشرے میں ایک عجیب تحیر رچا بسا تھا۔ شفیع نے اُسے کہا ''صاحب تم سے ملنے کے لئے بیٹھے ہیں۔'' بابا نے میری طرف دیکھا اور اس انداز سے آگے بڑھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ میں نے اُٹھ کر بابا سے ہاتھ ملائے۔ ملائم، استخوانی سے ہاتھ جن میں نہ گرمی تھی نہ ٹھنڈک لیکن انسیت کا گداز رچا بسا تھا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ بابا پاکستانی

ہے اور بڑے میٹھے انداز میں پنجابی بولتا ہے۔

بابا کی کہانی میں کوئی الف لیلائی عنصر نہ تھا۔ یہ سچے، کھرے، بے داغ اور بے لاگ جذبوں کی کہانی ہے۔ زمینی حقیقتوں سے نابلد اور روشن خیالی سے نا آشنا اس عشق کی کہانی جو سارے رشتوں ناتوں کی پہچان گنوا دیتا اور اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیتا ہے۔ یہ عشق اپنا نشیمن بنانے کے لیے خاص مٹی سے بنے دل تلاش کرتا ہے۔ قدرت جانتی ہے کہ اس مے کو نازک آبگینوں میں ہی رکھا جاتا ہے۔ بابا کو اپنی تاریخ پیدائش یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس کے کچھ ہی عرصے بعد پاکستان بن گیا تھا۔ ماں باپ نے اُس کا نام عبدالمجید رکھا۔ عبدالمجید کا والد، ملک محمد، غریب آدمی تھا اور محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ عبدالمجید نے لاہور کے ایک مدرسے اور قاسم العلوم ملتان سے کچھ دینی کتب کا درس لیا۔ نوجوانی کے دنوں میں وہ لاہور کی چھوٹی چھوٹی مساجد میں امامت کا فریضہ بھی ادا کرتا رہا۔

''جب مجھے تھوڑے بہت پیسے ملتے تو پریشان ہو جاتا کہ انہیں کہاں خرچ کروں۔ میں نے سوچا کہ پیسے جوڑ کر حج کروں گا۔ میں ضیاء کے زمانے میں حج کے لیے آیا۔ پھر کئی بار عمرے کے لیے آیا۔ میری ماں ایوب کے زمانے میں ہی فوت ہوگئی تھی۔ ضیا کے زمانے میں باپ بھی چل بسا۔ پھر میں ادھر آتا تو کئی کئی مہینے یہیں حرم میں بیٹھا رہتا۔ میرے پاس کاغذ بھی نہیں ہوتے تھے لیکن پتا نہیں کس طرح میں یہاں سے مدینہ بھی چلا جاتا۔ اس سارے عرصے میں یہاں میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مکہ میں ہوتا تو دن رات حرم میں گزارتا۔ مدینہ میں حرم نبوی ﷺ جب راتوں کو بند ہوتا تو باہر کسی فٹ پاتھ پر لیٹ جاتا۔ پچھلے کئی سالوں سے تو میں مستقلاً یہیں بیٹھا ہوں۔''

وہ بولتا تو لگتا جیسے کنوئیں کے پاتال سے آواز آ رہی ہے۔ اُس کے تقریبا سارے دانت گر چکے ہیں۔ لمبی سفید داڑھی میں ٹھوڑی کے عین نیچے سفید بالوں کا ایک گچھا سا ہے۔ سر پر سفید رنگ کی پگڑی اور سفید شلوار قمیض میں ملبوس بابے کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ جذب و کیف کی اپنی ہی دنیا رکھتا ہے۔

بابا تمہارے بچے کہاں ہیں؟

''میں نے تو شادی ہی نہیں کی۔''

''کیوں۔''

''زندگی بھر کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ کسی نے میری ضرورت کا حال پوچھا تو بتا دیا۔ پاکستان کے لوگوں نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ شادی کرو گے یا نہیں۔'' وہ رات کا کھانا اس ریستوران سے اس لیے لے جاتا ہے کہ خود ریستوران والوں نے اُس سے جا کر درخواست کی تھی۔ آب زمزم کے تین چار گلاس اُس کا ناشتہ ہیں۔ دوپہر کو وہ صرف اُن کھجوروں پر گزارہ کر لیتا ہے جو لوگ حرم شریف میں لے کر آتے ہیں۔

اس سے زیادہ کی اُسے طلب نہیں۔ وہ ہر روز ایک سیپارہ کلام پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ ساری رات جاگ کر گزارتا ہے۔ اشراق کی نماز کے بعد کسی گوشے میں تین چار گھنٹوں کے لیے سو جاتا ہے۔ برس ہا برس اُس نے اس حال میں گزار دیئے کہ نہ اُس کے پاس ویزا تھا نہ اقامہ نہ کوئی اور قانونی دستاویز۔ حرم کے نگہبان اُسے دیکھتے اور نظر انداز کرتے رہے۔ ایک روز وہ رُکن یمانی کے قریب بیٹھا تھا کہ ایک عرب شیخ نے اُسے کہا ''بابا تمہارے پاس اقامہ ہے؟'' بابا نے نہیں میں جواب دیا۔ شیخ بولا ''میں تمہارا کفیل بننے اور اقامہ دلوانے پر تیار ہوں۔ بس تم میرے لیے دعا کیا کرو۔'' شیخ نے بابا عبدالمجید کو اقامہ دلوا دیا لیکن وہ اب بھی حرم ہی میں رہتا ہے۔

''تمہیں روپے پیسے کی ضرورت نہیں پڑتی؟''

وہ پہلی بار پوپلا منہ کھول کر ہنسا۔ ''تم لوگ معلوم نہیں روپے پیسے کو کیا سمجھتے ہو۔ مجھے جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ خود ہی پوری کر دیتا ہے۔'' ایک رات بڑے زور کا چھاپہ پڑا۔ حرم میں مستقل بیٹھے ہوؤں کو چن چن کر نکال دیا گیا۔ میں طواف کر رہا تھا۔ ایک پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں نے غلاف کعبہ کی طرف نگاہ کر کے کہا ''اے اللہ تو مجھے بے گھر کرنے چلا ہے۔'' پولیس والے نے زور سے میری مٹھی بند کی اور دُور چلا گیا۔ میں نے مٹھی کھولی۔ اس میں ایک بڑا سا نوٹ رکھا تھا۔

''پاکستان جانے کو جی نہیں چاہتا؟''

نہیں۔ میں اب اس مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔ حرم سے باہر آتے ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ جیسے مچھلی پانی سے نکل آئی ہو۔ میں نے خانہ کعبہ کے سائے میں وہ کچھ دیکھا ہے کہ تمہیں بتاؤں تو تاب نہ لا سکو۔ ایک رات ستون کے ساتھ ٹیک لگائے مجھے ایسے ہی بس اُونگھ سی آ گئی تو میں نے اپنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ............ بس دو نورانی سے ہاتھ تھے جن پر چاند کے ٹکڑے جیسا ایک بچہ دھرا تھا۔ ہاتھوں کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیسے کوئی فرشتہ ہو۔ بچے کے بارے میں کسی نے میرے دل میں ڈالا کہ یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میں اُن کے ماتھے پر بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھا تو سب کچھ کافور ہو گیا۔ اس خواب کا سرور اور اپنی محرومی کا احساس ساتھ ساتھ میرے دل میں رہتے ہیں۔

''یہ ریستوران والے کتنے مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

''سینکڑوں کو............ لیکن یہ ہوٹل والے کون ہوتے ہیں کسی کو کچھ کھلانے والے۔ سنا ہے یہ سارا انتظام ایک کشادہ دست مخیّر کی طرف سے ہے۔ لیکن وہ کون ہوتا ہے کسی کچھ کھلانے والا۔ یہ سب تو اُوپر والے کا کام ہے جو پتھر میں کیڑے کو بھی روزی دیتا ہے۔ میں نے کئی کئی ماہ حرم کے اندر رہتے ہوئے صرف پانی اور کھجوروں پر گزارا کیا۔'' وہ ایک بار پھر زور سے ہنسا اور آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا کر بولا ''میرا

رازق اور تمہارا رازق اور ساری دنیا کا رازق وہاں بیٹھا ہے۔"

پھر اُس نے اچانک میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ میرے دل پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا "تمہارے یہاں بہت روشنی ہے۔ روشنی نہ ہوتی تو مجھے پہچان نہ سکتے۔ اس روشنی کی حفاظت کرنا۔" اُس نے اپنے کھانے کا پیکٹ اُٹھایا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا واپس چلا گیا۔

میں دُور تک اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ دھیرے دھیرے، سبک قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ جسے دل بے نیاز عطا کر دیتا ہے وہ کس طرح ہر دو جہاں سے غنی ہو جاتا ہے۔ بابا عبدالمجید بھی کیا شخص ہے۔ بام حرم کے کبوتر جیسا سیر چشم، حال مست، درویش خو، پاک دل اور پاک باز۔

[03-07-2004]

# یہ عازمین عمرہ......!

حجاز مقدس آنے کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں دیے کی طرح ٹمٹماتی رہتی ہے۔ بے بسی اور بے چارگی کے ڈسے کم وسیلہ لوگوں کے دلوں میں اس آرزو کی میٹھی میٹھی آنچ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ان کی خواب دیکھتی آنکھوں میں بیت اللہ کا جلال اور گنبد خضریٰ کا جمال مسلسل لو دیتا رہتا ہے۔ آرزو کی بھٹی میں جلتے بھنتے یہ لوگ اپنی تمنا کو ہونٹوں پر لاتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں کہ کہیں ان کی نارسائی تماشا نہ بن جائے۔ عمر بھر ریزہ ریزہ جوڑ کر اس آرزو کا گھروندا بنانے والے جن خوش نصیبوں کی تمنا بھر آتی ہے، انہیں یوں لگتا ہے جیسے دولت دو جہاں ہاتھ آ گئی۔ وہ زندگی میں پہلی اور اکثر اوقات آخری بار، جہاز پر بیٹھتے اور مکہ مدینہ سے ایسی آسودگی سمیٹ کر لے جاتے ہیں جو اُن کی باقی ماندہ پوری زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ یہ غریب و سادہ سے لوگ، اُن عالی مرتبت لوگوں سے بڑے مختلف ہوتے ہیں جو لندن یا امریکہ یا یورپ کے کسی اور ملک کو آتے جاتے مکہ میں ''سٹاپ اوور'' کر کے عمرہ کی 'برکات' سمیٹ لے جاتے ہیں۔ ہجر کی لمبی راتوں کے کرب کے بعد وصل یار کی لذتیں سمیٹنے والے سادہ و معصوم لوگوں کی خوشی، جنیوا میں ورلڈ بینک کی کسی میٹنگ سے واپسی پر عمرہ کر لینے والوں کی خوشی سے بڑی مختلف ہوتی ہے۔ یہ لوگ حرم سے دُور کسی چھوٹے سے ہوٹل کے کمرے میں فرش پر ڈیرے ڈال لیتے، ایک وقت کا کھانا کھاتے اور سارا سارا وقت بیت اللہ کی دیواروں کے سائے یا روضۂ رسول ﷺ کی معطر ہمسائیگی میں گزارتے ہیں۔

میں مدینہ منورہ میں تھا کہ پاکستان سے گئے ایک صاحب مجھے ملنے آ گئے۔ وہ صرف میرے کالم کے حوالے سے مجھ جانتے تھے۔ اگلی شام اُن کی اہلیہ بھی اُن کے ہمراہ آ گئیں جو لاہور کے ایک بڑے کالج سے بطور پروفیسر ریٹائر ہوئی ہیں۔ دونوں میاں بیوی عالم اسلام اور پاکستان کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک وعدہ لیا کہ میں عمرہ کے لیے سرزمین حجاز آنے والے پاکستانیوں کے ان مصائب کے بارے میں آواز اُٹھاؤں گا جو پچھلے تین چار سالوں سے ان کا مقدر ہو گئے ہیں۔ مکہ معظمہ آنے کے بعد بھی مجھے متعدد پاکستانیوں نے اپنی دُکھ بھری داستانیں سنائیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان داستانوں نے مجھے ایک طرح کے احساس جرم میں مبتلا کر دیا ہے کہ میں نے اب تک اس طرف توجہ کیوں نہ دی؟ شاید اس لیے کہ میرا شمار بھی اس ''فضیلت مآب'' طبقے میں ہوتا ہے جو اپنی مرضی سے ویزا لگوا کر اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے یہاں آ سکتا اور اپنی مرضی ہی کے مطابق جہاں چاہے رہ سکتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ عمرہ ویزا کا معاملہ حکومت کے دائرہ اختیار سے نکل چکا ہے اور سب کچھ ٹریولنگ کا کام

کرنے والے ایسے ٹور آپریٹرز کے ہاتھ آ گیا ہے جو خصوصی انتظامات کے تحت سعودی عرب میں قائم کسی کمپنی سے معاہدہ کرتے ہیں۔ سعودی کمپنی عازمین کی رہائش، جدہ سے لانے اور لے جانے نیز مدینہ منورہ لے جانے، واپس لانے اور وہاں اُن کی رہائش کے انتظامات کرتی ہے۔ پاکستانی ٹور آپریٹر ایک لحاظ سے ان سعودی کمپنیوں سے براہ راست معاملات طے کرتے ہیں۔ ان عازمین کو عمرہ ویزا کے لیے خاصی رقم دینا پڑتی ہے حالانکہ سعودی سفارت خانہ اس ویزا کی کوئی فیس وصول نہیں کرتا۔ ان عازمین کو مختلف 'پیکیجز' دیئے جاتے ہیں مثلاً تین دن، سات دن، دس دن یا پندرہ دن کا پیکیج۔ پیکیج ہی کی مناسبت سے انہیں رقم بھی ادا کرنا ہوتی ہے۔

عازمین کی پریشانیوں کا سلسلہ پاکستان ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے پاسپورٹ ٹور آپریٹر کے حوالے کر کے پوری رقم ادا کر دیتے ہیں اور پھر انہیں لمبے انتظار کی چتا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اکثر وہ اس تاریخ پر روانہ نہیں ہو سکتے جو انہوں نے سوچ رکھی ہوتی ہے۔ ٹور آپریٹرز اُس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک عازمین کے ناموں اور کوائف کی تصدیق سعودی عرب سے نہ ہو جائے اور وہاں سے باقاعدہ ویزا جاری کرنے کی منظوری نہ آ جائے۔ ویزا لگ جانے کے بعد جہاز کی سیٹوں کا معاملہ درپیش ہوتا ہے اور عازمین 'آج کل' کے ایک اور آشوب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

جدہ ائرپورٹ پر اُترنے کے بعد اُن کے لیے آزمائش و ابتلا کا تیسرا صبر آزما دور شروع ہو جاتا ہے۔ امیگریشن کے تکلیف دہ مراحل سے گزرنے کے بعد جب وہ باہر آتے ہیں تو مختلف کمپنیوں کے کارندے بھوکی چیلوں کی طرح اُن پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ ہر عازم کے پاسپورٹ پر متعلقہ کمپنی کا اندراج ہوتا ہے۔ اس کمپنی کا کارندہ اپنے عازمین کو الگ کر کے بھیڑ بکریوں کے گلے کی طرح ہانک کر ایک طرف لے جاتا ہے۔ احرام باندھے ہوئے تھکے ہارے عازمین کو حکم ملتا ہے کہ وہ فوراً اپنے اپنے پاسپورٹ اور ٹکٹ حوالے کر دیں۔ کمپنی کا کارندہ انہیں ایک تھیلے میں ٹھونستا چلا جاتا ہے۔ بے بال و پر ہو جانے والے عازمین بے چارگی کے عالم میں بیٹھے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں اور بسا اوقات یہ انتظار کئی کئی گھنٹوں پر پھیل جاتا ہے کیوں کہ کمپنی کا کارندہ دس بارہ عازمین کو بس پر لے جانے کے بجائے پاکستان سے آنے والی دیگر فلائٹوں کا انتظار کرتا ہے تاکہ سواریاں پوری ہو جائیں۔ اس عمل میں پورا دن یا پوری رات بھی لگ سکتی ہے۔

معقول سواریاں پوری ہوتے ہی بس روانہ ہو جاتی ہے۔ عازمین کو حرم سے دُور کی عمارتوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیا جاتا ہے جہاں سے انہیں حرم آنے کے لیے اچھا خاصا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے پاسپورٹوں اور ٹکٹوں کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد انہیں پاسپورٹ تو مل جاتے ہیں لیکن ٹکٹوں کی واپسی بہت بڑی مشکل بن جاتی ہے۔ اکثر کمپنیوں نے پاکستانی گرگوں کو ملازم رکھا ہوا ہے جو اپنے ہم وطنوں کا لہو نچوڑنے کے درپے رہتے ہیں۔ واپسی کی

سیٹ ری کنفرم کرنے کے لیے عازمین کو ٹکٹوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ٹکٹ غائب کر دیئے جاتے ہیں۔ عازمین اپنی توجہ عبادات پر مرکوز رکھنے کے بجائے مختلف جھمیلوں میں اس طرح اُلجھا دیئے ہیں کہ ان کا سفرِ سعید پریشانیوں کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتا ہے۔ جب سفر میں ایک دو دن باقی رہ جاتے ہیں تو ان پریشان حال عازمین کے ساتھ سودا بازی ہوتی ہے۔ پاکستانی ایجنٹ ٹکٹ کی واپسی کے لیے بھتا وصول کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کا وافر حصہ کمپنی کے کارپردازوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ مجبور و بے بس عازمین کو اپنے ٹکٹوں کے لیے سو دو سو یا اس سے بھی زیادہ ریال ادا کرنا پڑتے ہیں۔ وہ ٹکٹ کنفرم کرانے جاتے ہیں تو بتایا جاتا ہے کہ ''آپ پہلے کیوں نہیں آئے۔ آپ کی سیٹ تو منسوخ ہو چکی ہے۔''

پی آئی اے کے عملے کے بارے میں بھی اتنی شکایتیں سننے کو ملیں کہ پورا دفتر تیار ہو جائے۔ ایک عام شکایت یہ ہے کہ کسی مشکل میں پھنسے پاکستانی کے درد کا مداوا کرنا تو دُور کی بات ہے، کوئی سیدھے منہ بات کرنے اور سوال کا جواب دینے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اِسی طرح کی کہانیاں پاکستان ہاؤس مکہ کے بارے میں ہیں جو ڈائریکٹر جنرل حج کا دفتر بھی ہے لیکن پاکستانی اس دفتر کے لیے اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان افسران کی مصروفیات اور دلچسپیوں کے بارے میں اتنا مواد موجود ہے کہ انہیں ایک دن کے لیے بھی یہاں گوارا نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایسے افسران کا انتخاب ناممکن نہیں جو خوفِ خدا رکھتے اور عازمین حج و عمرہ کی ہر ممکن خدمت کو اپنے فرائض کا حصہ سمجھتے ہوں۔ پاکستان ہاؤسز پر قابض مافیا اور برسوں کی مکروہ روایات کے امین گروہ کا محاسبہ صرف اِسی صورت میں ممکن ہے۔

برادرم اعجاز الحق ایک بار پھر مذہبی اُمور کے وزیر بن گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ وزارت اپنی پسند سے لی ہے اور اُن کا ایک بڑا مقصد حجاز مقدس جانے والے اہل وطن کی خدمت کرنا ہے۔ اعجاز الحق خود بھی دین سے محبت کرتے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ انہیں ایک تازہ مشن اور نئے عزم کے ساتھ اصلاح احوال کا بیڑا اُٹھانا چاہیے۔ یہ کام بیورو کریسی کی رپورٹوں اور اُن کے کاغذی اقدامات سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے خلوص دل اور پختہ کاری کے ساتھ ایک آپریشن کی ضرورت ہے۔ عمرے کا یہ نظام غالباً صرف پاکستان کے لیے مخصوص ہے۔ آخر کیوں؟ اعجاز الحق، سعودی عرب کے شاہی خاندان سے ذاتی مراسم بھی رکھتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ ان مراسم کو کروڑوں پاکستانیوں کے مفاد میں استعمال کریں۔ اتنا تو وہ فوری طور پر کریں کہ ڈایریکٹریٹ جنرل حج کے سینئر سٹاف کو فی الفور واپس بلا کر خدا ترس افسران کو تعینات کریں اور اُن اہلکاروں کو بھی واپس بلائیں جنہیں یہاں بیٹھے دس دس بارہ بارہ سال ہو گئے ہیں اور مردم آزاری جن کے رگ و پے میں رچ بس چکی ہے۔

[04-07-2004]

---

# تیری گلی سے جو نکلا......!

رحمت دو جہاں ﷺ کی بارگاہ ناز میں الوداعی سلام پیش کرنے کے بعد جب میں احرام باندھ کر مکہ معظّمہ کے لیے رُخصت ہوا تھا تو سوچ رہا تھا کہ جانے اب کتنے عرصے بعد کوئے جاناں کا پھیرا ہو گا۔ مدینہ منورہ کے گرد احاطہ کیے مقدس پہاڑوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ان سب کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لوں اور جب چاہوں پلکیں جھپک کر ان کا دلکش منظر تازہ کر لیا کروں لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ سو میری بے کل نگاہیں ہر پہاڑ کو بوسہ دیتی، اُن پر الوداعی نگاہ ڈالتی، گاڑی کی رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ کا عجب اعجاز ہے کہ دل بھرنے میں نہیں آتا۔ آپ دنیا کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں، امریکہ یا یورپ کے کسی بھی حشر ساماں شہر میں چلے جائیں، وہاں کی مٹی آپ کے قدموں میں زنجیر نہیں ڈالتی۔ وہاں کی ہوائیں، آپ کو آغوش میں لے کر تھپکیاں نہیں دیتیں۔ وہاں کے مناظر آپ کی رُوح کو ہمیشہ کے لیے مٹھی نہیں لیتے۔ ممکن ہے وہاں رزق کی فراوانی ہو، ممکن ہے وہاں کی راتیں عشرت سے بھری ہوں، ممکن ہے وہاں کا عمومی اُسلوب حیات اپنے اندر کشش رکھتا ہو۔ ممکن ہے سہولتوں اور آسانیوں کے حوالے سے وہ آپ کے خوابوں کی سرزمین ہو لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ بدستور ایک اجنبی شہر ہی رہتا اور دیار غیر ہی کہلاتا ہے۔ وہاں سے آپ ایک سال بعد آئیں یا دس سال بعد، دل اپنے گھر جانے کی خوشی سے بھر جاتا ہے۔ مکہ مدینہ کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ جب آپ اپنے گھر سے اس دیار مقدس کے لیے رخت سفر باندھتے ہیں تو آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہیں ہوتا کہ آپ اپنے گھر سے دُور کسی غیر ملک کا قصد کر رہے ہیں۔ اور مکہ مدینہ میں جی بھر کر رہ لینے کے بعد جب آپ اپنے وطن کو روانہ ہوتے ہیں تو دل کچھ ایسے دُکھ سے بھر جاتا ہے جیسے آپ اپنے گھر سے کہیں دُور جا رہے ہوں۔......

تیری گلی سے جو نکلا تو یوں لگا مجھ کو
کہ عمر بھر کے لیے اپنے گھر سے جاتا ہوں

مکہ معظّمہ سے رُخصت ہو کر میں نے جدہ سے سعودی ایئر لائنز کی پرواز لی جو اسلام آباد آ رہی تھی۔ جہاز نے اُڑان بھری تو بیت اللہ کا رُوح پرور منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ مجھے حرم کعبہ کا دالان اور اُس میں بیٹھے اہل دل کی یاد آئی۔ پھر مجھے بابا عبدالمجید یاد آیا جو سال ہا سال سے حرم شریف کے اندر رہ رہا ہے۔ پھر مجھے بابا شیرا کا خیال آیا۔ بابا شیرا سے میں ملا نہیں۔ لیکن مکہ معظّمہ میں رہنے والے ایک انتہائی

عبادت گزار نوجوان نعیم شہزاد نے مجھے بتایا کہ بابا شیرا پچھلے پچاس سالوں سے حرم کو نشیمن بنائے بیٹھا ہے۔ وہ کشمیر کے کسی قصبے میں رہتا تھا۔ دیارِ حجاز جانے کی آرزو نے ایک دن اُسے اتنا بے چین کر دیا کہ اُس نے چھوٹی سی پوٹلی اُٹھائی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بوڑھوں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ بولا...... ''حج کرنے۔'' پھر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ پاپیادہ جانے کن کن ملکوں اور کن کن بستیوں کی خاک چھانتا، جانے کتنے مہینوں یا کتنے برسوں بعد اپنی خوابوں کی سرزمین میں داخل ہوا۔ اُس کے پاس کوئی سفری دستاویز بھی نہ تھی لیکن عشق کا پروانہ لیے وہ پہلے رب کعبہ کے حضور پہنچا اور پھر رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ میں اس انداز سے حاضری دی کہ لوگوں کو اُسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ پھر وہ پلٹ کر نہیں گیا۔ حرم شریف اس کا مستقل ٹھکانہ ہے اور وہ وہاں سے چھٹی لے کر صرف اُس وقت نکلتا ہے جب اُسے سرکار مدینہ ﷺ کے حضور جانا ہو۔ میں نے اور نعیم نے اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ میں بابا شیرا کے عشق کی وسعت و گہرائی کا اندازہ لگا رہا تھا کہ مجھے ایک بار پھر مدینہ منورہ کے بے آب و گیاہ پہاڑ یاد آ گئے۔ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں بہت جلد ایک بار پھر آؤں گا۔

جہاز ٹیک آف کرنے کے بعد اُوپر کو اُٹھ رہا تھا کہ کیپٹن نے اعلان کیا۔ ''اسلام آباد جاتے ہوئے ہم آدھ گھنٹے کے لیے مدینہ منورہ کے محمد بن عبدالعزیز کے ائیر پورٹ پر رُکیں گے۔'' میں تو شہر جاناں کو الوداع کہہ آیا تھا لیکن شاید اس نے ابھی مجھے رخصت نہیں کیا تھا۔ میں جن پہاڑوں پر رُخصتی کے بوسے ثبت کر گیا تھا وہ ایک بار پھر میری رُوح میں ارتعاش سا پیدا کر رہے تھے۔ جہاز نے اُترتے سے پہلے ایک چکر سا لگایا لیکن زاویہ کچھ ایسا تھا کہ مدینہ منورہ کا ایک بڑا حصہ دکھائی دینے کے باوجود مسجد نبوی ﷺ کے سربلند مینار دکھائی دیئے نہ روضۂ رسول ﷺ کا سبز گنبد۔ لیکن یہ احساس میرے اندر ایک برقی رو سی دوڑاتا رہا کہ میرے طیارے کے پہیے اس وقت اس سرزمین کو چھو رہے تھے جو آسمانوں کی رفعتوں سے بھی ارفع ہے۔

میں نے بچھڑ جانے والے پہاڑوں کو دیکھا جو دو تین دنوں بعد ہی مجھ سے آن ملے تھے۔ جہاز نے کوئی آدھ گھنٹہ قیام کیا اور اس دوران میری آرزوؤں نے نہ جانے کتنے خوابوں کے پیرہن بدلے۔ میں سوچنے لگا کہ عین ممکن ہے کہ میری ساری دعائیں قبول ہو گئی ہوں۔ میں جب پاکستان جاؤں تو وہ مکمل طور پر بدل چکا ہو۔ وہاں کے حکمرانوں، وہاں کے سیاست دانوں اور وہاں کے اربابِ اختیار و اقتدار کی سوچ میں انقلاب آ گیا ہو۔ پاکستان کی خاطر انہوں نے اپنے دلوں کو نفرتوں، کدورتوں اور دشمنیوں سے پاک کر لیا ہو۔ ممکن ہے ائیر پورٹ پر اُترتے اور امیگریشن کے مراحل سے گزرتے ہوئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے کہ یہ ہمدرد، غم گسار اور خدمت شعار لوگ کہاں سے آ گئے ہیں۔ ممکن ہے مجھے لینے کے لیے آنے والے مجھے بتائیں کہ یہ وہ پاکستان نہیں جو تم ایک ہفتے پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ اب یہاں آئین سے

انحراف ناقابل تصور ہوگیا ہے۔ اب یہاں صحیح معنوں میں قانون کی حکمرانی ہے۔ اب ہماری عدالتیں کسی قاہر اور جابر کے خوف کو خاطر میں لائے بغیر ہر حال میں انصاف کا پرچم سربلند رکھتی ہیں۔ اب اسلام کے اُصولوں اور آئین کے تقاضوں کے مطابق حکمرانی صرف اُس کا حق ہے جسے عوام چاہتے ہیں۔ اب امن و امان کا یہ عالم ہے کہ سڑکوں پر سونا اُچھالتے جائیں، کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ اب امیر اور غریب کی خلیج پاٹ دی گئی ہے۔ اب طبقاتی نظامِ تعلیم گہری قبر میں دفن ہو چکا ہے۔ اب ہماری قومی خودی اس قدر بیدار ہو چکی ہے کہ امریکہ کوئی ناروا مطالبہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب وزیرِاعظم اس طرح تبدیل کیے جاتے تھے جس طرح کلاس ٹیچر مانیٹر بدلتا ہے۔ اب ہر مہذب اور روشن خیال ملک کی طرح ہمارے ہاں سچی، کھری اور بے داغ جمہوریت کا راج ہے۔ اب اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے سنجیدہ اور مخلصانہ کوششیں شروع ہو چکی ہیں۔ اب احتساب کا عمل سیاسی آلائشوں سے پاک ہو چکا ہے۔ آج پاکستان کی جری اور بہادر مسلح افواج نے اعلان کر دیا ہے کہ ہمارے بازوؤں کی ضربِ حیدری صرف پاکستان کے دشمنوں کے لیے مخصوص ہوگی اور ہم اپنی توانائیوں کی ایک ایک رمق دفاعِ وطن کے لیے وقف کر دیں گے۔ اب پاکستان میں ڈھونڈھنے سے بھی کوئی ایسا سیاست دان نہیں ملے گا جو محض دسترخوان یا اپنی جان کے لیے جمہوری قدروں کو روندے یا فوج کے اقتدار پر قابض رہنے کی مہم کا ساتھ دے......آج......آج......

میں نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں، میں نے ہر سچے پاکستانی کی طرح اپنے وطنِ عزیز کے لیے بہت کچھ مانگا۔ نہ جانے کتنے لوگ یہ دعائیں مانگ رہے ہیں لیکن ہم گناہوں میں لتھڑے ہوؤں کی دعائیں تو شاید منہ سے نکلتے ہی تھکے ہارے پرندے کی طرح گر پڑتی ہیں۔ ہمارے دلوں کے اندر تو جانے کیسی کیسی خواہشوں کے چھچھوندر رینگ رہے ہیں۔ ہماری بے بال و پر دعائیں عرشِ معلیٰ تک کیسے پہنچیں؟ لیکن وہ تو شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ وہ تو دلوں کے اندر سو غلافوں میں لپٹے بھید بھی جانتا ہے۔ پھر اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟

جہاز ایک بار پھر فضاؤں میں بلند ہو چکا ہے۔ مدینہ دُور ہو رہا ہے۔ اسلام آباد قریب ہو رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ جانے اب کتنی صدیوں بعد گھر واپس آنا نصیب ہوگا۔

[05-07-2004]

# قومی پرچم بردار اور عازمین عمرہ و حج

کراچی سے اسلام آباد آتے ہوئے مجھے جہاز بھرا بھرا سا لگا اور نشست سنبھالتے ہی گمان گزرا جیسے کسی شکنجے میں کس دیا گیا ہو۔ میں نے دائیں بائیں نظر ڈالی تو اکثر مسافروں کو انقباض کی کیفیت میں پایا۔ تھوڑی دیر بعد کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ پھر اِکا دُکا مسافر بولنے لگے کہ نشستیں اتنی قریب قریب اور تنگ کیوں ہوگئی ہیں؟ عملے سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اگلے دن سے حج پروازیں شروع ہو رہی ہیں لہٰذا طیاروں میں زیادہ مسافروں کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے نشستیں بڑھا دی گئی ہیں۔

اسلام آباد سے حجاج کرام کی پہلی پرواز کو الوداع کہتے ہوئے، سینیٹ کے چیئرمین جناب محمد میاں سومرو نے تلقین کی کہ ''حجاج ہر ممکن صبر اور برداشت سے کام لیں۔'' بلاشبہ حج کے سفر میں مشکلات کا پیش آنا فطری سی بات ہے۔ اب تو وہ ماہ و سال ہی نہیں رہے جب فریضہ حج ادا کرنے والوں کو قدم قدم پر لاتعداد مشکلات اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور اپنے گھر سے اللہ کے گھر اور پھر واپس اپنے گھر تک پہنچنے میں عمریں تمام ہو جاتی تھیں۔ لیکن سفر کے جدید ذرائع اور حکومت سعودی عرب کی مسلسل کوششوں کے باعث بے شمار سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس کے باوجود جب دنیا بھر سے آئے لاکھوں فرزندانِ توحید ایک ہی وقت میں، ایک ہی مرکز پر جمع ہوتے ہیں تو مسائل و مشکلات کا پیش آنا لازمی ہے۔ سو ایک مقدس فریضے کی تکمیل کے لیے رختِ سفر باندھتے وقت حوصلہ بلند، سینہ فراخ اور دل کشادہ رکھنا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حکومت عازمین عمرہ و حج کو ''صبر اور برداشت'' کا زادِ راہ پوٹلی میں تھما کر رُخصت کر دے اور خود بے نیازی کی چادر تان کر گہری نیند سو جائے۔

پی آئی اے اپنے آپ کو ''قومی پرچم بردار'' ادارہ کہتا ہے لیکن اللہ کے گھر اور اللہ کے نبی ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری کی تمنا رکھنے والوں کے ساتھ اس کا رویہ آزارِ مسلسل کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ عازمین عمرہ کے ساتھ پچھلے تین چار برسوں سے انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک طرزِ عمل روا رکھا جا رہا ہے۔ ان کے مصائب کا ایک پہلو تو سعودی کمپنیوں کے رویے سے تعلق رکھتا ہے جنہوں نے نہ صرف عازمین عمرہ بلکہ پاکستانی ٹور آپریٹرز کو بھی ٹکٹکی پر چڑھا رکھا ہے۔ عمرہ کی غرض سے جدہ ایئر پورٹ پر پہنچتے ہی مختلف سعودی کمپنیوں کے ایجنٹ اُن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اُن کے پاسپورٹ اور ٹکٹ چھین لیے جاتے ہیں۔ پہروں انتظار کے بعد انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح بسوں میں ٹھونس ٹھانس کر مکہ معظمہ پہنچایا جاتا ہے۔ وہ بتائی گئی رہائش گاہوں پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تو اُن کی بکنگ ہی نہیں ہوئی۔ دو چار دنوں

بعد رو پیٹ کر پاسپورٹ واپس مل جاتے ہیں لیکن ٹکٹ کمپنیوں کے ''گرگوں'' کے قبضے میں رہتے ہیں۔ دے دلا کر جب ٹکٹیں واپس مل جائیں تو کنفرمیشن یا ری کنفرمیشن کا مرحلۂ شوق شروع ہوتا ہے۔ پی آئی اے کے دفاتر میں اذیت و آزار کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ مکہ معظمہ میں پی آئی اے کا دفتر حرم شریف سے کئی کلومیٹر دُور شاہراہ ستین پر واقع ہے جہاں جانے کا واحد ذریعہ ٹیکسی ہے۔ مکہ، مدینہ اور جدہ میں واقع دفاتر میں تین یا چار کمپیوٹر دھرے ہیں اور عملہ انتہائی کم ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے آئے عازمین عمرہ کو اُن مسائل و مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو پاکستانی عازمین کا مقدر بنا دیئے گئے۔ پی آئی اے کے دفاتر کے باہر ہزاروں پاکستانیوں کی میلوں لمبی قطاریں ''گڈ گورننس'' کا اشتہار بنی رہیں۔ اپنا وقت یکسوئی کے ساتھ حرم کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ میں گزارنے کی تمنا لے کر جانے والے پریشانیوں کے ایک اور ہی گرداب میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ مقامی افراد ان ''غربا و مساکین'' کے کھانے پینے کا اہتمام کرتے ہیں۔ واپس آنے والے ''قومی پرچم برداروں'' کے حسن سلوک کی ایسی ایسی کہانیاں سناتے ہیں کہ سنتے ہوئے بھی سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اس شدید بد انتظامی پر پی آئی اے کے سربراہ نے معافی تو مانگ لی لیکن اُن سے کسی نے نہ پوچھا کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کسی نے اس ناقص منصوبہ بندی کی تحقیق و تفتیش نہیں کی۔ کسی نے سوال نہ کیا کہ اگر عمرہ کے لیے 27 رمضان المبارک سے پہلے خصوصی فلائٹس چلائی گئی تھیں تو 27 رمضان المبارک کے فوراً بعد خصوصی اضافی فلائٹس کا منصوبہ کیوں نہ بنایا گیا؟ اسلام آباد میں قائم ''عمرہ سیل'' کے بارے میں کئی کہانیاں گردش میں ہیں لیکن نہ خود پی آئی اے کی انتظامیہ کو ان کہانیوں کے سراغ سے کوئی دلچسپی ہے نہ حکومت اس ''متبرک سفید ہاتھی'' کی طرف گستاخانہ نگاہوں سے دیکھنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

پی آئی اے عازمین عمرہ سے سب سے زیادہ کرایہ وصول کرنے میں سرفہرست رہی۔ جون 2004ء میں اسلام آباد سے جدہ کا دوطرفہ کرایہ 24 ہزار روپے (علاوہ ٹیکس) تھا جو عمرہ سیزن آتے ہی اکتوبر کے شروع میں 34 ہزار روپے (علاوہ ٹیکس) کر دیا گیا ہے۔ کسی نے نہ پوچھا کہ یک لخت 10 ہزار روپے کے اضافے کا کیا جواز ہے؟ اُنہی دنوں کویت ایرویز 27 ہزار روپیہ، گلف ائیر لائنز 30 ہزار روپیہ اور قطر ائیر لائنز (براستہ دوہا، صنعا) ساڑھے 26 ہزار روپیہ کرایہ وصول کر رہی تھیں۔ سعودیہ ائیر لائنز کا کرایہ 32 ہزار روپے تھا جو پی آئی اے کی دیکھا دیکھی 34 ہزار روپے وصول کرتی تھی تو برٹش ائیر ویز، اسلام آباد سے لندن اور لندن سے اسلام آباد کا دوطرفہ کرایہ 30 ہزار روپے لے رہی تھی۔

پی آئی اے کی جابر انتظامیہ نے حج کے لیے پرائیوٹ ائیر لائنز کو قریب تک نہ آنے دیا اور اپنی اجارہ داری قائم رکھی۔ اس وقت حجاج کرام کو سعودی عرب لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری پی آئی اے اور سعودیہ ائیر لائنز کے پاس ہے لیکن پی آئی اے کا کرایہ، سعودیہ ائیر لائن سے لگ بھگ پانچ ہزار روپے

زیادہ ہے۔ بہترین سہولیات فراہم کرنے کا عالم یہ ہے کہ جہازوں کو پنجروں میں بدلا جا رہا ہے۔ بوئنگ 747 کی نشستیں 412 سے بڑھا کر 476 کر دی گئی ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں کہ 64 نشستوں کا اضافہ مسافروں کے لیے کتنی پریشانی کا باعث بنے گا؟ ائیر بس 300 کی نشستوں میں اضافہ کر کے 246 سے 270 کر دی گئی ہیں۔ یہی حال بوئنگ اور دیگر طیاروں کا ہے۔ کچھ عازمین حج طویل مدت کے لیے نہیں ٹھہرنا چاہتے۔ وہ اسلام آباد یا دوسرے شہروں سے باقاعدہ حج فلائٹس پر جانا چاہتے ہیں لیکن واپسی کے لیے اپنی مرضی کی کمرشل فلائٹ سے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پی آئی اے کی کارکردگی کا عالم یہ ہے کہ وہ اُن کی واپسی کی سیٹیں کنفرم کرنے پر آمادہ نہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ سیٹیں تقریباً نو ہزار روپیہ مزید ادا کرنے کے بعد صرف جدہ سے ہی کنفرم ہوں گی۔ اس کے برعکس سعودیہ یہیں سے نہ صرف سیٹیں کنفرم کرنے بلکہ واپسی کا بورڈنگ کارڈ تک دینے پر تیار ہے۔ خدشہ ہے کہ حج سے فارغ ہوتے ہی پاکستانی حجاج کرام جب سیٹوں کی کنفرمیشن یا ری کنفرمیشن کے لیے پی آئی اے کے دفاتر سے رابطہ کریں گے تو ایک بار پھر عمرہ والے مناظر رقم ہوں گے۔ کیا کوئی پی آئی اے کا ذمہ دار بتا سکتا ہے کہ سیٹیں پاکستان ہی سے کنفرم کر دینے میں کون سی چیز مانع ہے۔

پاکستان کے عوام تو زندگی کے ہر شعبے میں صبر و رضا اور تحمل و برداشت کو اپنا منشور بنا چکے ہیں۔ وہ جناب سومرو کی تلقین کو بھی یقیناً اپنے ساتھ لے جائیں گے لیکن کوئی 'باکمال لوگوں'' کے لیے'' لاجواب پروازوں'' کا اہتمام کرنے والوں سے پوچھے تو سہی کہ تم کیا کر رہے ہو؟ پی آئی اے بنیادی طور پر خسارے میں جانے والا ادارہ ہے جس نے حج اور عمرہ کو اپنی چھیدوں بھری تجوری بھرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول مقبول ﷺ کے مہمانوں سے کیے جانے والے سلوک کا نوٹس لے اور قومی پرچم برداروں کی خبر لے جو'' اجارہ داری'' کے باعث مسافران حرم کو نچوڑنے اور شکنجوں میں کس کر اذیتیں دینے کو کمال فن خیال کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنا چلن نہیں بدل سکتے تو حج و عمرہ آپریشن پر پی آئی اے کی اجارہ داری ختم کر دی جائے۔ اور نجی ائیر لائنز کو میدان میں آنے اور ہنر آزمانے کی اجازت دے دی جائے۔ حکومت کو اپنا وزن ایک بدنظم ادارے کے پلڑے میں ڈالنے کے بجائے عوام کے پلڑے میں ڈالنا چاہیے۔

[16-12-2004]

# وہ مردانِ حق اور یہ عازمینِ عمرہ!

اور روضۂ رسول ﷺ میں ایک اور مردِ حق آسودۂ خاک ہے! یکم محرم الحرام 24 ہجری کو دوسرے خلیفہ راشد امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ تاریخ انسانی کے عظیم ترین حکمرانوں میں شامل ہونے والے بہترین منتظم اور بے مثل فاتح کو رُخصت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ''روشن خیال اعتدال پسندی'' کے نعرے نے کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی اور قرآن کریم کی تعلیمات اور پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو ہی روشنی کا ازلی و ابدی سرچشمہ خیال کیا جاتا تھا۔ وہ جو کبھی ''تندخو'' شخص کی شہرت رکھتا تھا منصب خلافت پر فائز ہوا تو اُس نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا۔

''لوگو! تمہارے مال میں مجھے اتنا ہی حق ہے جتنا ایک یتیم بچے کے مال میں اُس کے ولی اور مربی کا۔ اگر میرے پاس دولت ہوگی تو میں تمہارے مال میں سے کچھ بھی نہ لوں گا اور اگر میں مفلس و قلاش ہوا تو تمہارے مال میں سے اُس قدر لینے کا حق حاصل ہوگا جو میرا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہو۔ لوگو! یاد رکھو میرے ذمہ تمہارے کئی حقوق ہیں جن کا تمہیں مجھ سے مواخذہ کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ میں ملک کا خرچہ، مال غنیمت اور ٹیکس بجا طور پر جمع کروں۔ دوسرا یہ کہ یہ خراج اور ٹیکس بے جا طور پر صرف نہ ہونے پائے۔ تیسرا یہ کہ تمہارے روزینے (تنخواہیں/وظائف وغیرہ) بڑھاؤں۔ چوتھا یہ کہ تمہاری سرحدوں کے حفاظت کروں اور پانچواں یہ کہ تمہیں خطرات سے بچانے کے لیے امن و امان قائم کروں۔''

سیدنا عمر فاروقؓ کے دس سالہ عہد خلافت میں اسلامی سلطنت کی سرحدیں اُفق تا اُفق پھیل گئیں لیکن عمرؓ ابن الخطاب مضبوطی کے ساتھ اُن اقدار و روایات کے ساتھ جڑا رہا جو حضور اکرم ﷺ اور پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قائم کی تھیں۔ ایک دن حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیت المال کا جائزہ لیا تو صرف ایک درہم نکلا۔ انہوں نے وہ درہم سیدنا عمر فاروقؓ کے صاحبزادے کو تھما دیا۔ امیرالمومنینؓ کو علم ہوا تو سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے جید صحابی کو طلب کیا اور فرمایا۔ ''تمہیں سارے مدینہ میں آل عمر سے زیادہ کوئی مستحق نظر نہیں آیا۔ تم چاہتے ہو کہ قیامت کے دن تمام اُمت مسلمہ کا ہاتھ میرے گریبان پر ہو۔'' یہ کہہ کر وہ درہم واپس بیت المال میں جمع کرا دیا۔ ایک دن بازار نکلے اور دیکھا کہ ایک خوب موٹا تازہ پلا پلایا اُونٹ فروخت ہو رہا ہے۔ پوچھا ''یہ کس کا اُونٹ ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ آپ کے صاحبزادے عبداللہ کا۔ عبداللہ سے پوچھا ''یہ اُونٹ کہاں سے آیا اور اتنا موٹا تازہ کیسے ہوگیا؟'' بیٹے نے کہا ''میں نے خریدا

تو یہ کمزور تھا اور سستا مل گیا۔ کئی دن چراگاہ میں خوب کھانے پینے کے بعد فربہ ہوگیا ہے۔'' امیرالمومنینؓ نے کہا ''چونکہ یہ چراگاہ سرکاری ہے لہٰذا تمہیں جو رقم بھی قیمت خرید سے زیادہ ملے گی وہ بیت المال میں جمع کرانا ہوگی۔'' ایک دن بیت المال کا ایک اُونٹ رسی تڑا کر بھاگ گیا۔ حضرت عمرؓ خود اُس کی تلاش میں نکلے۔ ایک رئیس احنف بن قیس نے دیکھا کہ امیرالمومنینؓ دامن چڑھائے بے چینی سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ احنف سے کہا ''آؤ تم بھی میرا ساتھ دو۔ بیت المال کا ایک اُونٹ بھاگ گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایک اُونٹ میں کتنے غریبوں کا حق ہے؟'' ایک اور شخص بولا ''امیرالمومنینؓ آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ کسی غلام کو حکم دیجئے وہ ڈھونڈ لائے گا۔'' فرمایا ''مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہوسکتا ہے؟'' ایک بار تنگ دستی اتنی بڑھی کہ قرض لینے کی نوبت آگئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے فرمایا ''مجھے کچھ رقم اُدھار دے دو۔'' وہ گویا ہوئے ''امیرالمومنینؓ! آپ بیت المال میں سے بھی قرض لے سکتے ہیں۔'' فرمایا ''لے تو سکتا ہوں لیکن لوں گا نہیں کیوں کہ اگر میں ادا کرنے سے قبل مرگیا تو لوگ میرے وارثوں سے تقاضا نہیں کریں گے اور میں یہ بوجھ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ایسے شخص سے قرض لینا چاہتا ہوں جو میرے متروکہ سے وصول کرسکے۔'' ایک بار شدید بیمار ہوگئے۔ طبیب نے شہد تجویز کیا۔ گھر میں شہد کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ بیت المال سے کچھ وصول کرنے کا اختیار نہ تھا۔ بیماری کی حالت میں مسجد نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لے گئے۔ نماز کے لیے جمع لوگوں سے پکار کر کہا۔ ''تم لوگ اجازت دو تو میں بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں؟'' شام کے سفر سے واپسی پر ایک جگہ ایک خیمہ نظر آیا۔ دیکھا کہ ایک بڑھیا رو رہی ہے۔ امیرالمومنینؓ نے بڑھیا سے سوال کیا ''عمر کا کچھ حال احوال معلوم ہے؟'' بڑھیا بولی ''سنا ہے شام سے روانہ ہو چکا ہے۔ مجھے تو اُس کے ہاں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی۔'' حضرت عمرؓ نے فرمایا ''اتنی دُور کا حال عمر کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟'' بڑھیا بولی ''حال معلوم نہیں تو خلیفہ کیوں بنا بیٹھا ہے؟'' اتنا روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی اور ہچکی بندھ گئی۔

یہ اُس فرمان روا کی باتیں ہیں جس کی سلطنت آج کے سعودی عرب، مصر، شام، اردن، لبنان، فلسطین، عراق، ایران، افغانستان، عمان، قطر، متحدہ عرب امارات، یمن، پاکستان، بلوچستان، جنوبی ترکی، شمالی سوڈان، تاجکستان، آذربائیجان، ازبکستان، ترکمانستان، کویت اور بحرین پر مشتمل تھی۔ اور عمرؓ کو رُخصت ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ آج ہم روشن خیال اعتدال پسندی کے عہد خوش خصال میں جی رہے ہیں۔ گڈ گورننس ہمارا منشور حکمرانی ہے۔ ہمارے ہاں بھی ٹیکس اور محصولات وصول کرنے کا کڑا انظام رائج ہے۔ ہمارے ہاں بھی بیت المال قائم ہے۔ لیکن خبر آئی ہے کہ مئی 2004ء سے ستمبر 2004ء تک صرف پانچ ماہ کے اندر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تین وزرائے اعظم نے بیت المال کے پانچ کروڑ روپے اپنے اہل وعیال، ذاتی ملازموں، رُفقاء واحباب، سیاسی گماشتوں اور رشتہ داروں کے عمروں پر اُڑا دیئے۔

میر ظفر اللہ خان جمالی 29 افراد کا جتھا ہمراہ لے گئے اور سات دن تک حرمین شریفین کی فیوض و برکات سمیٹتے رہے۔ چودھری شجاعت حسین تین ماہ کے لیے وزیرِاعظم بنے تو قومی تاریخ کا سب سے بڑا ''کاروانِ عمرہ'' لے کر حجاز مقدس روانہ ہوگئے۔ یہ وسیع وعریض کارواں 134 افراد پر مشتمل تھا جو چار دن تک غلاف کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ سے لپٹا رہا۔ جناب شوکت عزیز 49 عازمین کا مقدس قافلہ ہمراہ لے گئے جس میں تھرپارکر اور اٹک میں اُن کی انتخابی مہم کے نگہبان بھی شامل تھے اور جو تین دن تین راتیں عبادات اور وظائف میں مصروف رہے۔ جمالی صاحب نے ایک کروڑ ستر لاکھ، چودھری صاحب نے ایک کروڑ باون لاکھ اور جناب شوکت عزیز نے ایک کروڑ تیرہ لاکھ روپے ان عمروں پر اُڑا دیئے۔ یہ رقم اُس قوم کے خزانے سے وصول کی گئی جس کے چھ کروڑ افراد خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ سرکاری درباری زائرین کی فہرست پر نظر ڈالیے۔ ان میں ہر قبیل کے رشتہ داروں کے علاوہ ارب پتی اور کروڑ پتی وزرائے کرام اور اہل سیاست بھی شامل ہیں۔ غریبوں کی ہمدردی میں تقریریں کرتے وقت اُن کی آواز شدت کرب سے بھرا جاتی ہے اور ان غریبوں کے خون پسینے کی کمائی شیر مادر سمجھ کر ہضم کرتے وقت یہ ڈکار تک نہیں لیتے۔ تین سالوں میں پانچ بار اپنی تنخواہیں اور مراعات بڑھاتے ہوئے یہ جھرجھری تک نہیں لیتے۔ کروڑوں روپے افطار پارٹیوں، دعوتوں، عصرانوں اور عشائیوں پر اُڑاتے وقت یہ غریبوں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ اربوں روپے کی پُرتعیش گاڑیاں منگوانے سے بھی ان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ نگر نگر کے بے مقصد دوروں سے بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ کیا ستم ہے کہ اللہ کے گھر حاضری اور روضۂ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر حضوری کے لیے بھی یہ ایک مفلوک الحال اور قلاش قوم کی جیب کترنے سے گریز نہیں کرتے۔ یہ تو صرف تین وزرائے اعظم کے تین وفود عمرہ کا احوال ہے اور وہ بھی ادھورا۔ ان پانچ سالوں کے دوران اور بھی کئی سرکاری درباری عمرے ہوئے ہیں اور ان عمروں میں شریک مستحقین پر بھی کروڑوں روپے خرچ ہوئے ہیں۔ ان پانچ سالوں پر ہی کیا موقوف ''حلوائی کی دکان پر نانا جی کا فاتحہ'' تو برس ہا برس سے جاری ہے۔

اللہ کا خوف تو ذرا دُور کی بات ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں کیا دربار رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں حاضری کے وقت بھی ان کے ماتھوں پر ندامت کے قطرے نمودار نہیں ہوتے؟ کیا حضور رسالت مآب ﷺ اور آپ کے پہلو میں آسودۂ خاک ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے تصور سے بھی ان کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوتے؟ شاید عہد حاضر کی ترقی پسندی اور روشن خیالی کے نزدیک چودہ سو سال پہلے کی باتیں دقیانوسیت اور انتہا پسندی کے زمرے میں آتی ہیں۔

[10-02-2005]

# مدینہ

گھر سے نکلتے وقت میرا پروگرام مختلف تھا اور ٹکٹ اِسی پروگرام کے مطابق تیار ہوا تھا۔ طے پایا تھا کہ میں دو دن متحدہ عرب امارات میں گزار کر دبئی سے جدہ روانہ ہو جاؤں گا۔ جہاز مقامی وقت کے مطابق شام سات بجے جدہ پہنچے گا۔ ہوائی اڈے کی سست رو کارروائی میں گھنٹہ بھر اور لگ جائے گا۔ باہر نکلوں گا تو آٹھ سوا آٹھ بج رہے ہوں گے اور میں وہیں سے گاڑی لے کر مکہ معظمہ روانہ ہو جاؤں گا۔ ایسا کرنے کے لیے مجھے دبئی یا پھر میقات سے احرام باندھنا تھا۔ خیال کی پہلی کونپل اسلام آباد ہی میں پھوٹی تھی اور جب میں دبئی پہنچا تو اس پر کلیاں سی آنے لگیں۔ بلاوجہ کوئی ہلچل سی ہونے لگی جیسے حجرۂ دل کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہو۔ جیسے بادلوں کے بیچوں بیچ کوئی ستارہ ساٹمٹما رہا ہو۔ دبئی میں دن بھر مصروف رہنے کے باوجود میں دل اور دماغ میں بپا اس ارتعاش سے غافل نہ رہا۔ سرِشام میں نے ایک محبت کرنے والے دوست سے کہا کہ وہ سعودی ایئرلائنز سے رابطہ کر کے پوچھے۔ اگر کوئی پرواز رات دس بجے کے لگ بھگ جدہ سے مدینہ جا رہی ہو تو میں مدینہ منورہ چلا جاؤں گا۔ دو تین دن وہاں گزار کر وہیں سے احرام باندھ کر عمرہ کے لیے مکہ معظمہ چلا جاؤں گا۔ پچھلی بار یہ تجربہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس نے خبر دی کہ رات دس بجے ایک پرواز مدینہ جا رہی ہے۔ میں نے کہا ''اگر کوئی سیٹ مل رہی ہے تو لے لو۔'' تھوڑی دیر بعد اطلاع آئی کہ سیٹ بھی مل گئی ہے۔ میرے اندر پھوٹنے والی کونپل یکا یک رنگا رنگ پھولوں سے بھری شاخِ گل بن گئی۔ مدینہ مجھے اِسی طرح بلاتا، اِسی طرح دامانِ دل کو اپنی طرف کھینچتا اور اِسی طرح اپنی آغوشِ رحمت میں لیتا ہے۔

دبئی کے قیام کے دوران وسوسہ سا رہا کہ تھوڑی سی تاخیر بھی ہو گئی تو میں مدینہ کی پرواز نہیں لے پاؤں گا لیکن دبئی سے امارات ایئرلائنز کا طیارہ ایک سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر مقررہ وقت پر روانہ ہوا اور ایک سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر مقررہ وقت پر جدہ کے شاہ عبدالعزیز ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔ ضابطے کی کارروائیوں میں بھی زیادہ دیر نہ لگی۔ سامان کی نکاسی والی جگہ بھیڑ لگی تھی۔ گٹھڑیاں اور صندوق کھل رہے تھے۔ ان میں رکھے اثاثے بکھر رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ یہاں کم از کم نصف گھنٹہ لگ جائے گا۔ تب ڈیوٹی پر متعین ایک سینئر اہلکار نے مجھے اشارہ کر کے کہا کہ اس دروازے سے نکل جاؤ۔ میں سامان لیے قطار سے باہر آیا اور اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیرونی سڑک پر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ پاس پڑوس کے کسی ہال میں داخلی پروازوں کا کاؤنٹر ہو گا لیکن منتظر دوست نے بتایا کہ ہمیں یہاں سے ایک اور ایئرپورٹ جانا ہو گا جو پندرہ

بیس کلو میٹر دُور ہے۔ تمام ائیر لائنز کی بین الاقوامی پروازیں ایک ائیر پورٹ پر اُترتی ہیں جب کہ سعودی ائیر لائنز کی پروازوں کے لیے ایک الگ ائیر پورٹ مخصوص ہے۔ مجھے مدینہ کی پرواز وہیں سے لینا تھی۔ خلاف معمول سڑک پر ٹریفک کا ہجوم نہ تھا اور جب میں سعودی ٹرمینل پہنچا تو پونے 9 بج رہے تھے اور جہاز کی روانگی میں سوا گھنٹہ باقی تھا۔ یہاں سے بھی طیارے نے ٹھیک 10 بجے اُڑان بھری اور ٹھیک 35 منٹ بعد وہ پرنس محمد بن عبدالعزیز ائیر پورٹ اُتر گیا۔ کمپیوٹر میں بھرے پروگرام کی طرح سب کچھ مرتب، مربوط اور منضبط انداز میں ہوا تھا۔

طیارے میں میری نشست بائیں ہاتھ کی پہلی کھڑکی کے ساتھ تھی۔ کپتان کے اعلان سے بہت پہلے مجھے صحرا میں فروزاں چراغوں کا جھلمل کرتا سمندر دکھائی دینے لگا تھا۔ مدینہ نور میں نہایا ہوا تھا اور سنہری قمقموں کی روشنی آسمانوں کی طرف لپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ جہاز اور نیچے آیا تو میری نگاہیں حرم نبوی ﷺ کو تلاش کرنے لگیں۔ ابھی جہاز کے پہیوں نے زمین کو نہیں چھوا تھا کہ مجھے اس سیل رنگ و نور میں مسجد نبوی ﷺ کے میناروں کی جھلک دکھائی دی۔ تاروں بھرا آسمان زمین پر اُترا ہوا تھا اور حرم نبوی ﷺ کے مینار کتنے ہی چاند آغوش میں لیے کھڑے تھے۔ کوشش کے باوجود مجھے سبز گنبد کی کوئی جھلک نہ دکھائی دی۔ ماضی میں، میں جب اس بستی میں آیا میرا دل میرے قابو میں نہ رہا اور ایک بار تو وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر جانے کن وادیوں کو نکل گیا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اپنے دل پر ہاتھ رکھا جس کی دھڑکنیں معمول کے عین مطابق تھیں۔ میرے اعصاب پُرسکون تھے۔ میری آنکھیں بھی سوکھی سوکھی دھرتی کی طرح ویران ویران، بنجر بنجر سی تھیں۔ جہاز کا دروازہ کھلتے ہی میں نے دونوں بیگ اُٹھائے اور باہر نکل آیا۔ سیڑھی پر پہلا قدم رکھتے ہی شہر جاناں کی ہوا کے پہلے جھونکے نے مجھے چھوا تو کوئی شے میرے رُوح کے پردوں کو چیرتی ہوئی دُور اندر تک اُتر گئی۔ میں لمحہ بھر کو لڑکھڑا سا گیا۔ میرا ذہن دُھلی ہوئی تختی کی طرح خالی خالی سا ہو گیا۔ قدم بوجھل سے ہونے لگے۔ ہوائی اڈے کے باہر میرا دوست گاڑی لیے کھڑا تھا۔ اُس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور میں رسمی سی علیک سلیک کے بعد اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ابھی ائیر پورٹ سے نکلی بھی نہ تھی کہ میں نے پوچھا ''حرم نبوی ﷺ کھلا ہوگا؟''

اُس نے بے نیازی سے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور سپاٹ لہجے میں بولا ''وہ تو 10 بجے بند ہو جاتا ہے۔ اب آپ تہجد کی اذان کے ساتھ ہی جا سکیں گے۔''

میں اُس کی طرف گردن گھمائے بغیر ونڈ سکرین پر نظریں لگائے کشادہ سڑک کو تکتا رہا جہاں اس وقت بھی دن کا سماں تھا۔ گاڑیاں فراٹے بھر رہی تھیں اور در و بام جگمگا رہے تھے۔ میں جذبے سے عاری راکھ کا ڈھیر بنا ہوا تھا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ پھر یوں لگا کہ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں جوں کا توں ہوں۔ جیسے اسلام آباد میں تھا۔ جیسے چند گھنٹے قبل دبئی میں تھا۔ لیکن نہیں۔

وہاں تو میں زندہ تھا، ہنس رہا تھا، بول رہا تھا، محفلوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ کیسی کیفیت ہے کہ میں ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا ہوں۔ جیسے میں نیند اور بیداری کی کیفیت میں کسی نیم روشن، نیم تاریک سے جزیرے پر پڑا ہوں۔ میرا دوست بول رہا تھا، میں سن رہا تھا۔ جواب بھی دے رہا تھا۔ لیکن لفظ شعور کے دریچوں پر دستک دیئے بغیر یونہی میرے ہونٹوں سے گر رہے تھے۔ یکا یک بغیر سوچے سمجھے میرے منہ سے آپ ہی آپ جملہ پھسل گیا۔

''کیا حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کھلا ہوگا؟'' میرے دوست نے رحم بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر مجھے احساس دلائے بغیر کہ وہ پہلے ہی اس سوال کا جواب دے چکا ہے بڑی ملائمت سے بولا ''حرم تو دس بجے بند ہو جاتا ہے۔ اب تو تہجد کی اذان کے ساتھ ہی جاسکیں گے۔'' شیشے جیسی سڑک پر دوڑتی موٹر کو ایک جھٹکا سا لگا اور میرے اندر کوئی زخم پھٹ گیا۔ درد کی ایک ٹیس سی اُٹھی۔ میں نے ضبط کی ساری قوت جمع کرتے ہوئے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ پھر نزع کے عالم والی مری مری سی آواز میرے منہ سے نکلی۔
''تہجد کی اذان کو تو ابھی پانچ گھنٹے پڑے ہیں۔'' میرے دوست نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''پانچ گھنٹے یوں گزر جائیں گے پلک جھپکنے میں۔'' میرا دل پانچ صدیوں کے تصور سے ڈوبنے لگا اور میں اپنے دوست کو یہ بھی نہ کہہ سکا کہ ''یہاں کوئی پلک جھپکنے نہیں، نرگس کی آنکھ سے دیکھنے آتا ہے۔ جس پر جنبش مژگاں بھی بار ہوتی ہے۔''

[27-03-2005]

---

# صلو علیہ و آلہ

تہجد کی اذان بلند ہوئی تو میں جاگ رہا تھا۔ اپنے کمرے سے اُٹھ کر مسجد نبوی ﷺ آنے میں پانچ سات منٹ لگے۔ ان پانچ سات منٹوں میں مسجد کے کم و بیش آٹھ بلند مینار میری نظروں کے سامنے رہے۔ جن کے انگ انگ سے نور کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن مجھے سبز گنبد اب بھی نظر نہ آیا۔ کل والی بے نام سی کیفیت کافی حد تک دُور ہو چکی تھی اور شوق کی حدت بڑھنے لگی تھی لیکن مدینہ گھنگھور گھٹا کی طرح تلا کھڑا تھا اور برسنے نہیں پا رہا تھا۔ باب عبدالعزیز سے آگے نکل کر جونہی میں دائیں ہاتھ مڑا میری نگاہیں یکا یک اُوپر کو اُٹھیں اور میں نے دیکھا کہ ایک منور مینار کے پہلو میں سبز گنبد عین اُسی طرح جلوہ گر ہے جس طرح میں نے پچھلی بار اور اُس سے پچھلی بار دیکھا تھا۔ اس کے عین اُوپر آسمان پر صفر کا چاند دمک رہا تھا۔ اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک ستارہ لو دے رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میرے دل میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور میرا ذہن حواس خمسہ کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ گنبد پھیلتا چلا گیا۔ کتنے ہی چاند اور کتنے ہی ستارے اس سے ہم آغوش ہونے کے لیے مچلنے لگے۔ پھر مجھے لگا جیسے سارے اجرام فلکی اسی گنبد کے مدار میں گردش کر رہے ہوں۔ میں خود اس مدار کا ایک حقیر سا سیارچہ بن گیا۔ میری نگاہیں گنبد پر جمی تھیں اور میرے قدم میکانکی انداز میں اُٹھ رہے تھے۔

تہجد اور نماز فجر کی ادائیگی کے بعد میں ریاض الجنۃ کے ایک گوشے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ موسم العمرہ ابھی باضابطہ طور پر شروع نہیں ہوا اس لیے زائرین کا ہجوم نہیں۔ بڑی تعداد مقامی لوگوں کی ہے جن کی قسمت میں مدینہ لکھ دیا گیا ہے۔ میں بیٹھے بیٹھے کسی حیرت زدہ بچے کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور مسجد کی لامحدود وسعتیں میری آنکھوں میں سما نہیں رہی تھیں۔ میں سوچتا رہا کہ آج اس مسجد کے اندر، اس کی چھتوں پر اور اس کے صحنوں میں سات لاکھ نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن سوا چودہ سو سال قبل یہاں کیا ہوگا؟

ریاض الجنۃ کے گوشے میں بیٹھے بیٹھے میں بہت دُور نکل گیا۔ سرور دو جہاں ﷺ مدینہ تشریف لائے تو چودہ دن تک جہاں نماز کا وقت آتا وہیں ادا فرما لیتے۔ پھر مسجد بنانے کا ارادہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ اپنی اُونٹنی پر سوار نکلے۔ اُونٹنی مسجد والی جگہ کے قریب بیٹھ گئی۔ یہ جگہ دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی ملکیت تھی۔ جو حضرت اسعد بن زرارہؓ کے ہاں زیر پرورش تھے۔ اُونٹنی کے بیٹھتے ہی حضور ﷺ نے فرمایا ''انشاءاللہ یہ جگہ ہمارا ٹھکانہ ہوگی۔'' پھر سہل اور سہیل کو بلایا گیا۔ حضور ﷺ نے جگہ کی

قیمت ادا کرنا چاہی تو ابد تک کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ مند ہونے والے بچوں نے کہا ''حضور ﷺ! ہم یہ جگہ آپ کو بطور عطیہ دیتے ہیں۔'' مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ حضور ﷺ خود پتھر گارا اُٹھاتے ہوئے ایک شعر پڑھ رہے تھے۔ ''یہ بوجھ خیبر کی کھجوروں کا بوجھ نہیں۔ اے ہمارے رب یہ تو انتہائی پاکیزہ اور نیک کام ہے۔'' کچی مٹی کی اینٹوں، کھجور کی شاخوں کی چھت اور کھجور کے تنوں کے ستونوں والی چھوٹی سی مسجد پہلی اسلامی ریاست کا دارالخلافہ بھی تھی۔ پارلیمنٹ ہاؤس بھی، مرکز عدل و انصاف بھی، سرچشمہ رشد و ہدایت بھی اور اسلامی علوم کی پہلی درس گاہ بھی۔ خود نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، ولید بن عبدالمالک، مہدی عباسی، سلطان اشرف قسیبائی اور سلطان عبدالمجید کے ادوار میں مسجد نبوی ﷺ کی توسیع اور تعمیر نو کا کام جاری رہا۔ لیکن عہد سعودی میں مسجد کی توسیع اور عظمت و شکوہ میں اضافے کے لیے کی جانے والی کوششیں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ جلالتہ الملک عبدالعزیز آل سعود، شاہ فیصل شہید اور خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز کے ادوار میں ہونے والا کام صدیوں پر بھاری ہے اور کسی نہ کسی پہلو سے یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

میں ائیر کنڈیشنڈ ماحول، جگمگاتے قمقموں اور دبیز قالینوں والی مسجد میں بیٹھا سوچتا رہا کہ کچی اینٹوں، کھجور کے پتوں کی چھتوں اور کھجور کے تنوں کے ستونوں والی چھوٹی سی مسجد جانے کس جگہ ہوگی جس کے ہر ہر مسام میں میرے حضور ﷺ کے پسینے کی خوشبو رچی بسی ہوگی۔ مجھے کچھ کچھ یاد آنے لگا کہ یہ مسجد کم و بیش اُس جگہ تھی جہاں آج کل حضور ﷺ کے منبر و محراب ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہولے ہولے منبر و محراب کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اُس وقت تک کچھ اندازہ نہ تھا لیکن اب لگتا ہے کہ میں غیر شعوری طور پر بارگاہ رسالت ﷺ کے قریب تر ہونے اور سرکار مدینہ ﷺ کے حضور سلام پیش کرنے کے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا کیوں کہ مجھے یکا یک جالیوں کے عین سامنے جا کر کھڑے ہونے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہولے ہولے قدم اُٹھاتا میں منبر رسول ﷺ کے قریب جا بیٹھا۔ احادیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ جمعہ کے دن کھجور کے ایک تنے کے سہارے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ کھجور کا یہ تنا مسجد کی چھت کا ستون بھی تھا۔ کبھی کبھی خطبہ طویل بھی ہو جاتا تھا۔ ایک انصاری خاتون نے سوچا کہ حضور ﷺ کو اتنی دیر کھڑے رہنے سے تکلیف ہوتی ہوگی۔ عرض کیا ''اے اللہ کے رسول ﷺ ہم آپ کے لیے ایک منبر نہ بنا دیں۔'' حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ درخت کی شاخوں سے تین سیڑھیوں والا ایک منبر تیار کر دیا گیا۔ جمعتہ المبارک کا دن آیا تو حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے نئے تیار کردہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ ابھی خطبے کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ چھوٹی سی مسجد سسکیوں اور چیخوں سے بھر گئی۔ کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور بچوں کی طرح اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ صحابہ کرام حیرت زدہ تھے کہ یہ کیا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ ''وہ ایک مصیبت زدہ شخص کی طرح دہائی دے رہا تھا۔'' سیدنا جابر بن عبداللہؓ

سے روایت ہے کہ ''وہ بچے کی طرح چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔''

حضور ﷺ نے دیکھا کہ یہ کھجور کے تنے سے بنا وہ ستون ہے جس کا سہارا لے کر آپ خطبہ دیا کرتے تھے۔ منبر بن جانے کے بعد وہ حضور ﷺ کے جسد مبارک کے لمس سے محروم ہو گیا تھا اور محرومی کا یہ احساس ہچکیوں اور سسکیوں میں ڈھل گیا تھا۔ حضور ﷺ منبر سے اُترے اور فریاد کناں ستون سے لپٹ کر اُسے چپ کرانے لگے۔ پھر اُس کی ہچکیاں تھمتی گئیں اور وہ محمد ﷺ کے سینے کی نورانی تمازتوں کو اپنے سوکھے رگ و ریشے میں سما کر ہمیشہ کے لیے آسودہ ہو گیا۔

میں اب تک اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا لیکن منبر و محراب کے پہلو سے نکل کر بائیں ہاتھ روضۂ رسول ﷺ کی طرف مڑتے ہوئے میرے اندر سلگتی ہوئی گیلی لکڑیوں کی سی جلن اُٹھی اور میری آنکھیں ان لکڑیوں کے دھوئیں کے باعث نم ہونے لگیں۔ پھر کسی نے میرے کان میں چپکے سے کہا۔ ''مدینہ بھی کبھی دُور ہوا ہے۔'' سنہری جالیوں کے سامنے کھڑے کھڑے میں دیر تک پگھلتا رہا، روتا رہا اور حال دل کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ میں نے برسوں پہلے ایک شعر کہا تھا۔

ایسا کچھ ہو کہ ترے دل میں سما بھی نہ سکے
عمر بھر لفظ چنے اور بتا بھی نہ سکے

میں لفظ چنتا رہا اور لفظ مجھ سے گریزاں رہے۔ مجھے کھجور کے سوکھے تنے کا خیال آیا۔ اُس کے پاس کون سے لفظ تھے؟ وہ تو کچھ بھی نہیں بولا تھا؟ بس آنسو تھے، سسکیاں تھیں، ہچکیاں تھیں اور حضور ﷺ نے اُسے اپنی آغوش محبت میں لے لیا تھا۔ آسودگی اور سکون سے لدی خوشبو بھری ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا باب البقیع سے اندر آیا اور سنہری جالیوں کو چومتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔ تب میری زبان سے درود و سلام کے جھرنے سے پھوٹ نکلے اور میرا ویرانہ دل ایک مشکبو گونج سے معمور ہو گیا۔ صلو علیہ و آلہ صلو علیہ و آلہ۔

[29-03-2005]

# مدینہ کیسی بستی ہے!

عمرہ کے لیے رختِ سفر باندھتے ہوئے مجھے اکثر تمنا ہوتی ہے کہ مدینہ سے احرام باندھ کر عازمِ مکہ ہوں۔ اب کی بار بھی میں جدہ سے براہ راست مدینہ منورہ چلا گیا اور تین دن وہیں مقیم رہا۔ مسجد نبوی ﷺ کی فضا میں کچھ ایسی آسودگی بھری ہے کہ رُوح کے سارے زخم آن کی آن میں بھر جاتے ہیں، درد کی اُٹھتی ہوئی ٹیسیں یکا یک تھم جاتی ہیں۔ احساس و فکر میں کروٹیں لیتی بے کلی کافور ہو جاتی ہے اور آدمی اپنے آپ کو ہوا کے لطیف جھونکے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ شفقت، محبت، اپنائیت اور لطافت میں گندھی یہ فضا دنیا کے کسی خطے کی کسی عمارت، کسی بستی، کسی قصبے میں میسر نہیں۔ مدینہ سے محبت ہر مسلمان کے دل میں خوشبو کی طرح رچی بسی ہے اور جسے اپنے خواب کی تعبیر مل جائے وہ یقیناً اپنے بختِ سعید پر ناز کر سکتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

''اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ سے بھی زیادہ کر دے۔''

یقیناً اِسی دعا کا ثمر ہے کہ ہر کلمہ گو مسلمان، مدینہ کے خواب دیکھتا، مدینہ کی آرزو کرتا، مدینہ کے لیے زادِ راہ جوڑتا اور مدینہ کی تمنائے بے تاب سے سرشار رہتا ہے۔ میں جب بھی حضور ﷺ کے شہر میں آتا ہوں، اپنے جذبہ و احساس پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ سبز گنبد پر نگاہ پڑتے ہی دل میں ایک زلزلہ سا بپا ہوتا ہے اور جسم کا بند بند ہل جاتا ہے۔ میرا جہاز رات ایسے وقت پہنچا تھا کہ حرم نبوی ﷺ بند ہو چکا تھا۔ ہوٹل کے آرام دہ کمرے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کافور رہی۔ دل کی دھڑکنیں ڈوبتی اُبھرتی رہیں۔ میں کھڑکی کھولے حرم کے چار بلند و بالا میناروں کو دیکھتا رہا جو ایک قطار میں لگے کھڑے تھے اور جن کے انگ انگ سے نور کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔

تہجد کی اذان کے ساتھ ہی میں مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوا۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد میں دیر تک ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ میں کئی دفعہ یہاں آ چکا ہوں اور کئی بار یہ سب کچھ دیکھ چکا ہوں لیکن ہر بار ہر شے میں مجھے ایک نیا پن، ایک نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں سوچتا، دماغ کی کھڑکیاں سختی سے مقفل کر دیتا ہوں۔ بس دیکھتا رہتا ہوں، دیکھتا رہتا ہوں اور میری آنکھیں جنم جنم کی تشنگی بجھاتی رہتی ہیں۔ اب کی بار بھی ریاض الجنتہ میں بیٹھے بیٹھے، میں ایک معصوم بچے

کی طرح اپنے گردوپیش کو دیکھتا اور لطافتیں سمیٹتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ خود بخود میرے ذہن کی مقفل کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان نورانی مقامات اور علامتوں سے تو میرا برسوں کا رشتہ ہے۔ تاریخ کے اوراق اُلٹنے لگتے ہیں اور چودہ سو سال پہلے والی مسجد نبوی ﷺ کے آثار میری آنکھوں میں سرمے کی لکیر کی طرح بکھرنے لگتے ہیں۔

سامنے حضور ﷺ کا منبر رکھا ہے۔ یقیناً یہ وہ نہیں جو حضور ﷺ کے عہد مقدس میں تھا لیکن اس کی علامتی حیثیت ضرور ہے۔ یہ ایک پورے عہد کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ہجرت کو آٹھ سال ہو گئے تھے کہ ایک انصاری خاتون نے عرض کیا۔ حضور ﷺ کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے ہیں جس سے آپ کو زحمت ہوتی ہوگی۔ کیوں نہ آپ کے بیٹھنے کے لیے ایک منبر بنا لیا جائے۔ حضور ﷺ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ لکڑی کے ڈنڈوں کے ذریعے تین سیڑھیوں کا ایک منبر بنا دیا گیا۔ جب حضور ﷺ نے اس منبر کی تیسری سیڑھی پر تشریف فرما ہو کر پہلا خطبہ ارشاد فرمایا تو کھجور کے تنے کا بنا ستون، حنانہ پھوٹ پھوٹ کر رُو دیا جس سے حضور ﷺ پشت لگا کر کھڑے ہوتے تھے۔ حضور ﷺ نے شفقت و محبت سے اُسے سینے لگا لیا اور اُس کا دل دائمی سکون سے بھر گیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ منبر کی ہیت اور شکل تبدیل ہوتی رہی۔ آخری ممبر سلطان مراد ثالث عثمانی نے 998ہجری کو بطور تحفہ پیش کیا جو ہنر کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ یہی منبر مسجد نبوی ﷺ میں رکھا ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

''میرے گھر اور منبر کا درمیانی ٹکڑا جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور میرا منبر میرے حوض (کوثر) پر ہوگا۔''

میں اس وقت گھر اور منبر کے درمیان واقع جنت کے اِسی باغیچے میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ صدیوں قبل میرے گردوپیش کیا کچھ ہوگا۔ چشم فلک کیسے کیسے دل کشا منظروں سے آسودگی حاصل کرتی ہوگی! مخملی قالینوں اور قیمتی سنگ مرمر کے نیچے سوئی وہ خاک کتنی خوش بخت ہوگی جسے حضور ﷺ، آپ کے اہل بیتؓ اور صحابہ کرامؓ کے پائے مبارک چومنے کا شرف حاصل ہوا اور پھر میں ہولے ہولے قدم اُٹھاتا روضۂ رسول ﷺ کی جالیوں کے سامنے آ کھڑا ہوا اور جب بھی میں اپنے بدن کی ساری توانائیاں سمیٹ کر یہاں تک پہنچتا ہوں تو مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ میں اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہوں۔ میرے اعصاب میری گرفت میں نہیں رہتے۔ میرا دل میرے سینے سے نکل کر جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ میری آنکھیں جالیوں پر مرکوز ہوتی ہیں اور میرا بدن بید مجنوں کی طرح لرزنے لگتا ہے۔ مجھے وہ دعائیں بھی بھول جاتی ہیں جو میں بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی پوٹلی میں باندھ کے لاتا ہوں۔ تب مجھے اس آفاقی شعر کا مفہوم سمجھ

میں آتا ہے کہ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

میں نے بڑے بڑوں کو یہاں موم کی طرح پگھلتے اور مشت خاک کی طرح بکھرتے دیکھا۔ سائنس کا کوئی علم اس کیفیت کے اسباب و محرکات کا جائزہ نہیں لے سکتا۔ منطق کسی طرح کا استدلال نہیں لاسکتی۔ عقل لب بام تماشا دیکھتی رہ جاتی ہے۔ دانش اُنگلی دانتوں تلے دابے محوِ حیرت کھڑی رہتی ہے۔ کوئی اس راز کو نہیں پا سکتا کہ عشق رسول ﷺ کی تمازتیں کون سے سرچشمہ نور سے پھوٹتی اور کس طرح انسان کی نس نس میں بھر جاتی ہیں۔ کس طرح سنگِ خارا جیسے سخت مزاج اور تند خو بھی جب نور کے اس ہالے میں آتے ہیں تو اُن کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگتی ہیں اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے ہیں۔ اس طرح کا گریہ اور اس نوع کی زاری میں نے کسی مقام پر نہیں دیکھی۔ میں نے انسانوں کو یوں پتنگوں کی طرح کسی شمع فروزاں پر گرتے اور بھسم ہوتے نہیں دیکھا۔

میں پہلی بار آج سے ستائیس سال قبل 1978ء میں اپنے والدین کے ہمراہ نور کی اس بستی کو آیا تھا۔ اُس وقت کی قلبی کیفیت کو میں نے ایک نظم کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی تھی۔ آج بھی میری کیفیت وہی ہے۔ آج بھی جب وہ نظم یاد آتی ہے تو دل میں عشق و وارفتگی کی وہی آنچ دہکنے لگتی ہے اور آنکھیں خود بخود بھیگتی چلی جاتی ہیں۔

میں آج آپ کو بھی احساسِ دروں کی اس آتشِ خاموش میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

مرا مقام کہ یثرب کی سرزمین دیکھوں!
مرا نصیب کہ ارضِ رسول ﷺ تک پہنچوں!
یہ بات میرے تخیل سے ماوراء تھی کہ میں
نبی ﷺ کے شہر میں پہنچوں نبی ﷺ کی نعت کہوں
عجیب سادگیٔ عشق کے تقاضے ہیں
کہ خاک ہو کے ثریا کو چومنا چاہوں
یہ داغ داغ جبیں اور یہ تری دہلیز
ترے کرم کے کرشمے تری نظر کا فسوں
میں ایک بندۂ ناچیز راندۂ درگاہ

شکستہ پا و غریب و فتادہ و محزوں
خراب و بےکس و بے چارہ و تہی داماں
شکستہ حال و نحیف و نزار و خوار و زبوں
مری بیاضِ عمل نامۂ سیاہ کی طرح
مرے گناہ شمار و حساب سے افزوں
یہ چاہتا ہوں کہ پہنچوں قریب تر لیکن
قدم اُٹھاؤں تو سو بار ڈگمگا جاؤں
میں کس خیال سے لپٹوں ترے ستونوں سے
میں کس طرح ترے روضے کی جالیاں چوموں
دعا کو ہاتھ اُٹھاؤں تو لفظ ہی نہ ملیں
یہ سوچتا ہوں کہ مانگوں تو کس طرح مانگوں
حضور ﷺ! رحمت کون و مکاں ہے آپ کا نام
ہر اک درخت کا سایہ، ہر ایک چھت کا ستوں
ہر ایک درد کا درماں، ہر ایک غم کی دوا
ہر ایک آنکھ کی ٹھنڈک، ہر ایک دل کا سکوں
یہ تیرے دامنِ رحمت سے ہے بعید کہ میں
تری گلی سے تہی دست لوٹ کر جاؤں
وہ جس کو ساقی کوثر کہا ہے قرآں نے
میں اس کے شہر میں آ کر بھی تشنہ لب لوٹوں؟
حضور ﷺ آپ کی دہلیز پر کھڑا ہوں میں
جو آپ سے نہ کہوں حال دل تو کس سے کہوں
حضور ﷺ کب سے ہوں ناآشنائے لذتِ عشق
نہ میری آنکھ میں آنسو نہ میرا دِل پُرخوں
نہ میں جنوںِ سے شناسا نہ شوق آبلہ پا

نہ چشمِ نم، نہ تمنائے غم، نہ سوزِ دروں
حضورﷺ میری نظر خوگرِ تماشا ہے
حضورﷺ آتشِ خاموش کو ترستا ہوں
حضورﷺ بارگہ فیض سے عطا ہو مجھے

وہ کیف و درد کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں
وہ آگ دے کہ پگھل جاؤں موم کی صورت
حریمِ دل کو اُجالوں، مثال شمع جلوں
نگاہ و قلب کی گہرائیاں ملیں مجھ کو
کہ دل پہ چوٹ بھی کھاؤں تو آہ تک نہ بھروں
مرے وجود کی قاشیں بکھر بکھر جائیں
میں تیرے شہر کی گلیوں کی دُھول بن جاؤں
جگر خراش ہے کچھ اس قدر حدیثِ و داع
یہ سوچتا ہوں بچھڑنے کی بات ہی نہ کروں
تری گلی سے جو نکلا تو یوں لگا مجھ کو
کہ عمر بھر کے لیے اپنے گھر سے جاتا ہوں
ہر ایک گام پہ ٹپکے مرے جگر کا لہو
ہر ایک موڑ کو اشکوں کے ہار پہناؤں
عطا ہو دولتِ عرفان و آگہی مجھ کو
ہزار کوس پہ جا کر بھی تیرے پاس رہوں

آج ستائیس سال بعد بھی میں عجزِ بیاں کا شکار ہوں اور یہی اشعار میری ترجمانی کر رہے ہیں۔

[30-03-2005]

---

# جامعہ اور مجمع

مدینہ منورہ سے روانگی کا دن، مصروف ترین گزرا اور سچ تو یہ ہے کہ برادر عزیز عبدالمالک مجاہد نے اسے بھرپور بنا دیا۔ میں اسے بھی دربار رسالت ﷺ کا فیضان خیال کرتا ہوں کہ حضور ﷺ نے مجھے اپنے شہر سے الوداع کہتے ہوئے کئی سعادتوں سے بہرہ مند فرما دیا۔

رات ہی خبر ہوگئی تھی کہ جامعۃ الاسلامیہ یعنی مدینہ یونیورسٹی کے طلبا ملنا چاہتے ہیں۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد وہ باب جبرئیل کے سامنے منتظر تھے۔ ایک قریبی پاکستانی ریستوران میں انہوں نے پُر تکلف ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اُن سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اس عظیم جامعہ میں دنیا بھر کے کم و بیش ڈیڑھ سو ممالک سے آئے چھ ہزار سے زائد طلبا قرآن، حدیث، فقہ، دعوۃ اور عربی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی ہر طالب علم کو آٹھ سو پچاس ریال ماہانہ وظیفہ دیتی ہے۔ اُن کی رہائش کے لیے کئی معیاری اقامت گاہیں بنائی گئی ہیں۔ اُنہیں اعلیٰ کھانے کے لیے صرف تین ریال ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اَسّی فی صد کے لگ بھگ طلبا دوسرے ممالک سے آتے ہیں۔ سالانہ چھٹیوں کے موقع پر ہر بیرونی طالب علم کو اپنے وطن جانے اور واپسی کا ہوائی ٹکٹ یونیورسٹی فراہم کرتی ہے۔ پینتالیس سال قبل جب یونیورسٹی کا چارٹر تیار کیا جا رہا تھا تو پاکستان سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا داؤد غزنوی کو خصوصی طور پر بلوایا گیا تھا۔ معروف عالم دین اور عالمگیر شہرت کے حامل شیخ بن باز یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور یہ اُنہی کی قیادت و سیاوت تھی جس نے مدینہ یونیورسٹی کو عالم اسلام کی ایک عظیم درس گاہ بنا دیا۔ یونیورسٹی بی اے کی سطح کا کورس چار سال، ایم اے کی سطح کا کورس بھی چار سال اور پی ایچ ڈی کی سطح کا کورس پانچ سال میں مکمل کراتی ہے۔

ریستوران میں میرے دائیں بائیں بیٹھے طالبان علم، ادب و احترام کا مرقع تھے۔ سب کے چہرے خوبصورت داڑھیوں سے آراستہ تھے اور سب کے انداز کلام میں وقار تھا۔ یہ نوجوان لاہور، فیصل آباد، تربت، ماموں کانجن، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، قصور، کراچی، ہری پور، پشاور، نوشہرو فیروز، گلگت اور مکران سے تعلق رکھتے تھے لیکن سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

9/11 کے سائے اس یونیورسٹی تک بھی آن پہنچے ہیں۔ برسوں سے دستور تھا کہ یونیورسٹی کے سینئر اساتذہ اور علماء تعطیلات کے دنوں میں دنیا بھر میں پھیل جاتے تھے۔ وہ نگری نگری دینی مدارس اور دیگر اداروں کے طلبا سے ملتے۔ مختصر دورانیے کے کورسز کا اہتمام کرتے اور اس ریاضت کے ذریعے جامعہ کے

لیے علم کی جستجو اور صلاحیت رکھنے والے طلبا کا انتخاب کرتے۔ اب یہ سلسلہ رُک گیا ہے۔ جس کے سبب باہر سے آنے والے طلبا کی تعداد میں کمی آ رہی ہے۔ کبھی پاکستانی طلبا کی تعداد تین سو سے زائد تھی۔ گزشتہ برس یہ کم ہو کر 226 رہ گئی اور اس وقت دو سو سے بھی کم ہے۔ سعودی حکومت مشکلات کے باوجود استقامت کا مظاہرہ کر رہی ہے لیکن امریکہ اسے دنیا بھر میں ''جہادیوں'' کی سب سے بڑی تربیت گاہ سمجھنے لگا ہے۔ پاکستان غالباً اِسی دباؤ کے باعث اپنے ہاں کے طلبا کو اس یونیورسٹی میں داخلے کے لیے این او سی جاری نہیں کر رہا۔

طلبا نے بتایا کہ وہ دس بجے دن ایک تقریب ملاقات کا اہتمام بھی کر چکے ہیں جس میں بھارت سے آئے ہوئے طلبا بھی شریک ہوں گے۔ یہ ایک غیر رسمی سی تقریب تھی جس میں پاکستان اور بھارت کے طلبا کی خاصی تعداد موجود تھی۔ برادرم عبدالمالک مجاہد کے تعارفی کلمات کے بعد مجھے خطاب کے لیے کہا گیا۔ مدینہ یونیورسٹی کے سبزہ زار میں بچوں سے میں کیا کہتا؟ شہرِ رسول ﷺ کی اس عظیم جامعہ کے خوش بخت نوجوانوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے اُن کی علمی لگن کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ ہمیں طاقت ور ملکوں کی افواج سے کوئی خطرہ نہیں۔ شہر اُجڑتے اور بستے رہتے ہیں لیکن اپنے نظریاتی اور تہذیبی قلعوں کی نگہبانی کے لیے ہمیں بے حد چوکس رہنا ہوگا۔ میں نے پُرعزم نوجوانوں سے کہا کہ وہ جدید عصری تقاضوں کا فہم و ادراک حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں کیوں کہ اب جنگ کا میدان دین، نظریے اور تہذیب کی بستیوں میں سجے گا۔

مدینہ یونیورسٹی کے دورے سے طبیعت سرشار ہوگئی۔ لیکن ظہر کی نماز سے قبل ایک اور جادونگری ہماری منتظر تھی۔ اس جادونگری کا نام ''شاہ فہد کمپلیکس برائے طباعت قرآن'' ہے جو مقامی طور پر ''مجمع'' کے نام سے معروف ہے۔ ہر نوع کی غلطی سے پاک اور طباعت کے اعلیٰ ترین معیار سے آراستہ قرآن کریم کی اشاعت اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کی طباعت مجمع کا بنیادی مقصد ہے۔ خادم الحرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز نے 1983ء میں اس کمپلیکس کا سنگِ بنیاد رکھا اور اکتوبر 1984ء میں اس کا افتتاح کیا۔ 250 مربع کلومیٹر پر محیط یہ کمپلیکس واقعی حیرت کدہ ہے جس میں دنیا کا سب سے بڑا طباعتی سسٹم جدید ترین تقاضوں کے ساتھ مصروفِ کار ہے۔ مجمع سب سے زیادہ توجہ قرآن کریم کے متن کی صحت پر دیتا ہے۔ اس کے سترہ سو ملازمین میں سے نو سو کا تعلق صحتِ متن کے شعبے سے ہے۔ اب تک قرآن کریم کے بیس کروڑ اَسّی لاکھ نسخے طبع ہو کر تقسیم ہو چکے ہیں۔ دنیا کی 45 زبانوں میں تراجم شائع ہو رہے ہیں جن میں انگریزی، اُردو، اسپینی، البانی، انڈونیشی، اور رومی، الغیوری، پشتو، براہوی، بنگالی، برمی، تگالو، تامل، ترکی، چینی، تھائی، رولو، صومالی، فارسی، فرانسیسی، تازاقی، کشمیری، کوریائی، مقدونی، مالباری، یونانی، جرمن، پرتگالی، ویت نامی اور متعدد دوسری زبانیں شامل ہیں۔ نامور قراء کی آواز میں تلاوتِ کلام پر مشتمل

کیسٹوں اور سی ڈیز کی تیاری کے لیے جدید ترین مشینری سے مزین ایک یونٹ الگ سے کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد محسن خان کا انگریزی ترجمہ یہی ادارہ شائع کر رہا ہے۔

میں کمپلیکس کے مختلف شعبوں کو دیکھتا اور حیران ہوتا رہا۔ پریس کی وسعت اور کارکردگی کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ وہ ایک گھنٹے میں قرآن کریم کے تین ہزار نسخے چھاپ سکتا ہے۔ جلد بندی کرنے والی مشین ایک گھنٹے میں دو ہزار چار سو نسخوں کو اعلیٰ ترین جلد سے آراستہ کرسکتی ہے۔ نرم گتے یا کاغذی جلد کی صورت میں اس کی کارکردگی چھ ہزار فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس برق رفتاری کے ساتھ یہ اہتمام لازم ہے کہ کسی نسخے میں زیر زبر کی غلطی بھی نہ آئے۔

خادم الحرمین نے اس عظیم کارخیر کے لیے مدینہ منورہ کا انتخاب کیا اور مجھے یقین ہے کہ شاہ فہد کا یہ کارنامہ نہ صرف دیر تک یاد رکھا جائے گا بلکہ اُن کے نامۂ اعمال کا حسن بن کر اُن کی اُخروی نجات کا وسیلہ بھی بنے گا۔

[31-03-2005]

# یارحمٰن، یارحیم

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ''اے اللہ تعالیٰ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت اُسی طرح بھر دے جس طرح مکہ کی محبت ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک سے نکلنے والی ہر دعا کی طرح یہ دعا بھی رب ذوالجلال کی بارگاہ سے قبولیت کی سند لے کر زمانوں اور جہانوں پر محیط ہوگئی۔ مدینہ سے محبت وعقیدت، کسی شعوری کوشش، کسی کاوش اور کسی دانستہ سعی کے بغیر ہی ہر مسلمان کے دل میں خوشبو کی طرح رچ بس گئی ہے۔ میں جب بھی دیارِ حجاز کا ارادہ کرتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے مشکبو الفاظ میرے احساس وفکر کی دہکتی لوح پر ٹھنڈی شبنمی بوندوں کی طرح برسنے لگتے ہیں اور مدینہ ایک آرزو کی طرح دل بن کر دھڑکنے لگتا ہے۔ حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرشکوہ میناروں کے جھرمٹ میں گھرا ایک سبز گنبد خنک چھاؤں کی طرح مجھے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ مدینہ چھوڑتے ہوئے دل دُکھ سے چھلکنے لگتا ہے اور رُوح ہجر کے کرب سے چٹخنے لگتی ہے۔ گزشتہ روز بھی جب عصر کی نماز کے بعد میں نے سنہری جالیوں کے سامنے کھڑے ہو کر اجازت طلب کی تو یوں لگا جیسے صدیوں، سالوں کے لیے اپنے گھر سے دُور جا رہا ہوں اور شاید فراق کی لمبی رات دیر تک سحر نہ ہونے پائے۔

مدینہ منورہ سے ساڑھے سات بجے پرواز کرنے والے طیارے نے مجھے سوا آٹھ بجے کے لگ بھگ جدہ پہنچا دیا۔ ہوائی اڈے کی رُسومات میں کچھ وقت اور لگ گیا۔ جب میں اپنے ہوٹل سے ہوتا ہوا باب عبدالعزیز سے حرم میں داخل ہوا تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ کعبۃ اللہ کے شکوہ نے اب کی بار بھی میرے اعصاب پر کپکپی طاری کر دی۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں یہی کیفیت کم مایئگی، بے چارگی اور تہی دامانی کا احساس بن کر میری نس نس میں سما جاتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے دائیں اور بائیں کندھے پر بیٹھے فرشتے اپنے نورانی پر پھڑپھڑاتے ہوئے کسی بہت بڑی عدالت کو پرواز کر گئے اور بہی کھاتے کھولے کھڑے ہیں۔ میں تصور کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں کہ دائیں ہاتھ والے فرشتے کا کتابچہ چند اوراق پر مشتمل ہے اور وہ شرمایا شرمایا سا نگاہیں جھکائے کھڑا ہے جب کہ بائیں ہاتھ والے فرشتے نے نامور وکیل کی طرح کتابوں سے بھرے بکسے اُٹھا رکھے ہیں۔ اور وہ مقدمہ جیت جانے کے فاتحانہ احساس سے سرشار ہے۔ اس کے بعد تصویر دُھندلانے لگتی ہے اور مجھے مقدمے کی کارروائی اور فیصلے کی گھڑی دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ میرے قدم من من کے ہونے لگتے ہیں اور بار بار ایک ہی احساس میرے قلب و

رُوح کو کچو کے لگا تا چلا جاتا ہے کہ میں کس برتے پر یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے اس کا حوصلہ ہی کیسے ہوا ہے؟ سیاہ ریشمی غلاف میں ملبوس خانہ کعبہ کیا سوچتا ہوگا؟

احرام باندھے ہوئے اللہ کے گھر کا طواف کرنا عجب لذت رکھتا ہے۔ اس عمل کا سب سے دل آویز پہلو یہ ہے کہ عرب وعجم کی ہر بستی سے آئے ہوئے اہل حرم ایک ہی انداز، ایک ہی اُسلوب اور ایک ہی کیفیت میں ایک ہی مرکز کے مدار میں گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب، ایک دوسرے سے بے نیاز، ایک ہی درد، ایک ہی لگن، ایک جنون میں مبتلا ان میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی، جوان بھی اور بچے بھی، عمر رسیدہ بزرگ بھی اور طفلان شیر خوار بھی۔ کچھ ایسے ہیں جن کے سعادت مند بیٹوں نے انہیں وہیل چیئر پر بٹھا رکھا ہے اور کچھ ایسے ہیں جنہیں اُن کے جوان بیٹے کندھوں پر اُٹھائے طواف کر رہے ہیں۔ کچھ احرام میں ہیں، کچھ اپنے قومی لباس میں۔ لیکن قوس قزح کی سی یہ ساری لہریں ایک ہی مرکز ثقل کے گرد گھوم رہی ہیں، سب خدائے وحدہ لاشریک کی کبریائی کا اعلان کر رہے ہیں، اپنی بندگی کا اقرار کر رہے ہیں۔ اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہے ہیں، اپنے پیاروں کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان میں صاحبان دولت بھی ہیں اور ارباب اختیار بھی۔ ان میں وہ بھی ہیں جو نہ جانے کتنے برس ایک حسین خواب کی تعبیر پانے کے لیے پائی پائی جوڑتے رہے۔ لیکن آج سب فقیران بے نوا ہیں، سب نے جھولیاں پھیلا رکھی ہیں، سب کے ہاتھ کاسہ ہائے گدائی بن چکے ہیں۔

یہی کیفیت صفا اور مروہ کی مقدس پہاڑیوں کے درمیان رواں قافلوں کی ہے۔ یہ قافلے جانے کب سے چل رہے ہیں، جانے کب تک چلتے رہیں گے۔ اللہ کو اپنے محبوب بندوں کے بعض عمل کس قدر پسند ہیں کہ انہیں قیامت تک کے لیے نمونہ تقلید بنا دیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے سعی کے دوران حضرت ہاجرہؓ کی یاد نہ آتی ہو، جسے پیاس سے بے حال اسماعیل علیہ السلام کے ایڑیاں رگڑنے کا منظر نہ دکھائی دیتا ہو، جو ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو خانہ کعبہ کی دیواریں اُٹھاتے نہ دیکھتا ہو۔ تاریخ کے یہ اوراق حرم کعبہ کے در و دیوار پر کندہ ہیں اور **لبیك اللھم لبیك** کی صدائیں بلند کرنے والے اہل دل ایک متحرک فلم مسلسل دیکھتے رہتے ہیں۔

ہجوم خاصا تھا لیکن بے پناہ نہ تھا۔ گھنٹے سوا گھنٹے میں عمرہ مکمل ہو گیا اور میں حجر اسود کے عین سامنے والے حصے میں جا بیٹھا۔ میں جب بھی آؤں، کوشش کرتا ہوں کہ یہاں کوئی جگہ مل جائے۔ میں نور میں نہائے دالان اور سیاہ نقاب میں چھپے اللہ کے گھر کو دیکھے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی میری نگاہ خود اپنی طرف بھی اُٹھ جاتی تھی اور میں ڈر کر رہ جاتا تھا۔ ایک عظیم عدالت، مستند گواہوں، ناقابل تردید ریکارڈ اور ماہر وکلا کے تصور سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ رات ڈھل رہی تھی اور پروانوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کعبۃ اللہ کا جلال و شکوہ ایک ہیبت کی طرح مجھ پر طاری ہو رہا تھا۔ شاید میں اِسی کیفیت سے بچنے کے لیے مدینہ چلا

جایا کرتا ہوں۔ وہاں بھی ریاض الجنۃ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر ومحراب اور روضۂ اقدس کے قریب جاتے ہوئے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ وہاں بھی اپنی داغ داغ جبیں کا احساس سر اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامان کرم کی خوشبو، مہربان ماں کی طرح اپنی طرف بلاتی اور بانہوں میں لے لیتی ہے۔ رب کائنات کی بارگاہ جلال کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ یہاں کڑے احتساب کا ڈر اور جزا وسزا کا اٹل تصور سنبھلنے ہی نہیں دیتا۔ خالق اور مخلوق کے رشتے کی نزاکت احساس بندگی سے نیم جاں کر دیتی ہے۔ میں نے یہاں اچھے اچھوں کو شکستگی سے نڈھال پایا۔ میرے پہلو میں بیٹھے بزرگ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور اُن کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ میرا احساس محرومی بڑھتا چلا گیا۔ غیر شعوری طور پر میری نگاہیں ایک بار پھر کعبہ پر جم گئیں جیسے اس کا دروازہ کھلنے اور میرے مقدمے کا فیصلہ سنائے جانے کی گھڑی آن پہنچی ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے حجر اسود کی عین سیدھ میں اُوپر کی طرف دیکھا۔ غلاف کعبہ تبدیل ہو چکا تھا۔ پچھلی مرتبہ حجر اسود کے عین اُوپر کعبہ کی چھت سے ملتے کنارے پر لکھا تھا ''**یا حی یا قیوم**''۔ اب کے حروف زیادہ نمایاں اور جلی نہ تھے۔ میں نے غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔ سنہری ریشم کے تاروں سے رقم تھا ''**یا رحمن و یا رحیم**''

یکا یک میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا اور میری آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔

[02-04-2005]

---

# تو پھر یہ خوف کیوں؟

کبوتر اندرونی برآمدوں، میناروں اور گنبدوں سے باہر حرم کے بیرونی صحنوں میں آ گئے ہیں اور ننھی منی چڑیوں جیسے پرندے پرے باندھے خانہ کعبہ کے اِدھر اُدھر چاروں سمت، اُوپر نیچے پرواز کرتے رہتے ہیں۔ گہرے سیاسی مائل فاختائی رنگ کے ان پرندوں کو لوگ ابابیلیں کہتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ ابابیلیں ہیں یا کیا ہیں لیکن ان کی چونچ سے مسلسل نغمے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اذان کی گونج ہو یا نماز کے دوران امام کعبہ کی دل نشیں قرآت یا **لبیك اللهم لبیك** کی رُوح پرور صدائیں ابابیلیں مسلسل اُڑتی، دائرے اور قوسیں بناتی اور کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہیں۔ ان کے نغموں سے فضا میں ایک خاص طرح کی نرمی، ملائمت اور خنکی سی بھر جاتی ہے جس کے سبب کعبہ کے شکوہ وجلال سے لرزاں اور اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی سے ہراساں زائرین کو بڑی آسودگی ملتی ہے۔ تہجد اور فجر کے وقت ان سحر خیز ابابیلوں کی نغمہ سنجی کمال کو پہنچی ہوتی ہے اور سرِ شام اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ جانے کے بجائے یہ عشاء کی نماز کے بعد بھی دیر تک خانہ کعبہ کے گرد و پیش ڈبکیاں لگاتے، تیرتے، اُوپر کو اُٹھتے اور وجد کے سے عالم میں حمد وثنا کے نغمے الاپتے رہتے ہیں۔

حمد وثنا کے نغمے وہ زائرین حرم بھی الاپ رہے ہیں جو نہ جانے شرق وغرب کی کن کن بستیوں سے جنم جنم کی تشنگی بجھانے یہاں چلے آئے ہیں۔ ہر ایک کی بغل میں دعاؤں کی ایک پوٹلی ہے۔ وہ نماز سے پہلے یا بعد، حرم کے کسی گوشے میں بیٹھ کر یہ پوٹلی کھول لیتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ڈائریوں اور کاغذوں پر اپنے اہل خانہ، عزیزوں، خویش واقربا اور دوستوں کے نام اور اُن کی حاجتوں کے باقاعدہ گوشوارے بنا کر لائے ہیں۔ وہ قاضی الحاجات کے حضور نام بہ نام عرضیاں گزارتے رہتے ہیں...... میں بھی ایسے ہی کرنا چاہتا ہوں لیکن نہیں کر پاتا۔ کوئی شے میرے حافظے کو نچوڑ لیتی ہے۔ مجھے یقین سا ہوتا ہے کہ اللہ کو ہر شے کا علم ہے۔ اُسے میرے دل کے عمیق ترین گوشوں میں چھپی آرزوؤں کی بھی خبر ہے۔ وہ میرے ذمے لگائی گئی عرضیوں اور عرضی گزاروں سے بھی آگاہ ہے۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے ذہن کے پردے پر ایک فلم سی چلنے لگتی ہے اور وہ سارے نام ایک ایک کر کے گزرنے لگتے ہیں جنہوں نے سلام و دعا کی درخواست کی تھی۔ ان میں وہ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو برس ہا برس سے میرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے اور جن سے ہاتھ ملائے زمانے گزر چکے ہوتے ہیں۔

مسجد نبوی ﷺ اور حرم کعبہ میں ایک نام مجھے ہر آن، ہر لمحے یاد رہتا ہے۔ اُس نے کبھی مجھے کوئی سندیسہ دیا نہ کسی دعا کی درخواست کی لیکن میری ہر دعا اُسی سے شروع اور اُسی پر ختم ہوتی ہے۔ اُس کا نام

ہے پاکستان۔ جمعتہ المبارک کے دن میں دہکتی دھوپ میں خانہ کعبہ سے صرف چند گز دُور بیٹھا پاکستان کے نام کی عرضیاں گزارتا رہا۔ ابابیلیں اس وقت بھی اُڑ رہی تھیں اور مطاف سے لبیك اللهم لبيك کی صدائیں اُٹھ رہی تھیں۔ اچانک کسی نے میرے دل کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور کہنے لگا۔ ''کیا تم واقعی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہو؟ کیا تمہیں اُس کے مالک و خالق ہونے کا پختہ یقین ہے؟ کیا تم سچے دل سے اُس کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہو؟ کیا تمہارا سر واقعی صرف اُسی کی دہلیز پر جھکتا ہے؟'' میرے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ سا آ گیا۔ لیکن میں نے حوصلہ مند لہجے میں کہا ''ہاں! میں تو ہر نماز میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اللہ! میں صرف تیری ہی عبادت کرتا اور صرف تجھی سے مدد مانگتا ہوں۔'' ایک ابابیل نے غوطہ لگایا اور میرے سر کے بالکل قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دستک دینے والے کو میرے جواب پر یقین نہ آیا۔ وہ بولا ''صرف اللہ کی عبادت کرنے اور صرف اُسی سے مدد مانگنے والے خوف نہیں کھایا کرتے۔'' میں چپ ہو گیا اور خانہ کعبہ پر نظریں جمائے اپنے آپ سے پوچھنے لگا۔ ''کیا میں خوف زدہ ہوں؟ کیا میں اللہ کو مالک و خالق ماننے کے باوجود، اُس کی نصرت پر پختہ ایمان رکھنے کے باوجود، چھوٹے چھوٹے مصنوعی خداؤں سے ڈر رہا ہوں؟ کیا لااله الا الله کہنے کے باوجود میں نے اپنے ذہن وقلب کی کارنس پر چھوٹے چھوٹے بت سجا رکھے ہیں؟ کیا رب کعبہ کے حضور میرا سجدہ بس رسمی نوعیت کا ہے اور درحقیقت میری جبین نیاز میں کسی اور کی چوکھٹ کے لیے ہزاروں سجدے مچلتے رہتے ہیں؟''

مجھے یوں لگا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔ نماز جمعہ سے فارغ ہوتے ہی میں چپکے سے اُٹھا اور اپنے ہوٹل کے کمرے میں آ گیا۔ علامہ اقبال کی ''اسرارِ خودی و رُموزِ بے خودی'' کا نسخہ اکثر میرے بریف کیس میں رہتا ہے۔ اپنے آپ کو بہلانے کے لیے میں نے کتاب کھولی تو اُس آدمی کی حکایت پر نظر پڑی جسے میری ہی طرح خوف کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور جس نے سید مخدوم علی ہجویری کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی تھی ''اے آسمانوں کی رفعتوں پر بسنے والے مرد بزرگ! مجھے دشمنوں کے درمیان زندہ رہنے کا ہنر سکھا کہ میں اُن کی صفوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میرے چار سو پتھر ہی پتھر ہیں اور میں شیشے کی مانند ہوں۔'' داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ''تم شاید راہ و رسم زندگی سے واقف نہیں۔ اس کے آغاز و انجام کی حکمت کو نہیں سمجھتے۔ دشمنوں کا خوف دل سے نکال دو اور اس طاقت کا شعور حاصل کرو جو تمہارے اندر چھپی ہوئی ہے۔ پتھر جب اپنے آپ کو شیشہ سمجھنے لگے تو جانو وہ واقعی شیشہ بن گیا اور چور چور ہو گیا۔ خودی کے راز اور درجات بلند سے آگاہ شخص، طاقت ور دشمن کو اللہ کا فضل خیال کرتا ہے کیوں کہ اس سے اس کے فکر و احساس کی کھیتی لہلہا اُٹھتی ہے۔ اس کی خفیہ صلاحیتیں جاگنے لگتی ہیں اور کئی ممکنات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر آدمی صاحبِ ہمت ہو تو راستے کی رُکاوٹیں پانی کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ زندگی محض کھانے پینے اور آرام کرنے کا نام نہیں۔ اگر تیرے اندر قوت و توانائی کا احساس نہیں تو ایسی

زندگی سے کیا حاصل؟''

میں نے ''اسرارِ خودی'' کا نسخہ میز پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ ساری بارگاہیں میری نگاہوں میں گھوم گئیں جن کے طواف کو میں نے ذریعہ نجات بنا رکھا ہے، وہ سارے بُت میرے سامنے آ کھڑے ہوئے جن کی چوکھٹ کو میں نے سجدہ گاہ بنا رکھا ہے، وہ سارے ''خدا'' مجھے یاد آنے لگے میں جن کی بندگی کرتا اور جن سے مدد مانگتا ہوں، وہ سارے فرعون مجھے یاد آنے لگے جن کے خوف نے مجھے شیشہ بنا دیا ہے اور جن کی ہیبت سے میں ہر آن ہر لمحے چور چور ہوتا رہتا ہوں۔

جانے کب میری آنکھ لگی اور میں کتنی دیر سویا کہ حرم سے **اللہ اکبر اللہ اکبر** کی صدا گونجی۔ میں جلدی جلدی وضو کر کے حرم کی طرف لپکا لیکن یہ سوال ابھی تک نشتر چلا رہا تھا کہ کیا میں واقعی ''اللہ اکبر'' پر ایمان رکھتا ہوں؟ اگر رکھتا ہوں تو میرے دل میں اندیشوں، واہموں، وسوسوں اور خوف نے کیوں ٹھکانے بنا لیے ہیں اور میں پتھروں کی دنیا میں شیشہ کیوں بن گیا ہوں؟ اور اگر ''اللہ اکبر'' کی صدا پر حرم کی طرف دوڑے چلے جانے کے باوجود میرے دل و نگاہ مسلمان نہیں تو پھر صحن حرم کے سجدوں، خانہ کعبہ کے طواف اور صفا و مروہ کی سعی سے مجھے کیا حاصل ہوگا؟ حجر اسود کو بوسہ دینے، خانہ کعبہ کے اندر جا کر نوافل پڑھنے یا اس کی چھت پر چڑھ جانے کے باوجود مجھے کیا ملے گا؟

لاہور میں آسودۂ خاک مردِ قلندر کی آواز آئی

تا عصائے لاالٰہ داری بدست
ہر طلسم خوفِ را خواہی شکست
خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

(جب تک تو لاالٰہ کا عصا اپنے ہاتھ میں تھامے رہے گا، خوف کے ہر طلسم کو بآسانی توڑ سکے گا۔ ایسے شخص کے سینے میں کبھی خوف سا ہی نہیں سکتا اور اس کا دل کسی غیر اللہ سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا۔)

[03-04-2005]

# نہ رشتہ و پیوند

مکہ اور مدینہ ازل سے ابد تک محیط، مکان و لامکان کی وسعتوں پہ حاوی دو دائمی حقیقتوں کے روشن استعارے ہیں۔ توحید اور رسالت کے بنیادی عقائد کو پختہ تر کرنے اور انسان کے قلب و رُوح کا سارا زنگ اُتار پھینکنے والی یہ دو بستیاں حرم کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ کو اپنی آغوش میں لیے بیٹھی ہیں اور دنیا بھر کے مسلمان دیوانہ واران کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ذوق وشوق کا ایک کارواں ہے کہ چودہ سو سال سے مسلسل سفر میں ہے۔ لاکھوں مسافران نورانی بستیوں میں آتے، دو چار دن گزار کر واپس چلے جاتے ہیں لیکن حرمین کا دامن ہمیشہ بھرا رہتا ہے۔ مسافروں کے قافلے پیہم اُترتے رہتے ہیں اور سرائیں ہمیشہ بھری رہتی ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ جانے کن کن بستیوں سے آئے اور پھر عشق و مستی کی طلائی زنجیروں نے انہیں اس طرح جکڑ دیا کہ وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اب پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہوئے بھی انہیں یہ خوف سا رہتا ہے کہ کہیں کعبہ نگاہوں سے اُوجھل نہ ہو جائے، کہیں گنبد کے جلوے پس منظر میں نہ چلے جائیں۔ اپنی بستیوں کو دُور چھوڑ آنے، عزیز و اقارب سے سارے رشتے توڑ لینے اور مکہ مدینہ کے ہو کر رہ جانے والے یہ لوگ عجب بے نیاز سے لوگ ہیں۔ انہیں تلاش کرنا ذرا مشکل ہے لیکن اگر کوئی میسر آ جائے اور وہ گئے دنوں کی باتیں سنانے پر آمادہ بھی ہو جائے تو طلسم ہوش رُبا کے معطر باب کھلتے چلے جاتے ہیں اور سننے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ محبت میں کیسا جادو ہے اور جب یہ محبت مکہ اور مدینہ کے جھروکوں سے جنم لے تو اس کی سرشاریاں گوشت پوست کے عام سے انسان کو کیسی کیسی رفعتوں تک پہنچا دیتی ہیں اور اُسے کتنا غنی، کتنا آسودہ اور کس قدر بے نیاز کر دیتی ہیں۔

اب کی بار مجھے ایسے لوگوں کی تلاش رہی جو زندہ ہیں لیکن گم ہو چکے ہیں اور جو گم ہو چکے ہیں لیکن اتنا کچھ پا گئے ہیں کہ بھاری خزانوں کے عوض بھی خریدا نہیں جا سکتا۔ کسی کے پاس بہت سا وقت ہو اور وہ کئی دن مکہ مدینہ ٹھہر سکے تو اُسے عشق و مستی کے ان پیکروں کو تلاش کرنا چاہیے۔ ان کے معطر تذکروں کو مرتب کرنا چاہیے۔ ان کی کہانیوں کو ہم جیسوں کے سامنے لانا چاہیے جو دنیا کی گھمن گھیریوں میں غوطے کھا رہے ہیں اور جو کلائی پر بندھی گھڑی کی ٹک ٹک سے بندھے بے آب و رنگ معمولات کا رزق ہو گئے ہیں۔

میرے مکہ پہنچنے سے قبل بابا مجید کو خبر ہو گئی تھی کہ میں آ رہا ہوں اور وہ ہوٹل کے مالک سے دو دفعہ میرے بارے میں پوچھ چکا تھا۔ عمرہ سے فراغت کے بعد جب میں فیصل آباد کے ایک نہایت ہی نیک

اور پاکیزہ خو نوجوان نعیم شہزاد کے ہمراہ کھانا کھانے گیا تو اُس کے مالک نے بابا مجید کے انتظار کا تذکرہ کیا۔ اگلے دن عشاء کی نماز کے بعد ہم دونوں ہوٹل گئے تو بابا مجید موجود تھا لیکن اُسے ہماری آمد کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ وہ گرمی کے اس موسم میں بھی پتا نہیں کتنی گدڑیاں پہنے، ایک دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں بریانی والا پیکٹ تھا جو مفت تقسیم ہوتا ہے اور وہ گردوپیش سے قطعی لاتعلق تھا۔ اُس کے آس پاس بیسیوں بلیاں پائلیں ڈال رہی تھیں، اُچھل پھاند کر رہی تھیں اور وہ نوالے بنا بنا کر انہیں چاول کھلا رہا تھا۔ ہوٹل والے نے بیرونی صحن میں ایک قالین ڈال کر تکیے لگا دیئے اور میں وہاں بیٹھ کر بابا مجید کو دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی وہ جابر اور موٹی تازہ بلیوں کو جھڑک کر کمزور اور ناتواں بلیوں کو قریب بلا لیتا۔ پھر اُس نے گدڑی کی کسی جیب سے کوکا کولا کا ٹن نکالا جو بریانی کے ساتھ ہی مفت دیا جاتا ہے اور اُسے کھول کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ ایک دو بار اُس نے چاولوں کے نوالے بنا کر اُن پر کوکا کولا کا تھوڑا سا چھڑکاؤ کیا اور بلیوں کو کھلا دیا۔ خاصی دیر بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں اُسے ملنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور وہ ہاتھ دھونے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو ڈھیروں محبت کے ساتھ بغل گیر ہوگیا۔ میں نے اُسے قالین پر اپنے قریب بٹھا لیا اور کہا ''میرے لیے دعا کرتے ہو کہ نہیں۔'' اُس نے اپنے پوپلے منہ سے بولنے کی کوشش کی۔

بابا مجید سے محفل آرائی، تذکروں اور تفصیلات میں سما نہیں سکتی۔ لیکن اس مرتبہ مجھے نعیم شہزاد کسی اور سے بھی ملوانا چاہتا تھا۔ ہوٹل واپس آتے ہوئے میں نے اُسے کہا ''نعیم اُسے تلاش کرو۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں اپنے ایک دکان دار دوست سے کہہ کر آتا ہوں۔ وہ اُسے ڈھونڈھ نکالے گا۔ میں کپڑے بدل کر بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ نعیم واپس آ گیا اور وہ اُس کے ساتھ تھا۔

قیامِ پاکستان سے اٹھارہ، بیس سال قبل باغ (آزاد کشمیر) کے ایک گاؤں چھتر نمبر ایک میں نعمانہ خان کے ہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اُس کا نام شیر احمد رکھا گیا۔ جوان ہو کر شیر احمد اُن حریت کیش نوجوانوں کے جتھے میں شامل ہو گیا جو ڈوگرہ راج کے خلاف لڑ رہے تھے۔ بارہ مولا کے قریب ایک جھڑپ کے دوران شیر احمد گرفتار ہو گیا۔ اُسے کئی زخم آئے تھے۔ پھر ہندو فوجیوں نے اُس کے دونوں ہاتھ اُنگلیوں کی جڑوں سے کاٹ دیئے اور چھوڑ دیا۔ اُس کے ساتھی اُسے باغ اور پھر لاہور لے آئے۔ کئی ماہ علاج ہوتا رہا۔ وہ زخموں سے تو جانبر ہو گیا لیکن دونوں ہاتھوں سے مستقلاً محروم رہا۔ اُنہی دنوں اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اُسے کہیں دُور نکل جانا چاہیے۔ اُس کے تین چار اور ساتھی بھی اُس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ فیصلہ ہوا کہ دیارِ حجاز چلتے ہیں۔ قافلہ چل پڑا۔ پاکستان بن رہا تھا کہ شیر احمد کسی کو بتائے بغیر دُور نکل گیا۔ اُس کے پاس نہ زادِ راہ تھا نہ کرائے کی رقم۔ بس ایک لگن تھی۔ وہ پاپیادہ نگری نگری کی خاک چھانتا چلتا رہا۔ جانے کہاں کہاں گیا۔ کہاں کہاں ٹھہرا۔ بصرہ، بغداد، عمان، فلسطین، مصر، سوڈان، یمن۔ وہ کہیں

مزدوری کرتا۔ کبھی اُسے کوئی سواری مل جاتی ورنہ وہ پا پیادہ رواں دواں رہتا۔

نعمانہ خان کا بیٹا شیر احمد اب ''بابا شیرا'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ سفید چہرہ، سفید گھنی لمبی داڑھی۔ کہانی بیان کرتے کرتے جب وہ مدینہ پہنچا تو اُس کی آنکھوں میں کتنے ہی ستارے جھلملانے لگے۔ ''میں مانی قلعہ سے پیدل چلتا ہوا مدینہ پہنچا۔ بارہ تیرہ دن وہاں رہا۔ پھر وہاں سے پیدل مکے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ تب ایک چھوٹی سی کچی سڑک مدینہ اور مکہ کو ملاتی تھی۔ راستے میں مجھے ڈاک لانے والی گاڑی مل گئی۔ اُس نے پانچ ریال میں مجھے مکہ پہنچا دیا اور پھر میں یہیں کا ہو کے رہ گیا۔ تب چھوٹا سا حرم تھا۔ وہاں سامنے اُونٹ ذبح ہوتے تھے۔ کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ جب بھی دل کرتا میں پیدل ہی مدینہ شریف نکل جاتا۔ پانچ چھ دن میں مدینہ پہنچ جاتا تھا۔ کچھ دن حضور ﷺ کے قدموں میں گزار کر اسی طرح پا پیادہ واپس آ جاتا۔ اب تو ساری دنیا ہی بدل گئی۔''

''بابا کبھی پاکستان جانے کا خیال نہیں آیا۔''

''پاکستان میں کیا جانا ہے۔ اللہ نے میرے نصیب میں حرم لکھ دیا ہے۔ والد میری نوعمری میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ والدہ بھی نہیں رہیں۔ اب 80 سال کی عمر میں، میں حرم چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ بس آخری وقت ہے۔ کسی دن یہاں کی مٹی اوڑھ کر سو جاؤں گا۔ پچپن سال سے نہیں گیا تو اب جا کر کیا کروں گا؟''

اُس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے اور وہ دو ٹنڈ منڈ بازوؤں کو اپنی آغوش میں لیے بیٹھا تھا اور میں اُس کے نورانی چہرے کو دیکھے جا رہا تھا جس پر عشق کی سدا بہار چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور جو 55 سالوں سے حرم کی آغوش میں بیٹھا ہے اور جو مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند کو وہم وگماں سمجھ کر **لاالہ الا اللہ** کی تفسیر بن گیا ہے۔

مجھے ایک بے تکا سا خیال آیا کہ مظفر آباد سری نگر بس سروس کا افتتاح اس دست بریدہ بوڑھے سے کروانا چاہیے تھا۔

[04-04-2005]

# گنگا سے زم زم تک

آج سرزمین حجاز سے رُخصت ہونے کا دن ہے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی نگری ہو جو اس طرح انسان کو زنجیریں ڈال لیتی ہو اور اپنے گھر کو جانے والا مسافر بھی اپنے پیاروں کی طرف لوٹ جانے کی خوشی کے باوجود کسی سے بچھڑ جانے، کچھ کھو بیٹھنے کے احساس سے گھلا جا رہا ہو۔ اس خیال کا نشتر مسلسل دل پر چلتا رہتا ہے کہ جانے اب نور بھری اس بستی کی طرف آنا نصیب ہوگا یا نہیں؟ میں اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کچھ ایسی ہی شکستگی سے نڈھال تھا اور میرے تصور کی آنکھیں کبھی حرم کعبہ کے بلند و بالا میناروں اور کبھی سبز رنگ کے ایک گنبد کی طرف پلٹ جاتیں۔ کبھی میں سیاہ غلاف میں لپٹے بیت اللہ کا طواف کرنے لگتا اور کبھی روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنہری جالیوں کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ پھر میرے دل نے تسلی دی کہ زندگی رہی تو فقیروں کے پھیرے جاری رہیں گے اور قلب ونظر کی آسودگی کا سامان ہوتا رہے گا۔ مدینہ بھی کبھی دُور ہوا ہے اور رب کعبہ تو رحمان و رحیم ہے ہی!

مکہ مدینہ کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر میں اُس شخص کا تذکرہ نہ کر سکا جو مدینہ ہی کی نورانی بستی کے ایک گوشے میں خیمہ زن ہے اور جس نے زندگی کے ہر لمحے کو ایک مشن کا درجہ دے رکھا ہے۔ اُس کی کہانی باسٹھ سال پہلے سے شروع ہوتی ہے جب اُس نے 1943ء میں اعظم گڑھ (بھارت) کے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا۔ اُس کا والد ایک سرکردہ برہمن اور آسودہ حال کاروباری شخص تھا جس کا کاروبار اعظم گڑھ سے کلکتہ تک پھیلا ہوا تھا۔ بچے کو وہ ساری آسائشیں ملیں جن کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اُس نے شبلی کالج اعظم گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا اور کالج میں داخل ہو گیا۔ اُس کی تربیت خالص ہندو ماحول میں ہو رہی تھی اور برہمن خاندان کا سپوت ہونے کے باعث اسلام کے بارے میں ایک خاص فکر اُس کے دل و دماغ میں راسخ کی جا رہی تھی لیکن اُس کے دل میں کوئی بے نام سی خلش رہنے لگی تھی اور جوانی کی نیند بے کل ہونے لگی تھی۔ اُس کی سوچ میں کوئی ننھا منا سا بیج پھوٹ رہا تھا اور نوجوان برہمن زادے کا دل تلاش اور جستجو کی آنچ میں سلگنے لگا تھا۔

جستجو کے اس سفر میں سید مودودی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''دین حق'' کا ہندی ترجمہ اُس کے ہاتھ لگا۔ وہ گھر والوں سے چھپ چھپ کر اُسے پڑھنے لگا۔ ایک بار، دو بار، بار بار اور پھر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے تاریکی کے بطن سے روشنی کی ایک لکیر سی پھوٹ رہی ہے اور اُس کے دل کی دہکتی لوح پر شبنم سی گرنے لگی ہو۔ اُس نے سید مودودی کی وہ تمام کتابیں پڑھ ڈالیں جو ہندی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ سید

مودودی کی فکر سے متاثر کالج کے ایک مسلم اُستاد کو روشنی کی تلاش میں مگن ہونہار طالب علم کے بارے میں علم ہوا تو اُس نے اُس کی بھر پور سرپرستی کی۔ برہمن خاندان کا متجسس نوجوان، مسلم اُستاد کے درسِ قرآن میں جانے لگا۔ اب اُس کی عمر سترہ سال ہو چکی تھی اور تیرگی میں پھوٹنے والی روشنی کی لکیر گہری ہونے لگی تھی۔ ایک رات وہ معمول کے مطابق اپنے بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند کہیں دُور نکل گئی اور وہ شب بھر بے کلی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ گھر والے اُس کی بدلی ہوئی کیفیت کو نوجوانی کے ہیجان سے تعبیر کرتے رہے اور وہ کسی شیریں چشمے کی تلاش میں صحرا کی دہکتی ریت پر ننگے پاؤں چلتا رہا۔

یہ 1960ء کی ایک صبح خوش جمال تھی جو اعظم گڑھ کے اُس برہمن زادے کے صحنِ دل میں اُتری اور اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ کچھ دن تو اُس نے اپنے گھر والوں کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔

ماں باپ نے جانا کہ اُس پر کسی جن بھوت کا سایہ ہو گیا ہے۔ پنڈتوں اور پروہتوں نے اُسے گھیر لیا۔ اُس کے سامنے اسلام کی بے حد مکروہ اور گھناؤنی تصویر پیش کی جانے لگی۔ ماں باپ نے دباؤ ڈالنے کے لیے مرن بھرت رکھ لیا۔ یلغار بڑھی تو سترہ سالہ نوجوان نے کھلے بندوں اعلان کر دیا کہ ہاں میں مسلمان ہوں اور تم کتنے ہی ستم آزما لو میں مسلمان رہوں گا۔

رمضان کے مہینے میں اُس نے اپنا گھر چھوڑا اور صعوبتوں کے ایک لمبے سفر پر نکل گیا۔ کوچہ بہ کوچہ شہر بہ شہر۔ مسلمان اُسے پناہ دیتے، اُس کا تحفظ کرتے رہے۔ وہ رام پور پہنچا۔ وہاں سے بدایوں چلا گیا جہاں ڈیڑھ سال تک ایک دینی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے نکلا تو مدراس جا پہنچا اور چار سال تک ایک مشہور دینی درس گاہ ''دارالسلام'' سے کسبِ فیض کرتا رہا۔ 1966ء میں مدینہ منورہ کی معطر ہوا کا کوئی جھونکا مدراس کی طرف سے گزرا اور اُسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اُسے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (مدینہ یونیورسٹی) میں داخلہ مل گیا۔ چار سال میں اُس نے گریجوایشن کر لی۔ پھر ایم اے کے لیے جامعۃ الملک عبد العزیز (جامعہ اُم القریٰ۔ مکہ معظّمہ) میں داخلہ لے لیا اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت احادیث مبارکہ پر معتبر تحقیقی کام کیا۔ ایم اے کے بعد جامعہ ازہر قاہرہ سے پی ایچ ڈی کیا۔ اُن کے مقالے کا موضوع حضور رسالت مآب ﷺ کے فیصلے تھا۔ یہ عظیم اور قابل قدر مقالہ ''قضیۃ رسول اللہ ﷺ'' کے نام سے عربی میں شائع ہوا جس کے اُردو سمیت متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے۔

ظلمات سے نور کی طرف سفر کرنے والے اس شخص کو دنیا ڈاکٹر محمد ضیاالرحمٰن اعظمی کے نام سے جانتی ہے اور اعظم گڑھ کے برہمن خاندان کا بیٹا بہت دُور رہ گیا ہے۔ برادرم عبدالمالک مجاہد نے بتایا کہ دوپہر کا کھانا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہے تو میں نہال سا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا نام میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن اُن سے ہاتھ ملانے، اُن سے ہم کلام ہونے کی سعادت کچھ کم نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا کمرہ ہزاروں

کتابوں سے سجا ہے۔ اُن کی میز پر بھی کتابیں، قلم اور اوراق بکھرے پڑے ہیں۔ ایک کونے میں کمپیوٹر آراستہ ہے۔فوٹو سٹیٹ مشین نصب ہے اور وہ اپنی دنیا بدل دینے والی روشنی کو عام کرنے کے مشن میں مصروف ہیں۔ اعظم گڑھ کے آسودہ حال برہمن نے کب سوچا ہوگا کہ اُس کا بیٹا ایک دن اسلام کا نامور مبلغ، مفکر اور مصنف بنے گا۔ وہ رابطہ عالم اسلامی کا ایک اہم رُکن بنے گا۔ وہ برسوں مدینہ یونیورسٹی میں کلیہ حدیث کا پروفیسر اور ڈین رہے گا اور عربی زبان میں اس کی بیسیوں تصانیف دینی درس گاہوں کے نصاب کا حصہ بنیں گی۔

ڈاکٹر صاحب کی ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل وہ ایک ہندی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری میں مصروف ہیں جس میں اسلام کی پانچ سو معروف اصطلاحات اور موضوعات کی وضاحت کی جائے گی۔ صحیح احادیث مبارکہ کے انتخاب کا ایک بہت بڑا منصوبہ بھی ڈاکٹر صاحب کی جاری مصروفیات کا حصہ ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ احادیث کی کم و بیش ایک سو کتب اور دوسرے ماخذوں میں ایسی احادیث رسول ﷺ موجود ہیں جو صحیح احادیث کے معیار پر سو فی صد پورا اُترتی ہیں لیکن انہیں مرتب نہیں کیا جا سکا۔ انہوں نے مجھے اپنی جستی الماری کا قفل کھول کر اب تک کیے گئے کام کا مسودہ دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب ایسی احادیث کی تعداد کم و بیش پندرہ ہزار بتاتے ہیں جنہیں مرتب کرنے کے لیے پندرہ جلدیں تیار کرنا ہوں گی اور ان کے لیے پندرہ سال درکار ہوں گے۔ تین سال سے کام جاری ہے۔ پھر انہوں نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا'' ۔ دُعا کیجئے ! اللہ بارہ سال اور عطا فرما دے کہ میں یہ کام مکمل کر سکوں۔'' وہ ''گنگا سے زمزم تک'' کے نام سے آپ بیتی بھی لکھنا چاہتے ہیں لیکن اسے اہم ترجیحات میں نہیں گنتے۔

برسوں بعد جب حالات نے اپنا رُخ بنا لیا تو محمد ضیا الرحمٰن نے اپنے ماں باپ سے رابطہ کیا اور اُن کی ایسی خدمت کی کہ اعظم گڑھ کے گھر گھر میں کہانیاں کہی جانے لگیں۔ اب وہ دونوں دنیا میں نہیں رہے اور محمد ضیا الرحمٰن اعظمی کو مدینہ منورہ کی آغوش رحمت نے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ہے۔ مکہ مدینہ سے رُخصت ہوتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ خالقِ ارض و سما کے صوابدیدی اختیارات کس قدر لامحدود ہیں اور وہ اپنے نبی ﷺ کی تعلیمات پھیلانے کے لیے کہاں کہاں سے صاحبانِ جنوں چُن لیتا ہے۔

[05-04-2005]

# دیارِ نور

وہ لمحہ شاید میرے نفس نفس میں ایک مستجاب دعا کی طرح بس گیا تھا جس لمحے میں نے ''مدینہ دُور ہے'' والا کالم لکھا تھا۔ وہ کالم پاکستان اور اُمت مسلمہ کو درپیش مسائل کے تناظر میں ایک ایسے کرب کی بے ساختہ پکار تھا جو ہر حساس مسلمان کے سینے میں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ مدینہ جانے اور سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حالِ دلِ زار کہنے اور غبار ہلکا کرنے کی آرزو اور اپنی کم مائیگی، احساس محرومی کی اس فریاد میں ڈھل گئی تھی کہ ''مدینہ دُور ہے۔'' لیکن وہ دن اور آج کا دن، مدینہ میرے آس پاس رہتا، میرے دل میں دھڑکتا، میری سانسوں میں مہکتا اور میری سوچوں میں لو دیتا رہتا ہے۔ جب کبھی دل بوجھل ہو جاتا اور دم گھٹنے لگتا ہے تو باب رحمت کھل جاتا ہے۔ اللہ رحیم و کریم کی کرم فرمائیوں کا کوئی لطیف جھونکا، میری اُنگلی پکڑ کر مکہ مدینہ لے جاتا ہے۔ عجب اسرار ہے کہ دل بھرتا نہیں اور ان مشکبو گلیوں سے نکلتے ہی دوبارہ اُن میں پلٹ جانے کی آرزو انگڑائی لینے لگتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے کردار اور عمل کی دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آتا۔ ہمارے فکر و خیال کے سانچے تبدیل نہیں ہوتے، ہمارے دلوں پہ لگا زنگ نہیں اُترتا اور ہمارے ذہنوں پر تنے جالے بدستور تنے رہتے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود مکہ مدینہ کی آرزو مچلتی رہتی اور ان مقدس بستیوں کو جاتی راہوں کو حسرت سے دیکھتی رہتی ہے۔

میں اور میری اہلیہ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ میں اس معاملے میں قناعت شعار ہوں۔ کئی سالوں سے ایک بار پھر حج پر جانے کی کوئی شعوری پیش رفت نہیں کی۔ گزشتہ آٹھ برس سے حج پر جانے کے لیے کوئی درخواست نہیں گزاری۔ لیکن میری اہلیہ کی آرزو کا چراغ کبھی مدہم نہیں پڑا۔ وہ جب بھی کہتیں، میں طرح دے جاتا۔ برادرم اعجاز الحق سے دوستانہ رفاقت کو اب دو عشرے ہونے کو ہیں۔ ایک دن اُن کے دفتر میں گپ شپ کے دوران، برادر عزیز میجر عامر کی موجودگی میں، میں نے از راہ تفنن کہا ''اعجاز صاحب! جب تک آپ وزیر مذہبی اُمور ہیں، میں حج پر نہیں جاؤں گا۔'' میں اس فریضے کی تکمیل کر چکا تھا اور اس جملے کا مقصد صرف چھیڑ چھاڑ تھا۔ میرے ذہن کے کسی بعید گوشے میں یہ خیال بھی تھا کہ چاہے میں ضابطے کی تمام ترسمی کارروائیوں کی تکمیل کے بعد حج پر جاؤں اسے برادرم اعجاز الحق کی دوستانہ نوازش سے تعبیر کیا جائے گا۔ میری بیگم نے اس پر احتجاج کیا تھا لیکن میرا دل رواروی میں کہے گئے اس جملے پر خواہ مخواہ جم سا گیا۔ سو حج پر جانے کے خیال کا بیج تک نہ پھوٹا اور نہ ہی گھر میں کوئی اس نوع کا تذکرہ ہوا۔

یہ کوئی پانچ سات دن پہلے کا ذکر ہے۔ میں دوستوں کے ہمراہ شادی کی ایک تقریب میں جا رہا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے خالص پاکستانی لہجے میں کہا:

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' میں نے آواز نہ پہچانتے ہوئے اُسی لہجے میں کہا۔

''کیا حال ہے؟''

''اللہ کا کرم ہے۔''

اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک گھنٹی سی بجی۔ ''کیا حال ہے؟'' کے سہ لفظی مرکب کی ادائیگی کے ساتھ ہی میں پہچان گیا کہ یہ سعودی عرب کے سفیر عزت مآب علی عصیری کی آواز ہے۔ باقی کا مکالمہ انگریزی میں تھا۔ میں نے عرض کیا ''عالی مرتبت! میں آپ کی آواز ایک ہزار آوازوں میں بھی پہچان سکتا ہوں۔'' ایک قہقہہ گونجا۔ چند رسمی جملوں کے بعد سفیر محترم نے مجھے وہ خبر دی جسے سن کر مجھ جیسے سیہ کاروں کے بدن میں بھی جھرجھری سی آ جاتی اور سنگلاخ چٹانوں سے بھی جھرنے پھوٹ نکلتے ہیں۔

اگلے دن ایک کارندہ گھر سے ہمارے پاسپورٹ لے گیا۔ تمام تر کارروائی عزت مآب سفیر کی زیرنگرانی سعودی سفارت خانے میں سرانجام پائی۔ یہ ایک دل کشا اور دل پذیر داستان ہے۔ یہ سعادت دوہری خوشی کا باعث تھی کہ ہمیں براہ راست وہاں سے بلایا جا رہا ہے جہاں دنیا کی مقدس ترین بستیاں آباد ہیں۔ کم از کم میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا یوں یکایک سوکھی دھرتی پر مینہ برسنے لگے گا۔

میں نے سب سے پہلے اپنی علیل والدہ ماجدہ سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے اپنے ایک خوبصورت خواب کا حوالہ دیتے ہوئے اجازت مرحمت فرما دی۔ اب تک کے پروگرام کے مطابق آج (6 جنوری) شام 6 بجے انشاء اللہ العزیز میں، میری اہلیہ اور میری بیٹی سعودی ایئرلائنز کی پرواز سے جدہ روانہ ہو جائیں گے۔ تمام تر تیاری اور سارے مراحل کی تکمیل کے باوجود آنے والے ایک ایک لمحے کی ڈور قادرِ مطلق کی مرضی و منشاء سے بندھی ہے اور اگر اُسے منظور ہے تو کل کی صبح دیارِ نور میں ہوگی۔

پیش نظر پروگرام مختصر دورانیے کا ہے۔ انشاء اللہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد 13 جنوری کو مدینہ منورہ روانگی کا ارادہ ہے۔ مدینہ کا تصور آتے ہی دل کے ریگستان میں نم آور سی مشکبو ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ مکہ معظّمہ میں خانہ کعبہ کی جلالت و جبروت کے سائے تلے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور استغفار کرتے ہوئے بدن کا ایک ایک مسام خوف سے سلگتا رہتا ہے لیکن دربارِ مدینہ کی کیفیات میں عجب جادو بھرا ہے۔ اپنی تر دامنی کا احساس بے پناہ ندامت میں ڈھل جاتا ہے اور روضے کی جالیوں کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہوئے آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگتی ہیں۔ علامہ اقبال نے عشق میں ڈوبی کیا خوبصورت التجا

کی تھی۔

گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

''اے رب عظیم! اگر تو میرا نامۂ اعمال دیکھنا ضروری خیال کرتا ہے تو ازراہِ کرم اُسے محمد مصطفیٰ ﷺ کی چشم مبارک سے چھپا کر رکھنا۔''

16 جنوری کو مدینہ منورہ سے جدہ اور 19 جنوری کو انشاء اللہ جدہ سے پاکستان واپسی ہوگی۔

میں نے 2002ء میں دورہ امریکہ کے دوران چند دنوں کے سوا کبھی کالم کا ناغہ نہیں کیا لیکن ایام حج کی ریاضت و مشقت کے دوران اس روایت کو قائم رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ سو میں قارئین سے تقریباً دو ہفتوں کی رُخصت کا خواست گار ہوں۔ اگر حسب پروگرام دیار حجاز کو روانگی ہو جاتی ہے تو کل سے اس رُخصت کا آغاز ہوگا۔

حج کے سفر سعید پر روانہ ہونے والوں سے ہر کوئی دعا کی درخواست کرتا اور اُن کے ہاتھ روضۂ رسول ﷺ پر سلامِ نیاز کی سوغات بھیجتا ہے لیکن مشقت و ریاضت سے بھرے اس سفر کا ایک ایک مرحلہ سخت جانی، استقامت اور صبر و تحمل کا تقاضا کرتا ہے سو آپ سے التماس ہے کہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ہمارے لیے صحت و تندرستی اور آسانی و فراخی کی دعا مانگتے رہیں۔ انشاء اللہ وطن اور اہل وطن ہماری دعاؤں میں رہیں گے۔

[07-01-2006]

---

# حج کی باتیں(1)

حج ایک اہم رُکن اسلام اور فریضہ دین سہی لیکن دنیا بھر میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے یہ مقدس جذبوں کی مٹھاس میں گندھا اور عقیدت کی خوشبوؤں میں بسا ایک ایسا خواب ہے جو ہوش سنبھالتے ہی ہر آنکھ میں لو دینے لگتا ہے۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے خاص طور پر، بیت اللہ اور روضۂ رسول ﷺ کی حاضری، دینی فریضے کی پاس داری یا شرعی تقاضے کی تکمیل سے بھی زیادہ وصل یار کی لذت اور تکمیل آرزو کا کیف رکھتی ہے۔ لذت اور کیف کا یہ پہلو ہمارے ماحول میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ نہ صرف مناسک حج بلکہ اس طویل سفر اور دیگر متعلقہ معاملات کے تمام پہلو بھی پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ مکہ مدینہ لہو کی ایک ایک بوند میں دمکتا اور مہکتا رہتا ہے لیکن یہ وارفتگی جب عملی مسائل و مشکلات سے ٹکراتی ہے تو حادثے جنم لیتے ہیں۔ اندر بھی اور باہر بھی۔

سعودی سفارت خانے کی طرف سے بھیجے گئے مہمانانِ گرامی ہوتے ہوئے بھی ہمیں جدہ کے حج ٹرمینل پر صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عام عازمین حج کے قافلہ ہائے شوق پر کیا گزرتی ہوگی۔ سعودیہ کی یہ پرواز غالباً کسی بھی ملک سے عازمین کو لانے والی آخری پرواز تھی۔ سو حج ٹرمینل کے احاطے خالی پڑے تھے۔ چھ اور سات جنوری کی درمیانی شب دس بجے کے لگ بھگ ہم امیگریشن کے ضابطوں سے فارغ ہو چکے تھے لیکن جدہ سے مکہ معظمہ تک پہنچتے ہمیں کم و بیش دس گھنٹے مزید لگ گئے۔ جب ہم اُمّ القریٰ کی گلیوں میں داخل ہوئے تو سورج خاصا اُوپر آ چکا تھا اور مکہ معظمہ لاکھوں انسانوں کے سیلِ بے پناہ سے چھلک رہا تھا۔

8 ذوالحجہ منیٰ روانگی ہوئی اور 12 ذوالحجہ تک مختلف مناسک کی سرانجام دہی کا سلسلہ طے شدہ ترتیب کے ساتھ جاری رہا۔ ان پانچ ایام میں منیٰ، عرفات، مزدلفہ، رمی جمرات، طواف زیارت اور متعلقہ معاملات کے تجربات و مشاہدات ایک پوری کتاب کا تقاضا کرتے ہیں لیکن میں شاید اس موضوع سے انصاف نہ کر سکوں۔ عقیدت و محبت کی پوٹلی کو ایک طرف رکھتے ہی اپنا آپ کسی ویران آسیب زدہ گھر کی طرح لگنے لگتا ہے اور مشکلات کے تصور سے ایک ایک مسام سلگ اُٹھتا ہے۔ حج پر قلم اُٹھاتے ہوئے شرعی نزاکتوں اور سفری صعوبتوں کے تذکرے سے کترا کے گزرنا مشکل ہے اور میں ان میں اُلجھ کر اپنا اثاثہ گنوانا نہیں چاہتا۔ سچی بات یہ ہے کہ جس کا ظرف چھوٹا ہو اور جو ہر آن پیش آنے والے نو بہ نو مسائل کے کچوکے کھانے کی سکت نہ رکھتا ہو اُسے حج کا عزم کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا چاہیے۔ اُلجھنوں اور

پریشانیوں کا چور ہر لحہ عقیدت ومحبت کی گٹھڑی کے در پے رہتا ہے اور ایک بار ذہن بھٹک جائے تو راستہ بڑا کٹھن ہو جاتا ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود گرد و پیش کے مسائل، پریشانیوں اور تکالیف سے مکمل طور پر آنکھیں بند کر لینا اور اپنے اعصاب کو فولاد کے سانچے میں ڈھال لینا خاصا مشکل کام ہے۔ پاکستانی حجاج کا ایک المیہ یہ ہے کہ اُن کی بڑی تعداد عمر رسیدہ خواتین وحضرات، کمزوروں، لاغروں اور بیماروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ عمر بھر پیسہ پیسہ جوڑ کر مکہ مدینہ جانے والوں اور پھولوں کے ہار ڈال کر انہیں رُخصت کرنے والوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کون سی امتحان گاہ اُن کی منتظر ہے۔ ہمارے ہاں ایسا کوئی معتبر نظام وضع نہیں کیا جا سکا کہ عازمین حج کو مستند طبی معائنے سے گزارا جا سکے۔

تکالیف اور سخت جسمانی مشقت سے بھرپور اس سفر کے لیے شاید عمر کی ایک حد کا تعین بھی کرنا پڑے۔ نادرا کا ادارہ قائم ہو جانے کے بعد بھی وزارت مذہبی اُمور اس امر کا اہتمام نہیں کر پا رہی کہ بار بار درخواستیں دینے اور ناکام رہنے والوں کو ترجیح دی جائے یا کم از کم گزشتہ پانچ سالوں میں حج کر لینے والے افراد کو اجازت نہ دی جائے۔ حج بدل کے حوالے سے بھی کچھ قدغنیں لگانا ہوں گی۔ میں ایک ایسی خاتون کو جانتا ہوں جو سولہ سال سے حج بدل کر رہی ہے۔ جدہ میں میری ملاقات لاہور کے اُس پہلوان سے بھی ہوئی جو گزشتہ 22 سالوں سے کسی وقفے کے بغیر حج پر جا رہا ہے۔ ''پیشہ ور حجاج'' کے بعض معروف گروہ برسوں سے یہی کچھ کر رہے ہیں۔ عازمین کی ہمہ پہلو تربیت کا بھی کوئی با اعتبار نظام موجود نہیں اور چند رسمی کاغذی کارروائیوں کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ انتشار، بے تدبیری، بدنظمی اور پرلے درجے کی ناقص منصوبہ بندی ہمارے نظام حج کے وہ اجزائے ترکیبی ہیں جو برس ہا برس سے ہمارا امتیاز بن چکے ہیں۔ برادرم اعجاز الحق، نظام کی بہتری کا مخلصانہ جذبہ رکھنے اور کئی اقدامات کرنے کے باوجود اس آشوب کا طلسم نہیں توڑ سکے کیوں کہ پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے والے اُن سے زیادہ طاقت ور ہیں اور اُن کی قوت کے سرچشمے اسلام آباد کی مقدس بارگاہوں میں ہیں۔ دنیا کے ستاون اسلامی ممالک میں سے شاید ہی کسی ملک نے سعودی عرب میں مستقل حج مشن قائم کر رکھا ہو۔ موسم الحج میں خصوصی عملہ آتا اور سارا انتظام خوش اُسلوبی سے سنبھال لیتا ہے۔ ہم نے سفید ہاتھیوں کا ایک غول مستقلاً پال رکھا ہے۔ اس کا بنیادی فریضہ اسلام آباد اور دیگر علاقوں سے جانے والے عالی مرتبت لوگوں اور اُن کی آل اولاد کو پروٹوکول فراہم کرنا ہے۔ عام حاجی اُن کی ترجیحات میں بہت نیچے آتا ہے۔ پی آئی اے کی خودسری وزارت مذہبی اُمور کی دسترس سے باہر ہے۔ وزارت نے مکہ اور مدینہ سے حاجیوں کو لانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ درہم برہم ہو چکا ہے۔ اب مدینہ وہ حاجی آ رہے ہیں جو پہلے ہی مدینہ میں آٹھ دن گزار چکے ہیں۔ انہیں مکہ سے جدہ لے جانے کے بجائے مکہ سے ایک بار پھر مدینہ منورہ لایا جا رہا ہے جہاں پرواز سے کئی گھنٹے قبل

انہیں خاصا وقت انتہائی تکلیف دہ حالات میں گزارنا پڑ رہا ہے۔ پی آئی اے اور وزارت مذہبی اُمور کا عدم اشتراک وتعاون ہمیشہ سے اس نوع کے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ مکہ معظمہ میں حج مشن کے کارپردازوں کی حساسیت کا یہ عالم ہے کہ مدینہ منورہ میں روزنامہ ''نوائے وقت'' کے نمائندہ خصوصی کو اس لیے جیل بھجوا دیا گیا کہ اُس نے کوئی گستاخانہ خبر یا تصویر شائع کر دی تھی۔ اس کی وضاحت جاری کرنے کے بجائے ایسا نازیبا راستہ اختیار کیا گیا جو کسی طور پر پاکستانی عزت و وقار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ سعودی ذرائع نے رابطہ کرنے پر بتایا کہ انہیں مذکورہ صحافی سے کوئی شکایت نہیں، ایسا پاکستانی اتھارٹیز کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔ 2001ء میں بھی ایک ایسی آندھی چلی تھی جب سعودی عرب میں متعین پاکستانی سفیر نے متعدد پاکستانیوں کو جیل بھجوا دیا یا ڈی پورٹ کروا دیا تھا۔ ان پر مسلم لیگ (ن) سے وابستگی اور نواز شریف سے ہمدردی رکھنے کا الزام تھا۔ جس طرح عمرہ کے حوالے سے ناقابل بیان مشکلات کا سامنا صرف پاکستانی عازمین کو کرنا پڑتا ہے، اِسی طرح حج کے حوالے سے بھی حکومت پاکستان اپنے حجاج کو حتیٰ المقدور سہولتیں بہم پہنچانے اور معلمین کی بدسلوکی سے بچانے کے لیے گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ وہ اکثر و بیشتر حالات کے رحم و کرم پر ہی رہتے ہیں اور کوئی ایسا طریقہ کار موجود نہیں جو معلمین کی کارکردگی پر نظر رکھ سکے۔

حجاج کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں تاویلات میں اُلجھا دیا جاتا ہے۔ منیٰ اور عرفات کے ہر خیمے میں ایک عدد مفسر، ایک محدث، ایک فقیہ اور دو چار مفتی ضرور ہوتے ہیں جو پیہم حجاج کے ذہنوں میں شکوک و شبہات کے بیج بوتے رہتے ہیں۔ ایک ہی خیمے میں دو دو تین تین نمازیں پڑھی جاتی اور حج بیت اللہ کی رُوح کو کچوکے لگائے جاتے ہیں۔ حج کو سہل، آسان اور فراخ بنانے کے بجائے اڑچنیں، اُلجھنیں اور مشکلیں ڈالی جاتی ہیں اور ایسی ہر کوشش کی پیشانی پر ''افضل'' کا خوشنما ٹیکا سجا دیا جاتا ہے۔

[21-01-2006]

# حج کی باتیں (2)

منیٰ کے حادثے کی ذمہ داری، صرف غیر ذمہ داری کے سر ڈالی جاسکتی ہے اور اس کا مظاہرہ خود حجاج کی طرف سے ہوا۔ ''افضل'' کی آرزو اور فزوں تر اجر وثواب کی جستجو میں عملی مشکلات کی نزاکتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ 12 ذوالحجہ منیٰ سے روانگی کا دن ہونے کے باعث حجاج اپنا سامان ہمراہ لے کر نکلتے ہیں تاکہ رمی جمرات سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ کو نکل جائیں۔ لاکھوں افراد ایک دن پہلے ہی جمرات کے اردگرد پھیلے میدانوں اور سڑکوں پر ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔ اکثریت زوال کے بعد، یعنی ظہر کے وقت کنکریاں مارنے کو تقاضائے ضروری خیال کرتی ہے چنانچہ سوا بارہ بجے کے بعد یکایک ہجوم بڑھ جاتا اور بے قابو ہو جاتا ہے۔ لاکھوں افراد کے بیک وقت متحرک ہونے اور ایک ہی نقطۂ اتصال پر جمع ہو جانے سے کسی ایک فرد کی لغزش پایا کسی کا سامان زمین پر گر جانے سے حادثہ رُونما ہوسکتا ہے اور آناً فاناً سینکڑوں افراد لقمۂ اجل بن سکتے ہیں۔ اب کے بھی یہی ہوا۔

سعودی حکومت ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہر برس تبدیلیاں کرتی رہتی ہے لیکن حجاج کی تعداد میں پیہم اضافہ ان تبدیلیوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس برس سرکاری اعداد وشمار کے مطابق حجاج کی تعداد 35 لاکھ سے زائد تھی۔ غیر رجسٹرڈ مقامی حجاج کو بھی شمار کر لیا جائے تو یہ تعداد 40 لاکھ سے بڑھ جاتی ہے۔ خود پاکستان کو لے لیجئے۔ 1948ء سے 1960ء تک کے 12 سالوں میں حج کرنے والے افراد کی مجموعی تعداد 2 لاکھ 40 ہزار ایک سو یعنی ہر سال اوسطاً صرف 20 ہزار کے لگ بھگ افراد نے حج کیا۔ 1961ء سے 1970ء تک کے 10 سالوں میں 1,31,730 حجاج نے یہ سعادت حاصل کی یعنی اوسط 11 ہزار سالانہ۔ 1971ء سے 1980ء تک کی اوسط 53,000 حاجی سالانہ ہوگئی جب کہ کل 6 لاکھ 36 ہزار 2 سو 13 افراد نے حج کیا۔ 1991ء سے 2000ء تک 9 لاکھ 18 ہزار ایک سو 90 یعنی اوسط تقریباً 76 ہزار افراد سالانہ۔ 6 سال قبل 2001ء میں پاکستانی حجاج کی مجموعی تعداد یک لاکھ سے بھی کم تھی جب کہ اس سال یعنی 2006ء میں مجموعی طور پر ایک لاکھ 50 ہزار 2 سو 94 افراد نے حج کی سعادت حاصل کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ 6 برسوں میں حاجیوں کی تعداد ڈیڑھ گنا بڑھ گئی ہے۔ یہی صورت حال باقی ممالک سے آنے والے حجاج کی ہے۔ اب یہ مسئلہ بھی پیدا ہو رہا ہے کہ منیٰ میں مزید حاجیوں کو ٹھہرانے کی گنجائش نہیں رہی۔ پہلے ہی مزدلفہ کے کچھ حصے کو منیٰ قرار دیا جا چکا ہے۔ سعودی حکام سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ حجاج کی تعداد میں مزید اضافہ بند کر دیا جائے۔

چالیس لاکھ افراد کا ایک ہی وقت ایک ہی جگہ جمع ہو کر ایک ہی مشق سے گزرنا ایسا غیر معمولی تجربہ ہے جس کا دنیا کے کسی دوسرے ملک کو سامنا نہیں۔ اتنے افراد کا ایک ہی شہر میں جمع ہونا بھی غیر معمولی بات ہے لیکن اس امر کی داد دینی چاہیے کہ مکہ معظّمہ کی آغوش اس سیلِ بے پناہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ سب حاجیوں کو حرم کعبہ کے دو تین کلومیٹر کے دائرے میں کسی نہ کسی نوع کی رہائش مل جاتی ہے۔ اشیائے خوراک کی کوئی قلت پیدا نہیں ہوتی۔ صفائی ستھرائی کا کوئی بحران جنم نہیں لیتا۔ امن و امان کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی جامد اور مفلوج نہیں ہوتی۔

ہم نصف صدی سے کالا باغ ڈیم سے گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ لیکن منیٰ میں 12 جنوری کو حادثہ پیش آیا۔ 13 جنوری کو متعلقہ اداروں نے تمام فیصلے کر لیے۔ 14 جنوری کو عمل درآمد شروع ہو گیا اور بڑی بڑی مشینوں نے جمرات کے دونوں پل ادھیڑنا شروع کر دیئے۔ انہدام کے لیے صرف دس دن مختص کیے گئے۔ نئے منصوبے کے تحت شیطانوں کے پلوں کی تعداد دو سے بڑھا کر دس کر دی جائے گی۔ دو پل اگلے حج تک تیار ہوں گے۔ 2007ء کے حج تک زمینی سطح سمیت پانچ پل تیار ہو جائیں گے۔ دس برس کے اندر اندر دس پل تیار ہوں گے جس کے بعد ہر منزل یا ہر پل منیٰ کی کسی ایک سڑک سے ملا دیا جائے گا اور اس سمت سے آنے والے حاجی صرف اپنی مخصوص منزل پر ہی رمی کر سکیں گے۔ اس عظیم منصوبہ پر چار ارب 20 کروڑ سعودی ریال خرچ ہوں گے۔ ہماری کرنسی میں یہ رقم 70 ارب روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔ 2007ء میں پانچ پل بن جانے سے فی مربع میٹر حاجیوں کی موجودگی تین یا چار رہ جائے گی جو اس وقت آٹھ ہے۔

منیٰ کا حادثہ دنیا بھر کے علماء کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ لبنان کے مفتی شیخ محمد علی الجواز اور مصر کے مفتی ڈاکٹر علی جمعہ نے کہا ہے کہ ایام تشریق میں کسی بھی وقت رمی جائز ہے۔ اُردن کے ممتاز عالم دین ڈاکٹر عبدالسلام العبادی نے کہا ہے کہ حادثات سے بچنے کے لیے زوال سے قبل رمی کو ترجیح دینی چاہیے۔ سعودی عرب کے علماء پہلے ہی فتویٰ دے چکے ہیں کہ 24 گھنٹوں میں کسی بھی وقت رمی کی جاسکتی ہے۔

[22-01-2006]

# حج کی باتیں (3)

وہ لمحہ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا جب پہلے پہلے ہم نے سوچا کہ مدینہ منورہ جائے بغیر پاکستان واپسی کی سبیل نکالی جائے۔

مزدلفہ کی خنک رات میری اہلیہ کے لیے بہت بھاری ثابت ہوئی۔ پچھلے پہر شدید لرزے کے ساتھ بخار آیا۔ اگلے تین دن مناسک حج کی ریاضت و مشقت نے بیماری کی شدت کئی گنا بڑھا دی۔ نمونیے کا حملہ تشویش ناک صورت اختیار کر گیا اور مکہ کے پُرہجوم ہسپتال میں معقول علاج معالجے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہم نے مکہ معظّمہ ہی سے واپس اسلام آباد آ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بیٹی اور بیگم سے اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے میں دن بھر تسلیاں دیتا رہا لیکن رات کو میری آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں کیا مدینہ ایک بار پھر دُور ہو گیا ہے؟ اگر ہم بارگاہِ رسالت ﷺ میں سلام پیش کیے بغیر رُخصت ہو گئے تو محرومی کا یہ زخم کبھی بھر نہ پائے گا؟ یہ احساس کند چھری کی طرح میرے دل پر چرکے لگانے لگا۔ میں نے اپنے دو بااثر دوستوں سے کہا کہ وہ فوری طور پر ہماری واپسی کے لیے نشستوں کا اہتمام کریں۔ پھر شاید نیلگوں آسمان کے اُس پار ہماری فائل کائنات کے مختارِ کل اور سب سے بڑے فیصلہ ساز کے سامنے رکھی گئی اور اُس نے مسکرا کر منظوری دے دی۔ ایک کرم فرما نے ہمیں مکہ سے اُٹھایا اور جدہ کے ایک انتہائی جدید ہسپتال میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں نے ہنگامی طور پر علاج کا آغاز کر دیا۔ پاکستانی نژاد سینئر نرس شمیم نے محبت و خدمت گزاری کی انتہا کر دی۔ دو دن بعد بادلوں کی اوٹ سے جھانکتے اُجلے چاند کی مصفّٰی کرنوں نے ہمیں خبر دی کہ مدینہ دُور نہیں۔

17 جنوری کو ہم جدہ سے ہی مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ ظہر کی نماز سے کوئی ایک گھنٹہ قبل جب پہاڑی سلسلے کے وسط میں چلتی موٹر وے نے ایک چھوٹا سا موڑ کاٹا تو ڈرائیور بولا ''وہ سامنے مدینہ ہے۔'' ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہم سب نے محسوس کیا کہ ہماری آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ دل پر جیسے پھوار سی پڑنے لگی۔ اندر ہی اندر کشادگی اور فراخی کی ایک لہر سی اُٹھی جیسے شدید حبس اور گھٹن میں ہچکیاں لیتا ماحول یکا یک تازہ اور شاداب آکسیجن سے لبالب بھر جائے۔

مدینہ کے نام میں ایک سحر ہے جس کی کوئی تعبیر و تفسیر نہیں کی جا سکتی۔ یہ نام خیالوں اور خوابوں میں آتا ہے تو دُور دُور تک جگنو سے چمک اُٹھتے ہیں۔ دل عشق کی تمازت سے سلگنے لگتا ہے۔ مدینہ محض ایک بستی، ایک شہر، ایک قریہ اور ایک قصبہ نہیں، یہ سوا ارب سے زائد اہلِ حرم کی عقیدت و محبت کی علامت اور

عشق و مستی کا تابندہ استعارہ ہے۔ مدینہ کی نسبت ایک ایسے اسم مبارک سے ہے جس کا ایک ایک حرف تاریخ کی پیشانی پر آفتاب و مہتاب کی مانند دمک رہا ہے۔ یہ اسم مبارک، انسانی تہذیب و تمدن کو امکانی رفعتوں سے ہم کنار کرنے والے اس انقلاب عظیم کا سرمایہ ہے جو ابد تک زندہ و پائندہ رہے گا۔ اس اسم مبارک میں کچھ ایسی تاثیر ہے کہ سینۂ سنگ سے بھی چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور سلگتے ریگ زاروں میں بھی گلزار مہکنے لگتے ہیں۔

حج کی مشقت، حرم کعبہ کے بے پناہ ہجوم اور مکہ معظّمہ کی سڑکوں پر ہلکورے کھاتے سیل بے کراں کے بعد مدینہ منورہ سکون، آسودگی اور عافیت کا گہوارہ لگا۔ مسجد نبوی ﷺ ہمیشہ کی طرح مادرِ مشفق کی صورت نرم و گداز آغوش وا کیے بیٹھی تھی۔ اس کے مرمریں ستونوں سے زندگی بخش شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ خوشبو کے لطیف جھونکے پیہم فضا میں گردش کر رہے تھے۔ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے لیے مسجد سے باہر جانے اور باب السلام سے اندر آنے کے لیے کہا گیا۔ باب السلام پر ایک بڑا ہجوم جمع تھا۔ پہرے دار نے قدغن لگا دی کہ کوئی اندر قدم نہ رکھے۔ دربان کو کیا معلوم کہ یہ دیوانے ہزاروں میل دُور کی کن بستیوں سے آئے ہیں اور حج کی سعادت عظمیٰ حاصل کرنے کے باوجود ان کے اندر گہرا کھدا ہوا ایک کنواں پانی کی بوند بوند کو ترس رہا ہے۔ مدینہ منورہ حج کے مناسک کا حصہ نہیں لیکن بارگاہِ محمد ﷺ میں سلام نیاز پیش کیے بغیر واپس لوٹ جانے والوں کی کم نصیبی ماپنے کا کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہو پایا۔

ذرا دیر بعد دربان نے اجازت مرحمت فرمائی اور بند ٹوٹ گئے۔ میں گرتا پڑتا سنہری جالیوں کے سامنے پہنچا تو حسب معمول میری زبان گنگ ہو گئی۔ دعائیں کافور کا دُھواں بن کر تحلیل ہو گئیں۔ بے چارگی اور بے بسی کی ان ساعتوں میں اب کے بھی آنکھوں نے ہی یاوری کی۔ اپنی تہی دامانی اور حضور ﷺ کی رحمتوں کی فراوانی کا احساس مجھے نچوڑے دے رہا تھا۔ پھر دل کی کوٹھڑی میں ایک روزن سا کھلا اور اپنے وطن کی حرماں نصیبی نے دُکھ کی ایک چادر سی تان لی۔ میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ اپنے عزیز و اقارب کو بھول گیا۔ دوستوں کے سلاموں اور دعاؤں والی پوٹلی جانے کہاں گر گئی۔ میرے کپکپاتے ہونٹوں کا ارتعاش پاکستان، پاکستان الاپنے لگا۔ میں باجوڑ پر امریکی حملے کی دل خراش خبر سن چکا تھا۔ عین اس لمحے مجھے معصوم شہداء کا خیال آیا۔ میں نے ہاتھ اُٹھائے بغیر دل ہی دل میں اُن کے لیے مغفرت کی دعا مانگی۔ لیکن کسی انجانے احساس جرم سے میری پیشانی عرق ندامت سے تر ہو گئی۔

بے پناہ ہجوم کے باعث سنہری جالیوں کے سامنے ٹک کر کھڑا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ بس سلام پیش کرو اور چلتے جاؤ۔ یہ پل دو پل کی حاضری بھی دولت دو جہاں سے کم نہ تھی۔ میں نے باب البقیع سے باہر نکلتے ہوئے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور یکا یک ایک معطر سی گونج میری سماعتوں سے ٹکرائی ''مدینہ کتنا قریب ہے۔'' میں سرشاری کا خنک احساس لیے اپنے مسکن پہ آیا۔ اگلے دن سر شام ہم جدہ پہنچ گئے۔ فجر

کی نماز کے وقت ہم سعودیہ کی پرواز لینے حج ٹرمینل پر کھڑے تھے۔ حدنظر تک نگر نگر سے آئے حاجیوں کا ہجوم تھا۔ دُور دُور تک اُن کے بھاری بھرکم سامان کے ڈھیر لگے تھے۔ جا بجا آب زم زم سے بھرے کین بکھرے ہوئے تھے حاجیوں پر عجیب بے کلی سی طاری تھی وہ ہاتھوں میں پاسپورٹ اور ٹکٹ تھامے بوکھلائے پھرتے تھے۔ ہم بھی انہی میں سے اور انہی جیسے تھے۔ ہمیں بس ایک ہی طلب تھی کہ گیٹ نمبر 11 کا پاسبان ہمیں جلد از جلد اندر داخل ہونے کی اجازت دے اور ہم اُڑ کر سعودیہ کی پرواز ایس وی 722 کے اندر جا بیٹھیں اور وہ چشم زدن میں ہمیں اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اُتار دے۔

[23-01-2006]

---

# حمیت نام تھا جس کا......!

وہ جن کی عقل وفہم کا ماتم کیا گیا۔ جنہیں سمجھ بوجھ سے عاری قرار دیا گیا، جنہیں عملیت پسندی اور زمینی حقائق کے تقاضوں سے بے بہرہ کہا گیا اور جنہیں انتہا پسندی کے طعنے دیئے گئے، وہ مسلسل دہائی دے رہے تھے کہ ہم جس شجر بے ہنر کو اپنے لہو سے سینچ رہے ہیں اور جس میں اپنی ہڈیوں کی کھاد ڈال رہے ہیں وہ جوان ہو کر بھی بے ثمر ہی رہے گا۔ وہ مسلسل کہہ رہے تھے کہ نام نہاد دہشت گردی کی یہ بے چہرہ جنگ پھیلتی گئی تو ایک دن ہماری اپنی بستیاں بھی اس کی زد میں آ جائیں گی۔

15 جنوری کو حرم کعبہ میں نماز ظہر ادا کر کے واپس آتے ہوئے مجھے ایک پاکستانی نے باجوڑ پر امریکی حملے کی خبر دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی شخص گھر کو تالے لگا کر دُور کے سفر پر نکل جائے اور اچانک اُسے خبر دی جائے کہ تمہارے گھر چوری ہو گئی ہے۔ زلزلہ آیا، 28 ہزار مربع میل علاقہ تہ و بالا ہو گیا۔ ایک لاکھ کے لگ بھگ انسان لقمۂ اجل ہو گئے اور ہمیں چوبیس گھنٹے تک اس قیامت کی شدت کا علم ہی نہ ہو پایا۔ 12 اور 13 جنوری کی درمیانی شب ہمارے ایک ''دوست اور اتحادی'' ملک نے ہم پر حملہ کر دیا اور تقریباً دو ہفتے گزر جانے کے بعد بھی ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ یہ معمہ کیا تھا؟

جب یہ واضح ہو گیا کہ حقیقت چھپ نہیں سکتی تو پاکستان کا دفتر خارجہ دوٹوک مذمت اور غیر مبہم احتجاج کے بجائے الفاظ کے چناؤ میں اُلجھ گیا۔ کم و بیش 72 گھنٹے بعد دفتر خارجہ کی ترجمان تسنیم اسلم نے کہا کہ اگرچہ ہماری تحقیقات کے مطابق ڈمہ ڈولا میں کچھ غیر ملکی موجود تھے لیکن ہم نے امریکی سفیر سے احتجاج کیا ہے۔ تاہم امریکی حکام نے حملے میں ملوث ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ اگلے دن امریکی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان سین میک نے بیان جاری کیا کہ ''پاکستان نے سرے سے کوئی احتجاج نہیں کیا۔'' جب ایک صحافی نے پوچھا کہ ''کیا پاکستان اپنے عوام کا غم وغصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے احتجاج کی باتیں کر رہا ہے؟'' تو سین میک نے برجستہ کہا ''آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے۔''

پاکستان بے چارگی اور احساس ندامت کے آشوب میں مبتلا تھا کہ سرکاری جماعت سے تعلق رکھنے والے سینیٹر جان میکنن نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا ''باجوڑ حملے کی پیشگی اطلاع پاکستانی حکام کو دے دی گئی تھی۔ ہمیں اپنی سلامتی عزیز ہے اور ہم آئندہ بھی ایسی کارروائی نہ کرنے کی ضمانت نہیں دے سکتے۔'' وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس نے باجوڑ کی ہلاکتوں کی مذمت یا اظہار افسوس سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ

پاک افغان سرحد پر کارروائیاں درست تھیں اور آئندہ بھی کی جا سکتی ہیں۔

صدر پرویز مشرف کا اتنے بڑے سانحے پر پہلا تبصرہ گزشتہ روز اوسلو میں سامنے آیا جب انہوں نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہاں کچھ غیر ملکی موجود تھے۔ ایمن الظواہری ایک ڈنر کے لیے آ رہے تھے۔ القاعدہ کے کچھ مصری نژاد اور رہنما بھی موجود تھے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ایمن الظواہری اور القاعدہ رہنما واقعی وہاں موجود تھے تو کیا اس سے امریکی حملے کا جواز نکلتا ہے؟ کیا ایسی صورت میں امریکہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہمیں بتائے بغیر ہمارے علاقے پر فضائی بمباری شروع کر دے اور میزائل برسا کر بے گناہ انسانوں کا شکار کھیلنے لگے؟ اگر امریکہ کو پتا چلے کہ نیو یارک کے مین ہٹن کے کسی اپارٹمنٹ میں القاعدہ کے کچھ لوگ ایمن الظواہری یا خود اُسامہ بن لادن چھپا بیٹھا ہے تو اس کے جنگی طیارے بم اور ہیل فائر میزائل برسائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ ہم امریکہ کی کھلی مذمت کے بغیر اس کے وکیل کا کردار کیوں ادا کر رہے ہیں؟ کیا پاکستانیوں کی جانیں اس قدر ارزاں ہیں کہ امریکہ ایک جھوٹی اطلاع پر اُن کے پرخچے اُڑا دے اور پھر پوری ڈھٹائی سے کہے کہ ہم آئندہ بھی یہی کریں گے؟ باجوڑ کے سانحہ سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ہم آج بھی دست قاتل کو بوسے دے رہے ہیں اور اس کی قدم بوسی کے لیے ہمارے دل سینوں سے نکلے جا رہے ہیں اور تمام تر سانحوں سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے''۔

دیار حجاز میں یہ خبر میرے دل و دماغ کو چھید گئی۔ رات بھر میں بے کلی سے پہلو بدلتا رہا۔ الٰہی یہ ہم کس بھنور میں گھر گئے ہیں؟

[26-01-2006]

## یہ بڑے نصیب کی بات ہے......!

ریاض سے مدینہ منورہ آنے والے طیارے کو شام چھ بجے پرنس محمد بن عبدالعزیز ایئرپورٹ پر اُترنا تھا۔ حرم نبوی ﷺ میں نمازِ مغرب کا وقت چھ بج کر چوبیس منٹ تھا۔ میں تقریباً پونے دو گھنٹے کے سفر کے دوران یہی سوچتا رہا کہ جہاز سے اُترنے، لاؤنج تک آنے، سامان وصول کرنے اور باہر گاڑی تک پہنچنے میں کم وبیش بیس منٹ لگ جائیں گے اور نمازِ مغرب مسجد نبوی ﷺ میں نہیں مل سکے گی لیکن طیارہ مقررہ وقت سے اٹھارہ منٹ پہلے لینڈ کر گیا۔ میں بس سے اُتر کر لاؤنج میں پہنچا تو سامان پہلے سے آیا رکھا تھا۔ اور جب میں نے باب عبدالمجید سے اندر قدم رکھا تو اقامت ہو رہی تھی۔

میرے ذہن میں ابھی تک حج کا بحرِ بےکراں ہچکولے کھا رہا تھا اور ذہن سے چپکے اس منظر کے تناسب سے مسجد نبوی ﷺ خالی خالی نظر آئی۔ روضۂ اطہر کے سامنے بھی ہجوم نہ تھا۔ جب تک چاہو رُکو، جب تک چاہو عرضِ نیاز عشق کرو۔ جب تک چاہو درود و سلام کی سوغاتیں بھیجو۔ میرے لیے وقت تھم سا گیا تھا اور میں حسبِ معمول بہت دُور نکل گیا تھا۔ مجھے سبز جالیوں کے اندر سبز اور سرخ رنگ کے پردے صاف دکھائی دے رہے تھے جن پر قرآنی آیات کندہ تھیں۔ حضور ﷺ کے اسم مبارک کے دائیں ہاتھ رُفقائے خاص حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ناموں کے کتبے اُن کے مزار ہائے مقدس کی نشاندہی کر رہے تھے۔ کیا نصیب والی ہستیاں تھیں کہ دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی لازوال رفاقت کے رشتے پہ آنچ نہ آنے دی۔ دونوں چپ چاپ حضور ﷺ کے پہلو میں سو رہے تھے۔ میری نظر سنہری جالیوں سے ذرا اُوپر اٹھی جہاں قرآنی آیت رقم تھی کہ اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے اُونچی نہ کرو مبادا......!

اس خوف سے کہ میری ہچکی کی آواز حدِ ادب سے اُونچی نہ ہو جائے، میں باب البقیع سے باہر نکل کر باب جبریل سے پھر اندر آگیا۔ رحمتوں اور برکتوں کی ارزانی سے سارا ماحول جل تھل ہو رہا تھا۔ جہاں چاہو نوافل پڑھو۔ جہاں چاہو بیٹھو۔ جہاں چاہو تلاوت کرو۔ جہاں چاہو نماز ادا کرو۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ میں نے نماز کے لیے حضور ﷺ کے قدمین شریفین کو چنا۔ میرے اور روضۂ رسول ﷺ کی جالیوں کے درمیان لکڑی کی اڑھائی فٹ اُونچی رُکاوٹ تھی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی اچانک میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپک گیا کہ میں آپ ﷺ کے قدموں کے کتنے قریب بیٹھا ہوں۔ اپنی تردامنی اور کم مائیگی کے احساس سے مجھے پسینہ آگیا۔ یقیناً ''یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔'' لیکن مجھے اپنی اوقات کا اندازہ تھا اور میرا سر بے پایاں تشکر سے جھکا جا رہا تھا۔

فجر کی نماز کے بعد ایک بار پھر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد میں مکہ معظّمہ کی طرف محوِ سفر تھا۔ اب کے میں والدہ ماجدہ کی طرف سے عمرہ کا ارادہ کر کے آیا تھا۔ میقات ذوالحلیفہ سے احرام باندھنے کے بعد میں مسجد میں نوافل ادا کرنے گیا تو صرف ایک اور احرام پوش کو موجود پایا۔ مکہ سے مدینہ یا مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے موٹر وے کے دونوں طرف گہرے سیاہ رنگ پتھروں سے یوں لگتا ہے جیسے کسی آتش فشاں کے لاوے نے جم کر یہ شکل اختیار کر لی ہو۔ اب عہدِ رسالت مآب ﷺ کی کوئی نشانی نہیں ملتی جسے دیکھ کر زمان و مکان کی وسعتیں سمٹ جائیں اور دُور دیس سے آئے مسافر چودہ صدیاں پیچھے پلٹ جائیں۔ میں اپنی آنکھیں حدِامکان تک کھولے پہاڑیوں، گھاٹیوں، چٹانوں اور پتھروں کو اس خیال سے دیکھتا رہتا ہوں کہ شاید کبھی محبوب حجازی ﷺ کی نگاہِ مبارک بھی ان پہ پڑی ہو۔ بے چارگی عشق بھی کیسے کیسے بہانے تلاش کر لیتی ہے۔

نماز ظہر سے ذرا پہلے میں باب عبدالعزیز سے حرم کعبہ میں داخل ہوا تو بے پناہ کشادگی اور وسعت کے احساس نے چونکا دیا۔ ابھی کوئی ڈیڑھ ماہ قبل یہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لاکھوں لوگ دوسری منزل اور بالائی چھت پر طواف کر رہے تھے جہاں ایک چکر ایک کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ ہم نے زمینی سطح پر ہی طواف زیارت کیا تھا جس میں کوئی دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ اب کے خانہ کعبہ سے متصل صرف دو تین قطاریں گردش میں تھیں جن کی تعداد کسی طور سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ تھی۔ مجھے طواف کے سات چکر پورے کرنے میں صرف دس بارہ منٹ لگے۔ 1978ء میں پہلے حج کے بعد سے میں متعدد بار در کعبہ پہ حاضری دے چکا ہوں لیکن پہلی بار کے سوا کبھی حجر اسود کو بوسہ دینے کی سعادت نہیں ملی۔ بھیڑ بھاڑ کو چیرنا اور دھکم پیل کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اب کی بار کوئی اٹھائیس سال بعد یہ سعادت ملی تو شادابی و سرشاری رُوح تک اُتر گئی۔ شاید اس لیے کہ یہ عمرہ میں اپنی ماں کی طرف سے کر رہا تھا اور نعیم شہزاد میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ نعیم ہر رات ٹھیک دو بجے اپنی بیمار والدہ کی ویل چیئر کھینچتا حرم کعبہ میں آتا ہے۔ تین یا چار طواف کراتا اور چار بجے گھر واپس لے جاتا ہے۔ حرم سے تہجد کی اذان بلند ہونے تک وہ ماں کے پاؤں اور ٹانگیں دابتا اور ڈھیروں دعائیں سمیٹ کر دعائیں مانگنے ایک بار پھر حرم آ جاتا ہے۔ گزشتہ شب وہ مجھے ہوائی اڈے چھوڑنے آیا تو بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر بولا ''کل امی اسلام آباد جا رہی ہیں۔ میں نے پچھلے تین ہفتے اپنے معمول میں خلل نہیں پڑنے دیا۔ سوچ رہا ہوں آج محروم نہ رہ جاؤں۔'' ماں تو خوش بخت تھی ہی لیکن میں بیٹے کی خوش نصیبی پر رشک کرنے لگا۔

کعبہ کے جلال و جمال کی کیفیت وہی تھی جو اس کے ساتھ ہمیشہ منسوب رہی ہے۔ دعاؤں کو اُٹھے ہوئے ہاتھ پکار رہے تھے اور سسکیوں کے ارتعاش سے غلاف کعبہ تھرتھرا رہا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں ایک ہی رنگ میں رنگے تھے اور اُن کے چہروں پر ایک جیسی التجائیں بکھری ہوئی تھیں۔ میرا دل

احساس تشکر سے چھلک رہا تھا کہ حج کے صرف ایک ماہ دس دن بعد در کعبہ پہ حاضری اور اٹھائیس سال بعد حجر اسود کو چومنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ میں دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوں یا حرم کعبہ میں، دعائیں بکھر بکھر جاتی ہیں اور الفاظ ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح منتشر ہو جاتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دلوں کے بھید جاننے اور آرزوؤں کی ایک ایک ادا کو سمجھنے والی علیم وخبیر ہستی کے سامنے لب کشائی نہ بھی ہو تو کون سا بھید چھپا رہ جائے گا۔ اس مرتبہ مجھے طواف کے ساتوں چکروں میں اعزہ واقارب کے علاوہ اتنے دوست، اتنے دوست یاد آئے کہ چھاجوں مینہ برستا رہا۔

حج پہ حرم کے صحن اور مکہ کے گلی کوچے زائرین سے بھرے تھے۔ تلاش کے باوجود مجھے کبوتر نظر نہیں آئے تھے۔ آج گہرے خاکستری رنگ کے پروں والے کبوتروں کی ڈاریں دیکھ کر لگا جیسے وہ ایام حج میں حرم کا گردونواح دُور سے آئے مہمانوں کے لیے خالی کر کے کہیں چلے جاتے اور حجاج کے رُخصت ہوتے ہی پھر لوٹ آتے ہیں۔ عشق کے آداب اور قرینوں سے آشنا ہونا بھی یقیناً بڑے نصیب کی بات ہے۔

[27-02-2006]

# کوئی محرومی سی محرومی ہے!

12 ربیع الاوّل!

عام دنوں کی طرح گنتی کی چند گھڑیوں، شمار کی چند ساعتوں پر مشتمل دن۔

لیکن یہ کیسا دن ہے کہ کتنے ہی زمانے اس کے دامانِ کرم میں سمٹے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی سورج اس کے آفتاب جہاں تاب سے خراج لے رہے ہیں۔ کتنے ہی چمنستان اس کی صبح خوش جمال کی بادِ صبا سے رنگ وبو کی رعنائیاں سمیٹ رہے ہیں۔ کتنے ہی شبستاں اپنی تیرگی مٹانے کے لیے اس سے روشنی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

یہ دن کائنات کی وجہ تخلیق بھی ہے اور رُوحِ تخلیق بھی۔ یہ دن ازل اور ابد کی وسعتوں پر محیط ایک ایسی ساعت جمیل کا امین ہے جو سارے جہانوں اور سارے زمانوں کا مقدر سنوار گئی۔ یہ دن چشم فلک میں لودیتے اُن خوابوں کی تعبیر کا دن ہے جو کائنات کے ویرانوں کو رعنائی وزیبائی کی رونقیں دے گئے۔ یہ دن انسانیت کا وہ جوہر حیات ہے جو شرق وغرب کے تمام انسانوں کو شرف آدمیت سے ہم کنار کر گیا۔ یہ دن اُس سرمدی پیغام کی زندہ تابندہ علامت ہے جو خالق ومخلوق کے حقیقی رشتے کا شعور دیتا ہے۔

محمد عربی ﷺ کا پیغام، خالق ارض وسما کا پیغام ہے۔ یہ پیغام عرب وعجم اور شرق وغرب کی حدوں سے ماوراء اور وقت کی قید سے آزاد ہے۔ سارے زمانوں اور سارے جہانوں پر محیط اس پیغام میں ایسی کشش اور ایسی جامعیت ہے کہ یہ پتھروں کے دلوں میں گھر کر جاتا اور آفاق کی ساری وسعتوں کو اپنے دامن میں لے لیتا ہے۔ اللہ نے اپکا آخری پیغام کے لیے آخری پیامبر ﷺ کا انتخاب کیا اور محمد عربی ﷺ کے مقام بلند کی رفعتیں یہ ہیں کہ بنی نوع انسان نے آپ ﷺ کے واسطے سے رب کائنات کو جانا۔ مکہ کے لوگ اُسے چالیس سالوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس کے کردار کی رفعتوں، اُس کی گفتار کی شیرینیوں اور اُس کے اندر واطوار کی عظمتوں سے آشنا تھے۔ وہ اُن میں سے تھا لیکن اُن سے جدا تھا۔ وہ اُنہی میں رہتا لیکن کہیں اور بستا تھا۔ وہ اُنہی کے درمیان اُٹھتا بیٹھتا لیکن کسی اور حلقے کا محفل نشیں تھا۔ سو جب اُس نے کہا کہ میں اللہ کا نبی ﷺ ہوں تو فطرتِ سلیم رکھنے والے اُس کے قافلے میں شریک ہو گئے اور کفر وشرک کی زنجیروں میں جکڑے ہوؤں نے اُس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ لیکن وہ بھی، اُس کی چالیس سالہ پاکباز زندگی سے کوئی ایک بھی کمزور لمحہ تلاش نہ کر سکے۔

اُس نے کہا اے لوگو! صرف اللہ ہی تمہارا رب ہے۔ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، کسی کو معبود نہ بناؤ۔ اللہ کے نزدیک کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ کسی گورے کو کسی کالے اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ آؤ......! اُس کے حضور جھک جاؤ اور سارے مصنوعی خداؤں کی بندگی سے آزاد ہو جاؤ۔''

اُس کا پیغام روشنی کی لکیر بن کر سینۂ شب میں اُترتا چلا گیا۔ وہ محض واعظ نہ تھا کہ خیر و شر کی نشاندہی کر دینے کے بعد مطمئن ہو جاتا۔ وہ محض تعلیم و تلقین کرنے والا معلم نہ تھا۔ وہ ایک انقلاب عظیم کا نقیب تھا۔ سو کوئی مشکل، کوئی مصیبت، کوئی آزمائش، کوئی ترغیب اُس کا راستہ نہ روک سکی۔ نہ شعب ابی طالب کے فاقے، نہ طائف کی گلیوں کے پتھر، نہ کفارِ مکہ کی پُرکشش، پیشکشیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے پیغامِ حق کو اپنی ذاتِ اقدس پر نافذ کیا۔ اپنے سیرت و کردار کو اسلام کے انسان مطلوب کے مثالی سانچے میں ڈھالا۔ لوگوں کے سامنے اللہ کا کلام بھی رکھا اور اس کلام کا عملی نمونہ کامل بھی۔ محبت، دردمندی، غم گساری اور ہمدردی آپ کے اندازِ تبلیغ کے بنیادی اجزا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ ہی کے حکم پر ایک مقصدِ اولیٰ کے لیے ہجرت کا راستہ اختیار کیا۔ لیکن جب اہلِ کفر معرکہ آرائی اور تلوار زنی پر تُل گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لشکروں، اُن کے اُونٹوں، اُن کے گھوڑوں، اُن کی تلواروں، اُن کے نیزوں اور اُن کے سامانِ حرب کو نہ دیکھا۔ ایک نوخیز اسلامی ریاست کی جغرافیائی حدود کے تحفظ اور اس سے بھی بڑھ کر اسلامی انقلاب کے بطن سے پھوٹنے والے نظامِ حق کی بقا کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم جہاد بلند کیا اور ایک نئی تاریخ عزم کا دیباچہ رقم کیا۔ بدر سے حنین تک داستان جہاد کی نوعیت صرف اپنا دفاع اور پیغامِ حق کی سربلندی تھی۔ شوقِ شہادت سے سرشار قافلۂ حق کے مسافران سخت کوش کا مطلوب و مقصود نہ مالِ غنیمت تھا، نہ کشور کشائی، صرف شہادت تھی۔

ایک عشرے سے بھی قلیل عرصہ میں انقلاب اسلامی عظیم کامیابی سے ہم کنار ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ وہ رحمت دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو دہشت گردی کے تصور سے جوڑنے کی ناپاک جسارت کرتے اور مکروہ خاکے شائع کرتے ہیں۔ ظلم، تشدد، نفرت، انسانیت کشی اور سفاکی کے ان پرستاروں کو شاید معلوم نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں لڑی جانے والی ساری جنگوں میں صرف ''1014'' افراد کی جانیں گئیں۔ مسلمان شہدا کی تعداد 225 اور ہلاک ہونے والے کفار کی تعداد 759 تھی۔ تمام جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے قیدیوں کی کل تعداد ''6564'' تھی۔ ان میں 6347 رہا کر دیئے گئے۔ صرف دو کو اُن کے جرائم کے باعث موت کی سزا ہوئی۔ 215 کے بارے میں گمان ہے کہ وہ اسلام لا کر مسلم معاشرے کا حصہ بن گئے۔ کارٹون چھاپنے والوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرنے والوں کے ناگاساکی اور ہیروشیما کو بھول جایئے کہ وہ کہانی پرانی ہو چلی، گزشتہ تین

برسوں میں شہنشاہ عالم پناہ صرف عراق میں دولاکھ انسانوں کا لہو پی چکا ہے۔جنگی قیدیوں سے اُس کے سلوک کی کہانیاں سفا کی و درندگی کو بھی شرمارہی ہیں۔

"لااله الا اللہ" محمد عربی ﷺ کے پیغام کا خلاصہ ہے اور علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الہ الا
لغت غریب، جب تلک ترا دل نہ دے گواہی

ہم مصنوعی خداؤں کے خوف سے کپکپارہے ہیں کیوں کہ ہمارادل ہماری زبان کی گواہی نہیں دے رہا۔

12 ربیع الاوّل ایک انقلاب عظیم، ایک عہدنو کی سالگرہ کا دن ہے۔ اپنے آپ کو پھر سے محمد عربی ﷺ کے پیغام سے جوڑنے کا دن۔لیکن گزرجانے والے ایسے لاتعداددنوں کی طرح ہم آج کا دن بھی کانفرنسوں،سیمیناروں،جلسوں،جلوسوں،نعروں،تقریبوں،جھنڈوں،جھنڈیوں،چراغوں اورسبیلوں میں گزاردیں گے اورزمانوں اور جہانوں کی تقدیربدل ڈالنے والے دن کی حقیقی رُوح،ہماری رُوحوں میں ہلکاساارتعاش پیدا کیے بغیرچپ چاپ اُفقِ مغرب میں غروب ہوجائے گی۔

کوئی محرومی سی محرومی ہے!

[11-04-2006]

# یہ گمشدگاں!!

سعودیہ کی فلائٹ SV723 رات سوا آٹھ بجے ریاض پہنچی تو ہوا کے ایک مانوس سے جھونکے نے استقبال کیا۔ اگر یہ پرواز مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ جارہی ہوتی تو شاید دل کی ساری بستی میں چراغاں سا ہورہا ہوتا لیکن ریاض جاتے ہوئے کم وبیش چار گھنٹوں تک میری سوچ اُن گم شدگان کی یادوں سے اُلجھی رہی جن کے ورثا سالوں اور مہینوں سے در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور انہیں کوئی بتانے والا نہیں کہ اُن کے پیارے ایسی کون سی بستیوں کو نکل گئے جن کا کوئی نام ہے اور نہ جن کی طرف کوئی راستہ جاتا ہے۔ کس جادوگر کے کون سے سحر نے انہیں پتھر کردیا؟

کیا صدر پرویز مشرف بھی اصل صورت حال سے آگاہ نہیں؟ کیا انہوں نے یقین کرلیا ہے کہ یکا یک اپنے گھروں، اپنے دفتروں، مسجدوں یا گلی کوچوں سے اُٹھا لیے جانے والے یہ سارے لوگ جہاد کرنے چلے گئے ہیں؟ کیا انہوں نے باور کرلیا ہے کہ اس کھیل میں کسی ریاستی ایجنسی کا کوئی کردار نہیں؟ بظاہر صدر پرویز مشرف کو پاکستان کا سب سے باخبر انسان ہونا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ وہ ریاست کے سب سے بلند منصب پر فائز ہیں اور اس لیے بھی کہ تمام فوجی اور سول ایجنسیاں اُن کی مٹھی میں ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ صورت حال کے تمام پہلوؤں سے آگاہ نہ ہوں۔ لیکن اُن کی اس بات پر یقین کرنا بھی آسان نہیں کہ سارے گم شدہ لوگ جہادی تنظیموں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں یا وہ اپنی مرضی سے جہاد کرنے نکل گئے ہیں۔

26 مارچ کو لیاقت باغ میں جو کچھ ہوا، اُس کا مشاہدہ پورے پاکستان نے کیا۔ اپنے گم شدہ عزیز کے لیے فریاد کرتی خاتون دوبار صدر کے قدموں میں گرگئی اور اُن کے پاؤں چھو لیے۔ اُس نے روتے بلبلاتے ہوئے ہاتھ جوڑے کہ اُس کے پیارے کی کوئی خبر دی جائے۔ صدر نے دلاسا دیا۔ سر پر ہاتھ رکھا۔ وعدہ کیا کہ وہ اُس کے گمشدہ عزیز کی تلاش میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے لیکن ساتھ ہی انہوں نے ایک بار پھر اپنا یہ مؤقف دہرایا کہ حکومت یا کسی سرکاری ایجنسی کا گم ہوجانے والے افراد سے کوئی تعلق نہیں۔ اُن کا کہنا تھا ''یہ سب جہادی تنظیموں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ پتا نہیں یہ جہاد کرنے کشمیر چلے گئے ہیں یا افغانستان یا عراق۔ ہم اس طرح لوگوں کو غائب کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔''

حقیقت یہ ہے کہ صدر کا مؤقف کلی طور پر درست نہیں۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ دو چار افراد واقعی جہاد کے لیے نکل گئے ہوں لیکن اس صورت میں اُن کے عزیز واقارب طویل عرصے تک بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر کوئی نوجوان اس مقصد کے لیے گھر سے نکلا ہے تو اُس نے پہلی فرصت میں اپنے والدین

یا اہلِ خانہ کو باخبر کر دیا ہوگا۔ جہاد کی تڑپ اور شہادت کی اُمنگ رکھنے والے گھرانے تو بصد افتخار اپنے بچوں کو رُخصت کرتے ہیں۔ وہ قطعاً یہ نہیں کہتے کہ اُن کا فرزند کسی ایجنسی نے اُٹھالیا ہے۔ غائب کر دیئے جانے والے سینکڑوں افراد کا پس منظر مختلف ہے۔ ان میں سائنس دان بھی ہیں، انجینئر بھی، کمپیوٹر کے ماہرین بھی، ڈاکٹرز بھی، دینی گھرانوں کے افراد بھی، فوجی بھی اور وہ بھی جنہیں نہ جانے کون سا حساب چکانے کے لیے غائب کر دیا گیا۔ ان میں بلوچستان اور سندھ سے تعلق رکھنے والے لاتعداد نوجوان اور سیاسی کارکن بھی ہیں جنہیں بگٹی کے قتل اور عمومی شورش کے تناظر میں اُٹھا کر غائب کر دیا گیا۔ یہ تو لبرل قوم پرست سوچ کے حامل لوگ ہیں جن کا کسی جہاد سے کوئی تعلق ہے نہ جہادی تنظیم سے۔

صدر یہ بھی جانتے ہیں کہ 1980ء کی دہائی جہادی سرگرمیوں کے عروج کا دور تھا۔ اس جہادی عشرے میں ہزاروں پاکستانیوں نے جہاد افغانستان میں سرگرم حصہ لیا لیکن کہیں سے یہ آواز نہ اُٹھی کہ اُس کا شوہر، بیٹا یا بھائی لاپتہ ہوگیا ہے۔ جہاد افغانستان کے خاتمے کے ساتھ ہی جہاد کشمیر کی لو تیز ہوگئی۔ یہی وہ دور تھا جب جہادی تنظیموں نے بال و پر نکالے۔ لیکن کبھی یہ شور نہ اُٹھا کہ ہمارے بچے غائب ہو رہے ہیں۔ 12 اکتوبر 1999ء کے بعد سیاسی بنیادوں پر لوگوں کو گھروں سے اُٹھانے اور کئی کئی دن کے لیے غائب کر دینے کی روایت چلی۔ کبھی نیب کے نام پر، کبھی تحقیق و تفتیش کے نام پر اور کبھی نامطلوب سیاست دانوں کے خلاف شواہد کے نام پر بیسیوں افراد کو اُٹھا کر تہ خانوں میں ڈال دیا گیا اور ایسا کرتے ہوئے کوئی قانونی تقاضا پورا نہ کیا۔ برادرم صدیق الفاروق کو تو کسی ایسی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا جس کی چابی ہی گم ہوگئی۔ کئی ماہ بعد جب معاملہ عدالت میں پہنچا تو نیب کے وکیل کی طرف سے یہ تاریخ ساز جواب آیا کہ ''جی ہاں ہم نے اُسے پکڑ کر کہیں ڈالا تو تھا لیکن پھر بھول گئے۔'' جب کبھی کامل تین سال تک بغیر ایف آئی آر، بغیر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیے، بغیر کوئی ریمانڈ لیے، بغیر کسی قانونی کارروائی کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد کو خفیہ حراست گاہوں میں ڈالے رکھنے کی مکمل رُوداد سامنے آئی اُس دن اندازہ ہوگا کہ اکتوبر کا انقلاب عظیم کیا کچھ دے گیا اور ''حقیقی جمہوریت'' کا اصل چہرہ کیا ہے؟

پھر نائن الیون کی شب سیاہ نے دامن پھیلایا۔ قصر سفید سے ایک فون کال آئی۔ پاکستان نے اعلان کیا کہ وہ ''دہشت گردی'' کے خلاف جارج ڈبلیو بش کے کروسیڈ کا دل و جان سے ساتھ دے گا۔ یہ اعلان حکمرانوں کے لیے انسانی حقوق سے کھیلنے کا اجازت نامہ بن گیا۔ ایف بی آئی خود یہاں آ بیٹھی، مشترکہ آپریشن ہونے لگے، ایجنسیاں بے مہار ہوگئیں، لوگ گھروں سے اُٹھائے جانے لگے، جو کوئی طالبان کے عہد میں افغانستان گیا تھا، دہشت گرد ٹھہرا۔ خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر فلاحی اور رفاہی کام کرنے والوں کو بھی نشانے پہ دھر لیا گیا۔ ان میں ڈاکٹر عامر عزیز جیسا انسان دوست بھی شامل تھا جس کا قصور صرف یہ تھا کبھی اُس نے اُسامہ بن لادن کا علاج کیا تھا۔ کتنے ہی نوجوان مہینوں عقوبت خانوں

میں پڑے رہے۔ کچھ کسی رات عین اُسی انداز میں گھر آ گئے جس طرح اُٹھائے گئے تھے۔ کچھ ابھی تک کال کوٹھڑیوں میں گل سڑ رہے ہیں۔ لوگوں کو اُٹھانے اور چشم زدن میں غائب کر دینے کی وارداتوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تازہ ترین واقعہ اٹک کے اُس خداترس ڈاکٹر کا ہے جسے دن دہاڑے ایک ہسپتال سے باہر نکلتے ہوئے اٹھالیا گیا اور جسے اٹک کے لوگ فرشتہ صفت انسان کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اپنے گمشدہ شوہر کی تلاش کو تمام گمشدگان کی تلاش کے عظیم مشن میں بدل کر ایک تحریک کی بنیاد رکھنے والی دلیر، بہادر اور پُرعزم خاتون آمنہ مسعود جنجوعہ مسلسل دہائی دے رہی ہے لیکن آج تک صدر یا وزیراعظم نے اُسے ملاقات کا وقت تک نہیں دیا۔ آمنہ مسعود جنجوعہ کے ساتھ گمشدگان کے لیے آواز اُٹھانے والے خالد خواجہ کو صبح دم اُس وقت گلی سے اُٹھالیا گیا جب وہ فجر کی نماز پڑھنے جا رہے تھے۔

غیر فعال کر دیئے جانے والے چیف جسٹس نے ازخود اس معاملے کا نوٹس لیا۔ آمنہ جنجوعہ کی درخواست بھی آ گئی۔ انسانی حقوق کمیشن کی طرف سے ایڈووکیٹ حشمت حبیب بھی سرگرم ہو گئے۔ آخری تاریخ سماعت پر جسٹس افتخار محمد چودھری نے کہا تھا کہ ''گم شدہ افراد کا پتا چلانا حکومت کا فرض ہے۔ کیا وہ اُس وقت جاگے گی جب احتجاج کرنے والے لواحقین کمرۂ عدالت کے اندر آ کر نعرے لگائیں گے؟'' جسٹس چودھری غیر فعال بنا دیئے گئے لیکن گم شدہ افراد بدستور گم شدہ ہیں اور مقدمہ ہنوز عدالت میں ہے۔ گزشتہ پیشی پر سینئر ترین جج مسٹر جسٹس جاوید اقبال نے کہا کہ ''ممکن ہے ایجنسیاں کسی وزارت کے سامنے جواب دہ نہ ہوں لیکن وہ اس عدالت کے سامنے ضرور جواب دہ ہیں۔ اس معاملے کو حل کیا جائے گا چاہے ہمیں روزانہ کی بنیاد پر سماعت کرنا پڑے۔'' ایڈووکیٹ حشمت حبیب نے عدالت سے کہا کہ حقائق کا پتا چلانے کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن بٹھایا جائے۔ جسٹس جاوید اقبال نے کہا ''کمیشن بھی بٹھایا جا سکتا ہے۔''

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جناب صدر کی معلومات درست نہیں۔ یہ معاملہ تو پچھلے کئی برس سے موضوع بنا ہوا ہے اور غمزدہ خاندان فریاد کر رہے ہیں۔ اب اچانک یہ دلیل آ گئی ہے کہ ''وہ جہاد کرنے چلے گئے ہیں۔'' کیا یہ ممکن نہیں کہ صدر مملکت خود نیک نام جج صاحبان، انسانی حقوق کے پرچم برداروں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں پر مشتمل کمیشن تشکیل دیں۔ یہ کمیشن صرف اتنا کرے کہ اب تک رہائی پانے والوں کو بلالے اور جان کی امان دے کر پوچھے ''تم کہاں تھے؟'' وہ خود بتا دیں گے کہ کس محاذ پر سرگرم جہاد تھے اور باقی گمشدگان کن ''مورچوں'' میں پڑے ہیں۔

ریاض کی ہواؤں میں گمشدگان کی یاد نے تلخی سے بھر دی اور ذہن بے ربط سوچوں میں اُلجھ کر رہ گیا

[31-03-2007]

---

# استحکامِ پاکستان

سعودی عرب کے دارالحکومت، ریاض آنے کا یہ چوتھا موقع ہے۔ اس شہرِ خوش جمال کی عمر اسلام آباد ہی کے لگ بھگ ہے لیکن یہ کہیں زیادہ بارونق، کہیں زیادہ بھرا پُرا اور کہیں زیادہ مصروف ہے۔ اسے دنیا کے اُن دو تین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے جو انتہائی تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہیں۔ عرب سربراہوں کی انیسویں کانفرنس گزشتہ روز ہی ختم ہوئی ہے اور شہر ابھی تک خیر مقدمی بینروں اور رنگارنگ پرچموں سے سجا ہوا ہے۔ اخبارات ''اعلانِ ریاض'' کی تفصیلات اور تبصروں سے بھرے پڑے ہیں۔ سعودی عرب کے فرمان روا شاہ عبداللہ کے خطاب کا چرچا ہے۔ خادم الحرمین شریفین نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا ''اصل قصور ہمارا اپنا ہے۔ عرب قوم کے لیڈروں کا ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جو درپیش مسائل کا سامنا نہیں کر سکے۔ یہ ہم ہی ہیں جو متحد نہ ہو سکے۔ ہمارے اس طرزِ عمل نے ہماری ساکھ اور ہمارے اعتماد کو مجروح کیا۔ ہمیں مایوس و نااُمید کر دیا۔'' اپنی مختصر لیکن انتہائی زوردار تقریر میں انہوں نے عرب رہنماؤں سے اپیل کی کہ وہ اپنی ناکامیوں کے محرکات کو سمجھیں، اپنے اندر اتحاد پیدا کریں اور دلیرانہ لیکن قابلِ عمل فیصلے کریں۔ یہ سوال بہرحال اپنی جگہ موجود ہے کہ کیا ''اعلانِ ریاض'' بھی اعلانات کی اُس گیلری میں سجا دیا جائے گا جس کے درو دیوار پر ایسے بیسیوں اعلانات طلائی اور نقرئی فریموں میں جڑے اپنے نوحے پڑھ رہے ہیں یا عرب رہنما واقعی متحد ہو کر دلیرانہ اور قابلِ عمل حکمت عملی وضع کر سکیں گے؟

یہاں آئے کوئی 36 گھنٹے ہو چلے ہیں اور اس دوران رات کے تین چار گھنٹوں کے آرام کے سوا میں مسلسل نہایت ہی پُر جوش، دردمند اور محبت کرنے والے پاکستانیوں کے حصار میں ہوں۔ اُن کے سوالات ختم ہونے میں نہیں آ رہے اور میں بے آب و رنگ سی کہانی بیان کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ برسوں سے یہاں مقیم پاکستانی نہ صرف سعودی عرب کی تعمیر و ترقی میں گراں قدر کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ پاکستان کی معیشت کی اُستواری میں بھی اُن کا حصہ خاصا نمایاں ہے۔ سمندر پار پاکستانیوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ عمر کہیں بھی گزاریں زندگی پاکستان ہی میں بسر کرتے ہیں۔ بھرپور محنت، مشقت، تگ و دو اور جدوجہد کے باوجود وہ پاکستان کو بھلا نہیں پاتے۔ انہیں یہ خیال ہمیشہ بے کل رکھتا ہے کہ ایٹمی قوت بن جانے کے بعد بھی پاکستان بے بس و لاچار سا کیوں ہے۔ ارضِ وطن کے شب و روز تبدیل کیوں نہیں ہو رہے اور موسم ٹھہر سے کیوں گئے ہیں؟

''مجلس پاکستان'' یہاں بسنے والے پاکستانیوں کی محترم تنظیم ہے۔ اسلام، نظریۂ پاکستان اور اپنی تہذیبی اقدار و روایات سے گہری وابستگی رکھنے والے یہ پاکستانی، اپنے وطن کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے

تقریبات کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ 30مارچ کو پاکستانی سفارت خانے کے ہال میں منعقد کی جانے والی تقریب کا حوالہ 23مارچ ''یوم پاکستان'' تھا۔ مجلس پاکستان کے صدر رانا عبدالرؤف اور سیکرٹری جنرل حافظ عبدالوحید کی طرف سے اس تقریب میں شرکت کی دعوت ملی تو میں برطانیہ کے لیے رخت سفر باندھ رہا تھا۔ دیارِ حجاز کی طرف سے ملنے والی کسی دعوت کو میں کسی اور ''میزبان'' کی نگاہِ لطف و کرم سے تعبیر کیا کرتا ہوں اور انکار یا معذرت کے تصور ہی سے دل لرز جاتا ہے۔ 28مارچ کو مانچسٹر سے واپسی ہوئی اور 29مارچ کو میں ریاض آ گیا۔

سفیر پاکستان جناب شاہد کریم اللہ کی عدم موجودگی میں جناب فرید فرح قائم مقام سفیر کی حیثیت سے تقریب میں اُن کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ابتدائی تقاریر کے دوران ہی حاضرین کی طرف سے چٹوں کی بھرمار ہوگئی۔ مسجدِ حفصہؓ، ٹانک، جسٹس افتخار محمد چودھری، وکلا کی تحریک، سیاسی جماعتوں کا کردار، ڈاکٹر قدیر خان، جلاوطنوں کی واپسی، کشمیر، دینی مدارس، رانا بھگوان داس اور نہ جانے کیا کیا لیکن معاملہ نازک تھا۔ تقریب سفارت خانے میں منعقد ہو رہی تھی۔ قائم مقام سفیر محترم تشریف فرما تھے۔ میں نے ابتدا ہی میں واضح کر دیا کہ بہت سی باتیں اَن کہی رہ جائیں گی کیوں کہ سفارت خانے میں منعقد ہونے والی تقریب اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تقریباً پانچ سو کے مجمع نے اسے پسند نہ کیا۔ ایک صاحب نے کہا ''ہم حق اور سچ سننے آئے ہیں اور ہمیں بتائیں کہ پاکستان کس حال میں ہے؟''

میں انہیں کیا بتاتا کہ پاکستان کس حال میں ہے؟ دل تو چاہتا ہے کہ جب بھی پاکستان سے دُور بیٹھے پاکستانیوں سے ملنے جاؤں تو ڈھیر ساری خوشخبریوں کی پوٹلی میری بغل میں ہو اور جب وہ حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں اور پوچھیں کہ ''او دیس سے آنے والے بتا......'' تو میں وہ پوٹلی کھول کر ایک ایک خوشخبری یوں پیش کرتا چلا جاؤں جیسے دُور کے سفر سے آنے والا اپنے بچوں کے لیے خوبصورت تحفے لے کے آتا ہے لیکن فریب سے بڑا گناہ شاید ہی کوئی ہو اور اُن لوگوں کو فریب دینا تو گناہ عظیم ہے جو ضرورتوں اور مجبوریوں میں بندھے، وطن سے کوسوں دُور بیٹھے ہیں اور جو جھوٹی تسلیوں کی نہیں سچ کی پیاس رکھتے ہیں۔ تقریب کا موضوع تھا ''وقت کی پکار...... استحکام''۔ میں نے عرض کیا کہ پاکستان کے استحکام کے بنیادی اجزائے ترکیبی میں اسلام اور نظریۂ پاکستان، اتحاد و یکجہتی پر مبنی قومی تفاخر، آئین اور جمہوریت کی کارفرمائی، مضبوط دفاع، معاشی اقتصادی اُستواری اور قومی تقاضوں سے ہم آہنگ حکیمانہ خارجہ پالیسی جیسے عناصر شامل ہیں۔ ایک ایک کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو کوئی ایسی دلکش تصویر نہیں اُبھرتی جو تسکین و آسودگی کا باعث ہو۔ اسلام اور نظریۂ پاکستان ابتدائے سفر میں ہی راستوں کی دُھول ہو گئے۔ ہم نے ایسا تعلیمی ڈھانچہ تیار ہی نہیں کیا کہ جو نسلِ نو کو اسلامی نظریاتی تشخص عطا کرتا۔ جو اہل پاکستان کو اُس فکر کے ساتھ جوڑے رکھتا جس کی کوکھ سے پاکستان نے جنم لیا تھا۔ اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے والی آب و ہوا تخلیق ہی نہ ہو سکی۔ آتے جاتے حکمرانوں نے پاکستانیوں کو آپس میں جوڑنے، پاکستانیت کا احساس اُبھارنے اور مشترکہ مقاصد کے

لیے آہن وفولاد بنا کر برسرِ کار لانے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس کے برعکس سامراجی فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے تقسیم کی لکیریں ڈالی گئیں، نفرتوں کے بیج بوئے گئے کہ عوام یک جان ہو کر خطرہ نہ بن جائیں۔ آئین کی بالادستی اور جمہوریت کی کارفرمائی کی ساٹھ سالہ تاریخ رُسوائیوں اور جگ ہنسائیوں سے اٹی پڑی ہے۔ تبصرے، تجزیے، نکتہ تراشی اور موشگافی سے قطع نظر سامنے کی حقیقت یہ ہے کہ ساٹھ سالوں میں سے 32 برس چار جرنیلوں کے حصے میں آئے ہیں اور باقی کے 28 سال بھی انہی کے مدار میں گردش کرتے رہے۔ آئین سے زیادہ بے بس و لاچار شے کوئی نہیں جس پر جابجا درد کے پیوند لگے ہیں۔ دفاع کے میدان میں ہم نے اچھی پیش رفت کی۔ ایٹم بم بنایا، میزائل ٹیکنالوجی کو فروغ دیا لیکن فوج کو سیاست میں اُلجھا دیا گیا۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ قومیں صرف ہتھیاروں سے توانا ہوتی ہیں نہ صرف ہتھیار ہی فصیل دفاع کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔ روس کے پاس آج بھی ساری دنیا کے ایٹمی ہتھیاروں سے زیادہ ایٹمی ہتھیار موجود ہیں لیکن اندرونی سرطان کے باعث وہ افغانوں کی ایک ہی ضرب سے پارہ پارہ ہو گیا۔ معاشی و اقتصادی اصلاحات کا غبارہ بھی پھٹنے کو ہے کہ غربت، مہنگائی اور بے روزگاری سے نڈھال عوام ان تذکروں کو اپنے زخموں پر نمک پاشی خیال کرتے ہیں۔ کشکول اپنی جگہ موجود ہے اور قرضوں کا حجم بڑھ رہا ہے۔ خارجہ پالیسی کے ثمرات شیریں کا حال یہ ہے کہ چار سُو لو ہے کے جنگلے لگ رہے ہیں، بارودی سرنگیں بچھ رہی ہیں اور دیواریں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ سو ''استحکامِ پاکستان'' سے تعلق رکھنے والے سارے اجزائے ترکیبی دلکش تصویر پیش نہیں کرتے۔ حل کیا ہے؟ صرف یہ کہ آئین کی پاس داری اور جمہوریت کی اُستواری سے ایک نئے سفر کا آغاز کیا جائے۔ 2007ء کے انتخابات صحیح معنوں میں آزادانہ و منصفانہ ہوں اور عوام پرو امریکہ، اینٹی امریکہ، ترقی، پسماندگی، پلوں، سڑکوں کی تعمیر اور ندی نالوں کے آشوب سے آزاد ہو کر صرف اس نکتے پر ووٹ دیں کہ کون ہے جس نے کڑے وقت میں آمریت کی دہلیز پر سر نہ جھکایا اور کون ہے جو کسی خوف، مراعات یا مفادات کے لیے سورج مکھی کے کھیت کا حصہ بن گیا۔

عزت مآب قائم مقام سفیر کے لیے یہ باتیں ناگواری کا باعث بنیں کیوں کہ ہمارے سفارت کار اپنے وطن کے نہیں، حکمرانوں کے سفیر ہوتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ پاکستان سے باہر بیٹھا ہر شخص پاکستان کا سفیر ہے۔ انہوں نے اس تصویر کو محض ایک رُخ اور مایوسی کا نمونہ قرار دیا لیکن اپنی گفتگو میں وہ روشنی اور اُمید کی کوئی ایک کرن بھی نہ دے پائے جو تشنہ لب پاکستانی اپنے ساتھ لے جاتے۔ سامعین میں سے بعض لوگ مشتعل تھے لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ ایسے لوگوں کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ کل منظر بدلا تو ان کی گفتگو کا رنگ و آہنگ بھی بدل جائے گا۔

[01-04-2007]

---

# دارالسلام

کوئی پاکستانی ریاض آئے اور اُسے ''دارالسلام'' دیکھنے اور عبدالمالک مجاہد نامی شخص سے ملنے کا موقع نہ ملے تو اسے یقیناً محرومی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ابھی میں اسلام آباد سے ریاض کے لیے رخت سفر باندھ ہی رہا تھا کہ مجاہد صاحب کا فون آیا۔ ''پتا چلا ہے آپ مجلس پاکستان کی دعوت پر ریاض آرہے ہیں۔تھوڑا سا وقت دارالسلام کے لیے بھی ضرور نکالیئے گا۔'' مجھے قدرے حیرت ہوئی۔عبدالمالک مجاہد کو یہ گمان ہی کیسے گزرا کہ میں ریاض آؤں گا اور دارالسلام میں حاضری دیئے یا اُن سے ملے بغیر ہی چلا جاؤں گا؟ شاید انہیں اندازہ نہیں کہ مجھے اس عظیم الشان اشاعتی ادارے سے کتنا عشق ہے اور میں ایک جنوں شعار شخص کے ذوق بادیہ پیمائی کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سن کر رُوح کی گہرائیوں تک اُتر جانے والی کیسی آسودگی محسوس کرتا ہوں۔

سولہ سال قبل ریاض سے اپنا سفر آغاز کرنے والا یہ طباعتی ادارہ بلاشبہ ایک عظیم مرکز بن چکا ہے جو اسلامی کتب کی طباعت و اشاعت میں نت نئے تجربوں کے ساتھ منظم انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ریاستوں اور بڑی بڑی جامعات کے کرنے کا کام تھا جس کا بیڑا عبدالمالک مجاہد نے اُٹھایا اور پھر رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھلتے ہی چلے گئے۔کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ دارالسلام کم و بیش ایک ہزار اسلامی کتب، دنیا کی 15 مختلف زبانوں میں شائع کرچکا ہے اوران کے لاکھوں نسخے ہر سال طبع ہورہے ہیں؟ قرآن پاک کے 13 زبانوں اُردو، انگریزی، فرنچ ، ہسپانوی ، پشتو، ترکی، البانی،ہندی ،بنگالی ، فلپینی ، ملیباری، انڈونیشی اور روسی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔فارسی، تامل، سنہالی،سواحلی، یوربا اور نیپالی زبانوں کے تراجم اس سال کے اختتام تک مکمل ہوجائیں گے۔چینی اور جرمن زبانوں میں تراجم کے لیے ماہرین کا انتخاب ہو چکا ہے اور کام شروع ہونے کو ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میراٹھی اور گجراتی کے تراجم زیرِغور ہیں۔ دارالسلام کا منصوبہ ہے کہ آئندہ پانچ سالوں کے اندر کرۂ ارضی کے کسی بھی گوشے میں بولی جانے والی ہر زندہ زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ موجود ہوگا۔

عبدالمالک مجاہد اپنے علمی منصوبوں کے لیے مردانِ کار کی تلاش میں نگر نگر گھومتے رہتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے مختلف ممالک میں اُن کا ایک مربوط نیٹ ورک کام کررہا ہے۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، ملائیشیا، ہانگ کانگ، سنگاپور، سری لنکا، مالدیپ، بھارت، متحدہ عرب امارات، عمان، قطر، کویت، بحرین، یمن، شام، لبنان، اُردن، مصر، سوڈان، جنوبی افریقہ، انگلینڈ، ڈنمارک، فرانس، بیلجیئم، ترکی، ہالینڈ، سپین،

امریکہ، کینیڈا، کوریا، ایران، اٹلی، بنگلہ دیش، مراکش اور الجزائر میں دارالسلام کی برانچیں یا اس کے ایجنٹ موجود ہیں۔ دارالسلام کا سب سے بڑا نیٹ ورک خود سعودی عرب میں ہے۔ ریاض میں تین بڑے شورومز کام کر رہے ہیں۔ الخبر، جدہ اور مدینہ منورہ میں بھی بڑے شورومز موجود ہیں۔ مکہ مکرمہ، ینبوع، خمیس، مشیط اور القسیم میں بھی برانچیں کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں لاہور میں تین شورومز کے علاوہ کراچی، اسلام آباد اور حافظ آباد میں بڑے مراکز موجود ہیں۔ آئندہ ایک سال کے اندر اندر فیصل آباد، ملتان، سیالکوٹ، کوئٹہ، حیدرآباد اور مظفر آباد میں بھی برانچیں قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔

اب کے میں دارالسلام گیا تو عبدالمالک مجاہد نے چند نئی کتابیں دکھائیں۔ یہ کتابیں دارالسلام کی روایت کے مطابق نہایت ہی خوبصورت اور معیاری طباعت کا حسین نمونہ تھیں۔ میں نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پوچھا کہ یہ کہاں طبع ہوئی ہے؟ مجاہد صاحب مسکرائے اور بولے ''اندازہ لگایئے۔'' مجھے معلوم تھا کہ دارالسلام کی کتب پاکستان، سعودی عرب، اٹلی اور بیروت سے طبع ہو رہی ہیں۔ گمان گزرا کہ شاید یہ کتب بیروت سے چھپی ہوں گی لیکن عبدالمالک مجاہد نے انکشاف کیا کہ یہ کتابیں چین میں طبع ہوئی ہیں اور اب چین بھی ہمارے لیے ایک بڑا اشاعت گھر بن گیا ہے۔ پھر انہوں نے دلوں کے تار چھیڑنے والی ایک کہانی سنائی۔

''شنگھائی سے کوئی اڑھائی سو کلومیٹر دور ننگو کے مقام پر ہر سال دو بڑے میلے لگتے ہیں۔ ان میلوں میں آپ کو دنیا کی ہر شے ملے گی۔ طباعتی کمپنیاں بھی بڑے بڑے سٹال لگاتی ہیں۔ یہ کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ میں بھی اس میلے میں گیا تاکہ طباعتی اداروں کا جائزہ لے سکوں۔ وہاں میری ملاقات لیو پول نامی ایک چینی سے ہوئی جو ایک ادارے سے وابستہ تھا۔ یہ ایک بڑا ہی نفیس شخص تھا۔ نہایت ہی کھرا اور ایمان دار۔ اپنے والدین کا بے حد احترام کرنے والا۔ میں نے اُس سے کاروباری معلومات حاصل کیں۔ پھر اُس سے تعلق بڑھتا چلا گیا۔ میں اُس کی نیک طبعی کو دیکھتے ہوئے اکثر اُسے اسلام کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ یہ رمضان المبارک کے مہینے کا ذکر ہے میں اور لیو پول اکٹھے سفر میں تھے اور بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ جس ہوٹل میں ٹھہرے اُس کے ہیٹر بھی منجمد ہو چکے تھے۔ صبح دم اُٹھے تو لیو پول میرے پاس آ بیٹھا بولا۔ ''میں بہت عرصے سے سوچ رہا تھا لیکن رات میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔'' میں نے اُٹھ کر اُسے گلے لگا لیا۔ اُسے کلمہ پڑھایا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک چینی کے لیے عربی الفاظ کی ادائیگی کتنی مشکل ہوگی۔ لیکن وہ عجیب سرشاری سے بار بار میرے ساتھ کلمہ طیبہ کے الفاظ دوہرا رہا تھا اور اُس کے چہرے پر کئی رنگ بکھر رہے تھے۔ اس کے بعد سے وہ یونس پول بن گیا۔ اب یونس پول چین میں دارالسلام کی کتابوں کی طباعت کے مشن میں مصروف ہے۔ بیجنگ سے کوئی ایک ہزار میل دور، تبت کے پہاڑوں کی آغوش میں لنجو کے مقام پر ایک اور چینی، دارالسلام کے

لیے مختلف دینی کتب کے چینی تراجم میں مصروف ہے۔ محمد سلیمان حسینی کو اسلام کی تڑپ مدینہ منورہ لے آئی تھی جہاں اُس نے مدینہ یونیورسٹی سے کسبِ فیض کیا اور پھر چین میں دارالسلام کا ''سفیر'' بن گیا۔ محمد سلیمان ایک آسودہ حال شخص ہے۔ وہ لنجو کے گردونواح میں 130 مساجد تعمیر کراچکا ہے اور ''معہد الحرمین'' کے نام سے ایک دینی مدرسہ چلا رہا ہے۔

عبدالمالک مجاہد نے مجھے نئے منصوبوں کے بارے میں بتایا کہ اس وقت حدیث کی چھ کتابوں صحاح ستہ کے اُردو اور انگریزی تراجم کا کام تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کا اُردو ترجمہ کم وبیش 25 جلدوں میں شائع ہو رہا ہے جب کہ انگریزی ترجمہ 30 جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ جید علمائے کرام کی ایک ٹیم نے ہر حدیث کے استخراج کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ اس کا پس منظر یا درجہ کیا ہے۔ اِسی طرح ہر حدیث کی مختصر تشریح و وضاحت بھی موجود ہے۔ دارالسلام کی طبع کردہ اٹلس قرآن اور اٹلس سیرت نبوی ﷺ کمال کی چیزیں ہیں۔ اب مصر میں شائع شدہ ایک اور نادر اور انتہائی اہم کتاب ''اٹلس فتوحاتِ اسلامیہ'' کے تراجم اور اشاعت کے حقوق حاصل کیے جا رہے ہیں۔ اس کتاب میں عہد اسلامی کی تمام فتوحات کی تفصیلات و جزئیات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ معروف مبلغ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بھی اپنے لیکچرز کی اشاعت کے حقوق دارالسلام کو دے دیئے ہیں۔ اب تک ان لیکچرز کی اُردو اور انگریزی زبانوں میں ایک سو کے لگ بھگ سی ڈیز تیار کی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی معروف کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' کے اُردو، بنگالی اور فلپینی تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ ''اسلام پر 40 اعتراضات کے عقلی و نقلی جواب'' حال ہی میں طبع ہوئی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے مدلل اور مؤثر انداز میں ذہنوں میں اُٹھنے والے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے۔ جلد ہی ان کے لیکچرز کتابی شکل میں بھی سامنے آرہے ہیں۔

دارالسلام نے جدید فنی و سائنسی ایجادات کو بھی بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے۔ ''ڈیجیٹل قرآن'' کمال کی شے ہے۔ چھوٹی سی ڈبیا کے چار پانچ بٹن دبا کر آپ کوئی بھی سورہ، کوئی بھی آیت، کئی زبانوں کے ترجمے کے ساتھ سُن سکتے ہیں۔ بچوں کے لیے الیکٹرانک تعلیمی کھلونوں کا سلسلہ ''بابا سلام'' ساری دنیا میں جگہ بنا چکا ہے۔ ایک گھنٹہ دومنٹ کی خوبصورت فلم ''آپ کو کیوں مسلمان ہونا چاہیے؟'' "Why you should be a Muslim?" نہایت ہی مؤثر تبلیغی کشش رکھتی ہے۔

دارالسلام کے مرکزی دفتر سے نکلتے ہوئے میرا دل اس ادارے، عبدالمالک مجاہد اور اُن کے پُرعزم رُفقائے کار کے لیے دُعاؤں سے چھلک رہا تھا۔

[02-04-2007]

---

# شہرِ آرزو

جس روز پاکستان میں چار سُو نعت رسول ﷺ کے زمزمے پھوٹ رہے تھے اور فضائیں عشق محمد ﷺ کی خوشبو سے مہک رہی تھیں اور ایک نورانی سی دستک دلوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی، میں شہر جاناں میں تھا۔ وہی مدینہ منورہ، وہی مانوس سی ہوا، وہی جانے پہچانے سے نقوش، وہی ہمدم دیرینہ جیسی بو باس، وہی دل کے زخموں پر آسودگی کا مرہم سا لگاتی مہک، وہی ہجر کی تپتی دوپہر میں سر پہ ٹھنڈی چھاؤں جیسا سائبان، وہی ڈرے، سہمے، دھتکارے ہوؤں کو اپنی طرف بلاتی آغوشِ رحمت، وہی دہکتے ریگ زاروں پہ چھم چھم برستا ابر کرم، وہی دُور کی نگری سے آیا ایک تھکا ہارا مسافر...... جس کے ہاتھ خالی ہیں اور جو شہنشاہ کون ومکان ﷺ کے دربارِ اقدس میں پیش کرنے کے لیے کوئی سوغات نہیں لایا۔ میں کسی بھی چھوٹے بڑے سفر پہ نکلنے سے پہلے اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے اجازت طلب کرتا تھا۔ اب کے میں نے دیارِ حجاز کے لیے رخت سفر باندھا تو حسبِ معمول حاضری دی لیکن وہ گھر پر نہ تھیں۔ میں نے اُن کی قبر پہ جا کر فاتحہ پڑھی، پائتی بیٹھ کر اجازت چاہی۔ اُس دعا کی مدھم سی گونج میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی جو میری والدہ مجھے ہر سفر پر رُخصت کرنے سے پہلے دیا کرتی تھیں۔ میں یہ طے کر کے نکلا تھا کہ ریاض کی تقریبات سے فارغ ہو کر انشاء اللہ والدہ مرحومہ کی طرف سے عمرہ کروں گا۔ ریاض میں دن بھر اہل پاکستان کی بے کراں محبتیں مجھے شکنجے میں لیے رکھتیں۔ رات گئے جب میں تھکن سے چور اپنے ہوٹل کے کمرے میں آتا اور بتی بجھا کر سونے کی کوشش کرتا اور نیند دبے پاؤں میری آنکھوں میں اُترنے لگتی تو ایک کمزور سا ہاتھ میرے کندھے کو ہولے سے ہلاتے ہوئے پوچھتا...... "مدینہ کب چلنا ہے؟"

اُس دن پاکستان میں 12 ربیع الاوّل کا روزِ سعید تھا لیکن سعودی عرب میں 13 ربیع الاوّل کا سورج عین سر پر تھا جب ریاض سے اُڑنے والا طیارہ مدینہ کی فضاؤں میں پہنچا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ سبز گنبد کی کوئی جھلک دکھائی نہ دی۔ عام شہروں کا سا شہر، اُسی انداز کی چھوٹی بڑی عمارتیں، وہی کوچہ و بازار، وہی زندگی کی چہل پہل۔ لیکن ایک عام سا شہر ہوتے ہوئے بھی یہ چمنستان سا کیوں لگتا ہے؟ اتنے بڑے کرہ ارضی پر عظیم الشان علمی، سائنسی، سیاسی اور سفارتی مراکز ہیں۔ دنیا کو زیر وزبر کر دینے والی دہشت ناک بستیاں ہیں لیکن اس چھوٹی سی نگری میں ایسا کیا کچھ ہے کہ اربوں انسان اس کی آرزو میں گیلی لکڑی کی طرح سلگتے رہتے ہیں؟ کتنے ہیں جو بار بار اس چشمہ صافی پہ آتے ہیں لیکن اُن کی تشنگی بجھنے نہیں پاتی۔ کتنے ہیں جو زندگی میں ایک ہی بار آپاتے ہیں اور پھر مرتے دم تک شاخِ پُر میوہ کی طرح شاداب رہتے ہیں اور

کتنے ہیں جو ایک خواب اور آرزو کی آنچ میں بھسم ہو جاتے ہیں شجرِ پُر بہار کی لیکن مدینہ دُور ہی رہتا ہے۔ نصیب کی بات اور کرم کے فیصلے اپنی جگہ لیکن کون جانے نگہِ یار میں کون عزیز ہے؟ کس کی محبت مقبول اور کس کا عشق کامران ہے؟ وہ جو کسی بہانے جہاز میں بیٹھ کر یہاں آ گیا یا وہ جو زندگی بھر سلگتے صحراؤں میں بھٹکتا رہا اور اُس کی آبلہ پائی کو منزل جاناں نہ ملی؟ اویس قرنی بھی تو تھے کہ آتش آرزو میں مثل شمع پگھلتے رہے لیکن تکمیلِ آرزو کی ساعت نہ آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوشاک مبارک اُن کے لیے وقف کرتے ہوئے صحابہ کو تلقین کی کہ وہ مردِ درویش ملے تو اُس سے رہنمائی حاصل کرنا۔

عصر کی نماز کے بعد میں روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جالیوں کے سامنے پہنچا تو ہمیشہ کی طرح سب کچھ بھول گیا، سب کچھ محو ہو گیا۔ دعاؤں کے سارے دفتر ہوا ہو گئے۔ میں پتھر کا بُت بنا کھڑا رہا۔ محبت کی ایک شبنمی سی پھوار نے مجھے آغوش میں لے لیا اور مجھ پر اُس بچے کی سی کیفیت طاری ہو گئی جو بڑی دیر سے اپنا دُکھ چھپائے اپنے آنسوؤں پہ ضبط کیے بیٹھا ہوتا ہے لیکن سر پہ اک دستِ شفقت محسوس کرتے ہی طوفانوں کا در کھل جاتا ہے اور گریہ تھمنے میں نہیں آتا۔ لفظ اور زبان کا وسیلہ جذبہ واحساس کا سارا رس نچوڑ لیتا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا لفظ ایجاد نہیں ہوا جو دلوں کی بستی کا احوال کہہ سکے۔ ایسے میں بس آنسو ہی اظہار کا ذریعہ بنتے اور ساری اَن کہی کہانیاں کہہ ڈالتے ہیں۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا اور آنکھوں میں بس جانے والی دُھند کی چھلنی سے گزرتی نگاہ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جالیوں پر جمی تھی۔ پھر میرے اندر سے کسی نے ایک عرضی سی نکالی اور پڑھنے لگا۔ اُس کی آواز مجھے بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آج میں اس حال میں آیا ہوں کہ میری ماں مجھ سے بہت دُور چلی گئی ہے۔ دعاؤں کا وہ سرچشمہ نہیں رہا جو ہر پل مجھے اپنی آغوش میں لیے رکھتا تھا۔ آپ کا بے پایاں لطف وکرم ہمیشہ میرے شاملِ حال رہا ہے۔ میں نے کبھی بھولے سے کہہ دیا کہ ''مدینہ دُور ہے۔'' وہ دن اور آج کا دن مدینہ اپنی بانہیں پھیلائے مجھے بلاتا رہتا ہے...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اپنی اس نگاہِ مہرباں سے اُوجھل نہ ہونے دیجئے گا کہ اب میرے گھر کا وہ دریچہ بند ہو گیا ہے جس سے مدینہ جیسی ٹھنڈی ہوا آیا کرتی تھی......'' لفظ بے پتوار کی کشتی کی طرح بپھری لہروں میں ہچکولے کھاتے رہے اور میں گم صم کھڑا روتا رہا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر اس کیفیت میں رہا اور کب وہاں سے چلتا ہوا پھر ریاض الجنتہ میں آ بیٹھا۔ میری نگاہ سنہری منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی جو سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ مجھے کھجور کے اُس تنے کی روایت پھر سے یاد آ گئی جس سے ٹیک لگا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے۔ پھر ایک انصاری خاتون نے تین سیڑھیوں والا لکڑی کا ایک منبر پیش کیا۔ جمعتہ المبارک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار اس منبر پہ تشریف فرما ہوئے تو کھجور کا وہ تنا بچوں کی طرح زار وقطار رونے لگا۔ جیسے شدت غم سے اُس کا سینہ شق ہو جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے نیچے اُترے اور ستون کو اپنی بانہوں میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ اب اُس تنے کی جگہ حنانہ نامی

سنگِ مرمر کا ستون کھڑا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی اُسے سینے سے چمٹا لوں لیکن اس تصور ہی سے پیشانی پسینے میں تر ہو گئی۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر کی سب سے آخری یعنی تیسری سیڑھی پہ تشریف فرما ہوتے اور اپنے پاؤں دوسری سیڑھی پہ رکھ لیتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو کبھی تیسری سیڑھی پر نہ بیٹھے۔ دوسری سیڑھی پہ بیٹھتے اور تیسری پر پاؤں رکھتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے تو اس سیڑھی پہ بیٹھتے جہاں صدیق اکبرؓ اپنے پاؤں رکھتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی روایت پر چلتے ہوئے تیسری سیڑھی پر بیٹھتے اور پاؤں نیچے رکھ لیتے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اصل منبر کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں چھ مزید سیڑھیوں کا اضافہ کر دیا۔ خلفاء ہمیشہ اس سیڑھی پہ ہی بیٹھتے رہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پائے مبارک رکھے تھے۔

عقیدت و احترام میں گندھی یہ روایات یاد آتے ہی میں حنانہ سے ذرا دُور ہو گیا اور اُسے ٹک ٹک دیکھنے لگا۔ اب میری طبیعت کچھ کچھ سنبھلنے لگی تھی۔ میں ایک بار پھر اپنے جسم کی پور پور سنبھالتا ہوا روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ جالیاں میرے اور قریب آ گئی تھیں۔ آنکھوں میں اب بھی جلوؤں کی تاب نہ تھی اور وہ پیہم سلگ رہی تھیں۔ میرے ہونٹوں سے درود و سلام کے زمزمے پھوٹنے لگے اور دعاؤں کے باب کھل گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے نور کے تاروں سے بنی چادر نے مجھے اپنے مرمریں غلاف میں لپیٹ لیا ہو۔ دل کی دھڑکنیں ہولے ہولے سنبھلنے لگیں۔ مغرب کی اذان بلند ہوئی تو میں اپنے آپ کو پھول کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

رات مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی طرف آتے ہوئے چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔ وادیاں اور پہاڑ چاندنی میں نہائے ہوئے تھے اور میرے قلب و ذہن میں بھی جانے کتنے چاند کھلے ہوئے تھے اور بہار کی بارش سے دُھلی دل کی بستی خنک چاندی کی چادر تانے سکون کی نیند سو رہی تھی۔

[05-04-2007]

---

# کوئی مانگے تو سہی!

چاندنی میں نہائی شب کی اوّلیں ساعتوں میں اپنے میزبانوں کے ہمراہ مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ کی طرف سفر کے دوران میرے دماغ میں ایک فلم سی چلتی رہی، ایک نگار خانہ سا سجا رہا۔ مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے نہ جانے میرے حضور ﷺ کے پائے مبارک کس پہاڑ، کون سی گھاٹی اور کس ریگ زار پہ پڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ کی اُونٹنی نے نہ جانے کون سی جھاڑی، کون سے پودے کی پتیاں کھائی ہوں گی؟ جانے آپ ﷺ نے کہاں قیام فرمایا ہوگا؟ کون سے پتھر کو سرہانہ بنا کر استراحت فرمائی ہوگی۔ ہم نہیں جانتے لیکن ان مقامات کو تو علم ہوگا کہ ان کے مقدر نے کس طرح یاوری کی تھی اور یکا یک وہ زمین کا حصہ ہوتے ہوئے کن رفعتوں پر سرفراز ہوگئے تھے۔

ہم حرم میں داخل ہوئے تو عشاء کی نماز ادا کی جا چکی تھی۔ روشنیوں سے نہائے حرم کے عین بیچوں بیچ سیاہ ریشم کے غلاف میں لپٹا ہوا خانہ کعبہ جلال و جمال کا مرقع بنا کھڑا تھا۔ مجھے پہلی بار اب سے کوئی 29 برس قبل اپنے والدین کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ ان 29 سالوں کے درمیان حرم میں بے پناہ توسیع ہو چکی ہے۔ گرد و پیش کا سارا منظر بدل گیا ہے لیکن خانہ خدا کے سارے نقوش جوں کے توں ہیں۔ وہی ہیبت، وہی دبدبہ، وہی رُعب، وہی جلال لیکن آنکھوں میں عافیت کی ٹھنڈک بن کر بکھرتا کیف، دل میں تحفظ، پناہ اور فصیل کا احساس جگاتی اپنائیت، اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی کے تصور سے لرزتا بدن اور خانہ کعبہ کے چار سو عفو و درگزر کا موجیں مارتا دریا، روتے بلکتے لوگ اور حرفِ تسلی کی طرح رُوح میں اُترتی اُمید کی ایک کرن۔

حرم میں خاصا ہجوم تھا۔ ایران، ترکی اور انڈونیشیا سے عازمینِ عمرہ کے قافلے پیہم اُتر رہے ہیں۔ پاکستان میں شاید ابھی تک ضابطہ بندیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ طواف اور سعی میں ڈیڑھ گھنٹے سے کم وقت لگا۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کا راستہ کشادہ کیا جا رہا ہے لیکن توڑ پھوڑ اور تعمیرِ نو کا کام اس عمدگی سے ہو رہا ہے کہ سعی کا پرانا راستہ متاثر نہیں ہوا اور زائرین کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ سعی کے دوران میرا ذہن بہت دُور کے منظروں کی طرف چلا گیا۔ جب روتے بلکتے اسماعیل علیہ السلام کو ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے لٹا کر پانی کی تلاش میں حضرت ہاجرہؑ قریبی پہاڑی صفا تک پہنچیں اور اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی ذی رُوح پر نظر پڑ جائے جس سے مدد لی جا سکے۔ شاید کہیں پانی پر نظر پڑ جائے۔ مایوس ہو کر نیچے اُتریں، بے کلی سے اپنی قمیض کا ایک کنارہ پکڑ کر اندوہ و غم کی تصویر بنی دوسری قریبی پہاڑی مروہ پہ پہنچیں۔

وہاں بھی ویرانیوں کے ڈیرے تھے۔ اس طرح انہوں نے سات چکر لگائے۔ ایک پہاڑی سے دوسری کی طرف جاتے ہوئے جب وہ نشیب میں آتیں تو درخت اور اُس کے سائے میں روتا بلکتا بچہ نگاہوں سے اُوجھل ہو جاتا۔ یہ فاصلہ وہ دوڑتے ہوئے طے کرتیں۔ ساتویں چکر پہ جب مروہ کی پہاڑی پہ پہنچیں تو ایک آواز سنائی دی۔ رُک کر غور سے سننے کی کوشش کی۔ آواز پھر گونجی۔ ہاجرہؓ بے تابی سے بولیں۔ ''بولنے والے بول، میں نے تیری آواز سن لی ہے۔ میری کچھ مدد کر سکتا ہے تو کر۔'' پھر دیکھا کہ ایک نورانی چہرے والا فرشتہ اسماعیل علیہ السلام کے پاس کھڑا ہے۔ اسماعیل علیہ السلام پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے اور پھر وہاں سے پانی کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ ہاجرہ دوڑی دوڑی آئیں۔ پانی کے گرد مینڈھ سی بنانے لگیں اور پھر چلو بھر بھر کے مشکیزہ بھرنے لگیں۔ پانی کا چشمہ جوش سے اُبل رہا تھا۔ حضرت ہاجرہؓ نے اُسے حوض کی شکل دے دی۔ خود پانی پیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پلایا۔ فرشتے نے کہا...... ''یہ نہ سمجھنا کہ تم ضائع ہو جاؤ گے۔ یہ سامنے اللہ کا گھر ہے۔ اس گھر کو یہ بچہ اور اس کا باپ دوبارہ بنائیں گے۔ اللہ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کرتا۔'' ماؤں کی ممتا کتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو متحرک فرما دیتا ہے اور بنجر زمینوں سے ایسے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں کہ ہزار ہا سال تک اُن کا پانی ختم نہیں ہو پاتا اور ماؤں کی سعی و کاوش کا کیا درجہ ہے کہ رب ذوالجلال صفا اور مروہ کو اپنی نشانیاں قرار دیتا اور سات چکروں کی سنت کو حج و عمرہ کا رُکن بنا دیتا ہے۔ ماں اور ممتا کے تصور سے میرے آنسو نکل آئے۔ ساتویں چکر کے اختتام پر مروہ پہاڑی پر بیٹھے ہوئے میں دیر تک ماؤں کے تصور میں گم رہا جو دُور چلی جاتی ہیں لیکن دعاؤں کے نورانی ہالے کی طرح اپنے بچوں کے آس پاس رہتی ہیں۔

رات ڈھل رہی تھی۔ میں تھکن سے چور ہوٹل آ گیا۔ حرم کعبہ میں فجر کی نماز ایک خاص رُوحانی لذت و کیف رکھتی ہے۔ بجلی کے قمقموں کی تیز روشنی غیر محسوس انداز میں سورج کے لحہ لحہ پھیلے اُجالے میں جذب ہو جاتی ہے اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے چہچہے لبیك اللهم لبیك، کی گونج میں کچھ اس طرح گم ہو جاتے ہیں جیسے ساری کائنات حمد و ثنا میں محو ہو۔ میں ایک گوشے میں بیٹھا عشق و جنوں کی سرمستیاں دیکھتا رہا۔ ایران، ترکی اور انڈونیشیا سے آئے عازمین کا انتہائی منظم انداز، اعلیٰ اور ایک جیسی پوشاکیں، جُداگانہ تشخص، والہانہ پن میں بھی ایک خاص قسم کا ضبط۔ کیا ہم بھی کبھی یہ سب کچھ سیکھ پائیں گے۔؟ کیا ہم بھی پاکستان کے ایسے ہی سفیر بن سکیں گے؟ کیا ہم بھی پاکستان کا ایسا ہی منظم اور جُداگانہ تشخص پیش کر پائیں گے؟

پاکستان کا تصور آتے ہی میرا دل دعاؤں سے معمور ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے میں بھول گیا کہ میں نے اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے عزیز و اقارب اور اپنے دوست احباب کے لیے کیا مانگنا ہے۔ میرے پاس نہ مناجات کی کوئی کتاب ہوتی ہے نہ حاجات کی فہرست پر مشتمل کوئی ڈائری۔ یہ سب کچھ مجھے اپنے اور خانہ کعبہ کے درمیان حائل ہو جانے والے پردوں کی طرح لگتا ہے۔ اُس صبح میں صرف

پاکستان کو یاد کرتا اور اللہ کے حضور اس کی بقا و سلامتی، اس کی ترقی و خوشحالی، اس کی عظمت و سربلندی اور اس کے حفظ و امان کی دعائیں مانگتا رہا۔ سیاہ غلاف میں لپٹا کعبہ میرے سامنے تھا۔ لوگ حجرِ اسود پہ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ میں عین اُس کے مقابل دیوار سے ٹیک لگائے شوق و مستی کا یہ عالم دیکھ رہا تھا اور 'پاکستان' میرے من میں بسا تھا۔ میں نے سوچا، میرے لیے بابِ کعبہ نہیں کھلے گا۔ میں اس کے اندر نہیں جا پاؤں گا۔ میں اس کی چھت پر بھی نہیں جا سکوں گا لیکن کیا دعاؤں کو عرشِ معلیٰ پہ جانے کے لیے ایسے پروں کی ضرورت ہوتی ہے؟ اور اگر درِ کعبہ کھل جائے تو......؟ میں نے اپنے اندر کو ٹٹولا۔ کیا میں اندر جا پاؤں گا؟ اگر چھت پہ جانے کا اذن مل جائے تو کیا میں یہ حوصلہ کر پاؤں گا؟ میں تو شاید پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی ڈھیر ہو جاؤں۔ مجھے ایک بار پھر مسجد نبوی ﷺ کا منبر یاد آیا جس کی وہ سیڑھی کبھی صحابہ کرامؓ کی نشست نہ بنی جس پہ حضور ﷺ تشریف فرما ہوئے تھے۔

دوپہر گیارہ بجے کے قریب میں پھر حرم چلا گیا۔ گرمی زوروں پہ تھی۔ طواف کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا کہ اس وقت بھیڑ کم تھی۔ نمازِ ظہر تک میں وہیں بیٹھا، دست دعا پھیلائے خانہ کعبہ کو دیکھتا رہا۔ یہ وہ لمحے تھے کہ میرے سارے دوست احباب، عزیز و اقارب، دعاؤں کی درخواست کرنے والے، عرضیاں بھیجنے والے حلقہ سا بنا کر میرے آس پاس آ بیٹھے میں ایک ادنیٰ سے کارندے کی طرح ایک ایک کر کے عرضیاں پیش کرتا رہا۔ مجھے یوں لگا کہ ربِ کعبہ کی رحمتیں جوش مارنے لگی ہیں کہ اُس رحیم و کریم کو عرضیاں پیش کرنے والے بندے بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ وہ تو دربار سجائے بیٹھا رہتا ہے کہ سچے دل سے کوئی مانگنے والا آئے تو سہی، مانگے تو سہی!

مجھے آج ہی جدہ جانا تھا۔ باہر نکلا تو حرم کے بیرونی دالان میں جابجا کبوتروں کی ڈاریں تھیں۔ مجھے ''بامِ حرم کا کبوتر'' یاد آ گیا۔ وہ جو برسوں پہلے یہاں آیا اور حرم کا ہو کے رہ گیا۔ میں اُس کا پتا لینے وہاں چلا گیا جہاں وہ دو وقت کا کھانا کھاتا ہے۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا ''بابا تو مدینے گیا ہوا ہے۔'' مکہ اور مدینہ! کیا بستیاں ہیں کہ تشنہ لب سیر نہیں ہونے پاتے۔ کیا خوش بخت ہیں کہ ہر رشتہ و پیوند سے بے نیاز ہو کر یہاں آ بیٹھتے ہیں اور اِسی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے۔

[06-04-2007]

# لوح بھی تو قلم بھی تو......!

آیئے تھوڑی دیر کو مدینہ چلتے ہیں کہ دلِ صد زخم آسودگی سے بھر جائے۔

جی نہیں چاہتا کہ برطانیہ کی ملکہ عالیہ کی طرف سے، بددعاؤں کے ڈسے ایک نابکار شخص کو ''سر'' کا خطاب دینے پر کچھ لکھوں...... اور لکھوں بھی تو کیا؟ انسانیت کی کشتِ زعفران میں ایسے لوگ خاردار زہریلی جڑی بوٹیوں کی طرح اُگتے اور پھر اپنے ہی زہر کی آگ میں بھسم ہو جاتے ہیں۔ ان کا نہ کوئی نام ہوتا ہے نہ مقام، نہ پس منظر نہ پیش منظر۔ پراگندہ خیالات کی بساندھ میں گندھی سوچ انہیں نفسیاتی مریض بنا دیتی ہے۔ یہ نام آوری کے لیے مختصر راہوں کی تلاش میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس خبط بیمار میں وہ بھول جاتے ہیں کہ نام آوری اور رُسوائی میں کیا حدِ فاصل ہے؟ پذیرائی اور جگ ہنسائی میں کیا فرق ہے؟ شہرت اور ملامت کو کون سی لکیر ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہے؟ آزادیٔ اظہار اور خرافات بے مہار کیوں کر دو مختلف چیزیں ہیں؟ یہ اس احساس سے بے بہرہ ہوتے ہیں کہ تہذیب انسانی کن اقدار پر اُستوار ہے اور کون سی مکروہات، اشرف المخلوقات کو ڈھور ڈنگر بنا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ نامراد و مردود لوگ ہیں جنہیں ''معاف'' کر دینا چاہیے۔ یہ وہ کوڑا دان ہیں جو غلاظتوں سے لباب بھرے، چار سو تعفن بکھیرتے رہتے ہیں۔ لیکن بستیوں کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور یہ گندگی سے بھری وہ نالیاں اور بدرویں ہیں جو گندے پانی کے نکاس کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ کوڑا دان پر گل دان کی سنہری تختی لگا دینے سے وہ عرقِ گلاب کا مٹکا نہیں بن جاتا اور کالے ملغوبے والے گندے نالوں کو نیلگوں پانیوں والی شفاف نہریں قرار دینے سے ان میں سرو و سمن کے عکس نہیں جھلملانے لگتے۔ اس سے صرف اُن لوگوں کے فکری اپاہج پن کا اندازہ ہوتا ہے جن کے حواسِ خمسہ تعصب کی گرفت میں ہوتے ہیں اور جن کی تہذیب نفرتوں سے نمو پاتی ہے۔

میں اس لیے بھی پراگندہ خیالی کی اس پوٹ پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا تھا کہ میرے محمد ﷺ کی شان ایسی بدکلامیوں سے بے نیاز ہے۔ ایسی ہرزہ سرائی سے نبی رحمت ﷺ کی عظمت و رفعت پہ کوئی آنچ نہیں آتی۔ دُور دُور تک پھیلے کرۂ ارض پر رینگنے والے حشرات الارض سے کوئی بھونچال نہیں آتا۔ بے کراں آسمانوں کی لامحدود وسعتوں میں کسی چمگادڑ کے پھڑ پھڑانے سے کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا، کوئی حدود اربعہ نہ رکھنے والے کسی بے ننگ و نام شخص کے قلم کی ابکائی سے اُس رُوح کون و مکان ﷺ کی شان میں کیا کمی آسکتی ہے جس کا نام نامی، ہر آن دنیا کی مختلف بستیوں میں گونجتا رہتا ہے، جس کے ذکر کی بلندی کی

ضمانت خالق ارض و سما نے دی، جس پر درود و سلام کی مشکبار صدائیں پیہم فضاؤں میں بسی رہتی ہیں۔

میں اس لیے بھی اس موضوع سے گریز کر رہا تھا کہ برطانیہ نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ یہ لوگ کتنے ہی عالم فاضل ہو جائیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی کتنی ہی بلندیاں سر کر لیں، جمہوری قرینوں کے کتنے ہی مبلغ بن جائیں، انسانی حقوق کی پاس داری کے کیسے کیسے دعوے کریں، امن و خیر سگالی کے کیسے ہی چیمپین بنیں، ''بین المذاہب رواداری'' پر کیسے کیسے سرکس سجائیں، ان کے سکالر بنی سنوری زبان میں کیسے کیسے خطبہ ہائے شیریں ارشاد فرمائیں، ان کے مذہبی پیشوا باہمی اخلاص و محبت کے کیسے کیسے نغمے الاپیں...... ان سب کے دلوں میں ایک کالی مورتی بیٹھی ہے جس کا نام ہے ''خُبثِ باطن''۔

سو اگر، ملکہ برطانیہ نے ایک بدرُوح کے گلے میں ''سر'' کا خطاب ڈال ہی دیا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ دنیا بھر میں مروّج دستور کے تحت، یہ ''حسنِ انتخاب'' ٹونی بلیئر نامی شخص کا ہے جو رُسوائیوں کا پشتارہ پیٹھ پر لادے گھر جا رہا ہے اور جاتے جاتے یہ سوغات اپنے جانشین کو سونپ گیا ہے۔ قلم کاری کو سیاہ کاری بنا دینے والے شخص نے جو کچھ لکھا، اُسے دنیا کا کوئی مستند نقاد، ادب کا شہ پارہ تو کیا، ذوق لطیف کو آسودگی بخشنے والا اوسط درجے کا نثر پارہ بھی تسلیم نہیں کرتا۔ جس ملک میں شیکسپیئر، ڈکنز، ہارڈی، جین آسٹن، جارج ایلیٹ، ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، بائرن اور براؤننگ جیسے دیو قامت قلم کار ہو گزرے ہوں، وہاں ''شیطانی کلمات''، ''مڈنائٹ چلڈرن''، ''شیم''، ''گراؤنڈ بینتھ ہر فیٹ'' اور بے آب و رنگ کہانیوں کی کیا اوقات ہو سکتی ہے؟ ایسی یاوہ گوئیاں نقد و نظر کی کسی بھی میزان پر معیاری ادبی تحریریں قرار نہیں پاتیں۔ تو پھر اس کوڑا کباڑ کو انعامات سے کیوں نوازا گیا؟ یہ کتابیں ''بیسٹ سیلر'' کیوں بنیں؟ سیاہ قلم کار کو کمال فن کے درجنوں اعزازات کیوں عطا ہوئے؟ صرف اس لیے کہ اُس نے مسلمانوں جیسا نام ہوتے ہوئے، نبی آخر الزماں ﷺ، اُمہات المومنینؓ اور صحابہ کرامؓ کے دامان پاک پر چھینٹے ڈالنے کی ناپاک جسارت کی؟ صرف اس لیے کہ اُس نے اسلامی تہذیب و فکر اور پاکستان کو نشانہ بنایا۔ صرف اس لیے کہ اُس نے اُن علامتوں پر سنگ زنی کی جو ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی محبت و عقیدت کا مرکز و محور ہیں۔ نابکاری کو قلم کاری سمجھ لینے والے، بھٹکے ہوئے شخص کو سر آنکھوں پر بٹھانے کی وجہ اُس کا ہُنر نہیں، اُس کا ''شر'' ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے بغض رکھنے والوں کو ایسے نابغوں کی ضرورت رہتی ہے جو اپنے اسلامی نام کے لبادے میں اسلام، اسلامی تعلیمات، اسلامی شخصیات، اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب کا تمسخر اُڑا سکیں۔ بنگال کی ''تسلیمہ نسرین'' ہو یا ممبئی کا ''سلمان رشدی'' اسی لیے اُن کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہیں کہ وہ اُن کے خبث باطن کو تسکین دیتے ہیں۔

کبھی جارج بش، کبھی پاپائے روم، کبھی ڈنمارک کے کارٹونسٹ اور کبھی ملکہ عالیہ......!! یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ برطانیہ نے گالی بنے ایک شخص کو سر کا خطاب دے کر کیا کمایا ہے؟ کیا اُسے خبر نہیں کہ اس سے

ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزرے گی؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ 1988ء میں ''شیطانی کلمات'' کی اشاعت پر عالم اسلام نے کیا ردّعمل ظاہر کیا تھا؟ کیا وہ بھول گیا کہ 1987ء میں امام خمینی نے فتویٰ دیا تھا اور نو برس تک ایران برطانیہ سفارتی تعلقات منقطع رہے تھے؟ یہ شخص تب سے چوہے کی طرح دبکا ہوا ہے۔ برطانوی شہریت رکھنے کے باوجود اس کا زیادہ وقت امریکہ میں گزرتا ہے۔ اس کی حفاظت پر کروڑوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ یہ وہ شخص ہے جس کا سینہ انسانیت کے درد سے عاری ہے۔ اس نے عراق وافغانستان پر امریکی و برطانوی قہر کی حمایت کی۔ اس نے نبی کریم ﷺ کے توہین آمیز خاکوں کو حق بجانب قرار دیا۔ اس کی ساری تحریریں، حسن ولطافت سے عاری، غلیظ فحش کلامی کا شرمناک نمونہ ہیں۔

ہمیں انتہا پسند کہا جاتا ہے، بنیاد پرست اور دہشت گرد گردانا جاتا ہے۔ بے لچک، اُجڈ، جاہل اور گنوار سمجھا جاتا ہے ...... لیکن ہمارا کوئی سنجیدہ قلم کار، کسی بھی مذہب کے بارے میں ایسی بدبودار سوچ کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور ہمیں تہذیب کا درس اور روشن خیالی کے آداب سکھانے والوں کی فطرت دیکھئے کہ بنی نوع انسان کے دلوں کے حساس ترین گوشوں پر نشتر چلا رہے ہیں۔ اُسامہ بن لادن، ایمن الظواہری اور ملا محمد عمر کا کسی طور ملعون رشدی سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اعزازات وخطابات کا تعین اُس دن ہوگا جس دن شہنشاہ کون ومکاں کا دربار سجے گا۔ لیکن پل بھر کو سوچئے اگر امریکہ اور برطانیہ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے والی ان شخصیات میں سے کسی کو، کسی بھی اسلامی ملک کی طرف سے کوئی سرکاری اعزاز دے دیا جائے یا کوئی مسلم این جی او ہی انہیں ''رئیس المجاہدین'' اور ''افتخار المومنین'' جیسا کوئی خطاب دے دے، تو امریکہ، برطانیہ اور یورپ پر کیا گزرے گی؟

یقین جانئے! میں اس موضوع پر کچھ نہیں لکھنا چاہتا تھا لیکن پورا کالم ہوگیا۔ ملامت کے کسی پیکر کی گردن میں لعنت کا ایک اور طوق ڈال دینے سے کیا ہوتا ہے اور زمانوں کو روشنی کی سوغات دینے والے آفتاب جہاں تاب کی طرف منہ کر کے تھوکنے سے کیا فرق پڑتا ہے، سوائے اس کے کہ کسی ملعون کا اپنا مکروہ چہرہ لتھڑ جائے۔

جہنم کی آگ سمیٹنے والوں کو انگاروں کا کاروبار کرنے دیں اور آئیں ذرا دیر کو آنکھیں بند کر کے مدینے چلتے ہیں...... روتے ہوئے، پکارتے ہوئے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا، تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقلِ غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر، جلوۂ بے حجاب سے

[21-06-2007]

---

# مدینہ یاد آتا ہے

اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھولے، میں اپنے چھوٹے سے باغیچے کو دیکھ رہا ہوں۔ ربیع الاوّل کے سورج کی اوّلین کرنیں، پھاٹک کے باہر کھڑے سرو کے درخت سے کھیل رہی ہیں جس کی ٹہنیوں کے سروں پر ہلکے سبز رنگ کی نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ بوگن ویلیا کی دونوں بیلیں، جو کچھ دن پہلے تک بے لباس ہو گئی تھیں، نئے پتوں سے ڈھک گئی ہیں۔ کیاری میں لگے گلابوں میں سے ایک پر بڑا سا سفید پھول مسکرا رہا ہے۔ لیموں کے چھوٹے چھوٹے پودوں پر بُور آ رہا ہے۔ اری کیریا جوان ہو چلا ہے اور اس کا قد فصیل سے اُونچا ہو گیا ہے۔ دیوار سے چپک کر چلنے والی بیل کا رنگ گہرا سبز ہو گیا ہے۔ پیلی پڑ جانے والی گھاس کی مری مری سی پتیاں ہری ہو رہی ہیں۔ کھلی کھڑکی سے آتی خنک ہوا کمرے میں بھر رہی ہے اور مدینہ یاد آ رہا ہے!!

میں دیر تک آتی بہار کی شادابیوں میں کھویا رہتا ہوں۔ پھر ہولے ہولے سارا منظر دُھندلانے لگتا ہے۔ پھر سرمئی رنگ کے غبار سے ایک سفید، براق، شفاف سا ہالہ اُبھرتا ہے اور پھر اس نورانی ہالے کے اندر سے سبز رنگ کا ایک گنبد نمودار ہوتا اور زمین و آسمان کی وسعتوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں سبز گنبد تلے روضۂ رسول ﷺ کی سنہری جالیوں کے سامنے کھڑا ہوں۔ محبت و شفقت کی ٹھنڈی پھوار، موتیوں کی طرح مجھ پر برس رہی ہے۔ درود و سلام کی معطّر سی گونج مسجد نبوی ﷺ کے میناروں سے لپٹ رہی ہے۔ نبی رحمت ﷺ کی محبت میں بھیگے لوگ، نگر نگر سے آتی خلق خدا، پروانوں کی طرح منڈلا رہی ہے۔ روتے ہوئے لوگ، ہچکیاں لیتے لوگ، دعاؤں کے لیے ہاتھ پھیلائے لوگ اور روضۂ رسول ﷺ کے اندر سے آتی خوشبو انہیں تھپکیاں دے رہی ہے۔ میں جب بھی وہاں جاتا ہوں، میری زبان گنگ ہو جاتی ہے، لفظ میرا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، بیان کا سلیقہ گم ہو جاتا ہے اور میں پتھر ہو کے رہ جاتا ہوں۔ اب بھی یہی ہو رہا ہے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہے اور میں بول نہیں پا رہا۔ پھر میرے کان میں کوئی سرگوشی کرتا ہے۔ ”تم نے اب کے بہت دیر کر دی۔“

مجھے ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ میں آنکھ کھول کر چار سو دیکھتا ہوں۔ کھڑکی کھلی ہے۔ باہر کا منظر وہی ہے البتہ دھوپ میں تیزی آ گئی ہے۔ اچانک یہ خیال میرے دل میں خلش بن کر کھٹکنے لگتا ہے کہ مجھے مدینہ گئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میں اُداس سا ہو جاتا ہوں۔ دُوری کا درد میرے رگ و پے میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ سوال و جواب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ

شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی بھی کیا مصروفیت؟ کون سی مجبوریاں؟ کیسے جھنجھنٹ؟ کس طرح کے جھمیلے؟ میں ٹوٹنے لگتا ہوں۔ جیسے کسی چاہنے والے کی نرم خوجرح کسی مجرم کو توڑ پھوڑ دیتی ہے۔

12 ربیع الاوّل کی انقلاب آفریں صبح بھی کیا صبح ہے۔ وہ صبح جس نے زمانے بھر کی تاریکیوں کو ابد تک کے لیے اُجالوں سے ہم کنار کر دیا۔ وہ صبح جو ظلم کی چیرہ دستیوں میں رحمت و شفقت، ہمدردی و غم گساری کی نوید بن کر آئی۔ وہ صبح جس نے شرک و بت پرستی کے اندھیروں میں بھٹکتی مخلوق کو توحید کی روشنی بخشی۔ وہ صبح جس نے انسان کو پستیوں سے نکال کر وقار کی رفعتوں تک پہنچا دیا۔ وہ صبح جس نے مظلوموں، محکوموں، مفلوک الحالوں، تہی دستوں اور پسے ہوؤں کے حقوق کا درس دیا۔ وہ صبح جس نے انسانیت کو نئے معنی و مفہوم کی خلعت عطا کی۔ وہ صبح جس نے کردار و عمل کو نئے نفیس سانچوں میں ڈھالا۔ وہ صبح جس نے بتایا کہ حکمرانی کے آداب کیا ہیں۔ وہ صبح جس نے امیری میں فقیری کا قرینہ دیا۔ وہ صبح جس نے بنی آدم کو پیکرِ خاکی سے اُٹھا کر مرکز کائنات بنا دیا۔

وہ صبح میری چھت کے منڈیرے سے لگی کھڑی ہے۔ کاش میں مدینہ میں بیٹھ کر اس کی اوّلین کرنوں کو بوسہ دیتا۔ میرے پہلو میں ابو الامتیاز، ع۔س مسلم کی نعتوں کا مجموعہ ''زبورِ نعت'' رکھا ہے۔ ع۔س مسلم نے بھی کیا دل دردمند پایا ہے۔ میں کئی بار اُن کی کہی گئی نعتیں پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار ایک لذت تازہ ملی۔ میں ''زبورِ نعت'' کھول کر دیکھتا ہوں۔

سکونِ دل کا خزانہ جہاں سے ملتا ہے
چلو مدینے کہ سب کچھ وہاں سے ملتا ہے
درود و رحمتِ حق کی بہار ہے جس پر
تری زمیں کا پتا آسماں سے ملتا ہے
یقین ہے کہ اُدھر بھی تو تُو گیا ہے ضرور
نقوشِ پا کا نشاں کہکشاں سے ملتا ہے
دلوں کے درد کا ذکرِ رسول ﷺ ہے درماں
حیاتِ روح کا ساماں یہاں سے ملتا ہے
بہارِ زیست اُسی کے جمال کا پَرتو
سرورِ جاں بھی اُسی گلستاں سے ملتا ہے
حیات بخش ہے اُس کا خیالِ تابندہ

سکونِ قلب اُسی مہرباں سے ملتا ہے
جو مانگنا ہے، اُسی در سے مانگ لے مسلم
خدا کے بعد اُسی آستاں سے ملتا ہے

جب کبھی خبر آتی ہے کہ کسی نابکار ملک کے کسی نامراد اخبار نے توہین آمیز خاکے شائع کیے ہیں، میرے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے، میرے نبی ﷺ کے بارے میں کوئی ناروابات کہی ہے تو میں اپنی قبرانگاروں سے بھر لینے والے ان سوختہ بختوں کے مقدر کا تصور کر کے لرز جاتا ہوں۔ یہ کیسے لوگ ہیں؟ کون سی درس گاہوں سے تعلیم پاتے ہیں؟ کون سی عظمت انساں کے گن گاتے ہیں؟ غلاظتوں کو وسیلہ رزق بنانے والے ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ وہ کس ہستی کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ پیغمبر انسانیت ﷺ جس کا فرمان ہے کہ دوسروں کو عزت سے بلانا اور نرمی سے بات کرنا بھی نیکی ہے۔ اپنے بچے کو تعلیم دلانا صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ اپنے کنبے سے بھلائی اور نیکی کرنے والا انسان ہی بھلا اور بہتر ہے۔ جس نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو اچھی تعلیم دلوائی، وہ جنت میں جائے گا۔ جس نے فرمایا کہ ایک بلی کو تکلیف پہنچانے والا بھی جہنم میں جائے گا اور جس نے کہا کہ ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے والا بھی مغفرت کا مستحق ٹھہرے گا اور جس کا ارشاد کہ اپنے سینے میں تازہ جگر رکھنے والا جانور بھی بھلائی کا حق دار ہے اور جس نے کہا کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔

اور یہ نابکار اور نامراد لوگ جن کے ہاتھ لاکھوں، کروڑوں انسانوں کے لہو سے رنگین ہیں اور جو جیتے جاگتے انسان کو بلی اور کتے سے بھی حقیر خیال کرتے ہیں؟ وہ ہمارے نبی ﷺ کی شان میں اپنے ناپاک لبوں کو جنبش دیتے ہیں۔ کیا اُن کی ہرزہ سرائی سے رحمت اللعالمین ﷺ کی عظمت میں کوئی کمی آسکتی ہے؟ میں جب چمگادڑوں، کن کھجوروں اور کاکروچوں جیسی کسی مخلوق کا تصور کرتا ہوں تو ابکائی آتی ہے لیکن جس نے اپنا آپ جہنم کے شعلوں کے حوالے کرنا ہی ہو، اُس کا ہم کیا کر سکتے ہیں؟

مجھے مدینہ گئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ کاش میں اُس وقت مدینہ منورہ میں ہوتا جب 12 ربیع الاوّل کے مہر جہاں تاب کی پہلی کرن سبز گنبد کو بوسہ دیتی اور درود و سلام کی مشکبو گونج پوری کائنات کے رگ و پے میں بس جاتی اور میں سبز جالیوں کے عین سامنے محبت و شفقت کی موتیوں جیسی پھوار میں بھیگ رہا ہوتا اور میرا دل موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھل رہا ہوتا اور کوئی میرے کان میں کہتا ''تم نے اتنی دیر کیوں کر دی ہے؟'' میں نے واقعی بہت دیر کر دی ہے اور مدینہ جانے کی آرزو درد میں ڈھلنے لگی ہے۔

[21-03-2008]

---

# 'دارالسلام' کا ایک اور کارنامہ

جب میں کالج میں پڑھایا کرتا تھا تو اقبالؔ کی ایک چھوٹی سی نظم ''خطاب بہ نوجوانانِ اسلام'' کے بعض اشعار کی تشریح کرتے ہوئے دل بھر بھر آتا تھا اور آنکھیں کتاب کے صفحے پر مرکوز ہوتے ہوئے بھی زمانوں کی گرد میں چھپے منظروں کی جستجو میں بہت دُور چلی جاتی تھیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

ہر آن آگے کی طرف جست لگانے اور نت نئے قلعوں پر پرچم لہرانے کی آرزو اُس وقت تک خواب ہی رہتی ہے جب تک کوئی قوم اپنے ماضی سے کسبِ فیض نہ کرے اور یہ بھید نہ جانے کہ اس کے آباؤ اجداد کی معرکہ آرائیاں کس طاقت کے سبب تھیں۔ بلاشبہ ماضی پرستی ایک مرض ہے لیکن اپنی تاریخ سے آگاہی اور آگاہی سے پھوٹنے والے شعور کو مشعلِ راہ بنانا بھی ضروری ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح اپنی شاخوں پر برگ و بار دیکھنے کی تمنا رکھنے والے شجر کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست رکھے۔ جڑیں جتنی دُور تک پھیل جائیں، درخت اتنا ہی توانا ہوتا ہے۔

گزشتہ ہفتے شہرہ آفاق اشاعتی ادارے، دارالسلام، کی شائع کردہ ایک نہایت ہی خوبصورت کتاب ''اٹلس فتوحاتِ اسلامیہ'' موصول ہوئی۔ دارالسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شائع کردہ کتب اعلیٰ اور معیاری طباعت کا نہایت ہی حسین نمونہ ہوتی ہیں۔ دیکھنے والا دیر تک کتاب کی دیدہ

زیبی میں کھویا رہتا ہے۔ میں کئی بار پہلے بھی برادرم عبدالمالک مجاہد کے مجاہدانہ کردار کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ جنہوں نے سعودی عرب کے شہر ریاض میں ایک چھوٹا سا چراغ روشن کیا۔ جواب ہزاروں چراغوں کا مرقع بن کر ایک بڑے فانوس کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ دارالسلام کی شائع کردہ دو کتب ''اطلس قرآن'' اور ''اٹلس سیرت نبوی ﷺ'' کمال کی چیزیں ہیں۔ ان کتب میں ان تمام مقامات، واقعات اور شخصیات کے تفصیلی تذکرے ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا یا جو حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ خوبصورت تصاویر اور جامع رنگین نقشوں نے ان دونوں کتابوں کی اہمیت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ یہ دونوں کتب شام کی معروف علمی شخصیت ڈاکٹر شوقی ابوخلیل کی مرتب کردہ ہیں جنہیں عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ جب بھی کسی کو کوئی کتاب تحفے میں دینے کا خیال آتا ہے تو سب سے پہلے میرا دھیان انہی دو کتابوں کی طرف جاتا ہے۔

اب ''اٹلس فتوحات اسلامیہ'' منظر عام پر آئی ہے جس میں اسلامی فتوحات کی عہد بہ عہد تاریخ بندی کی گئی ہے۔ خلافت صدیقیؓ سے خلافت عثمانیہ کے عروج تک، وسط ایشیا سے مراکش و اندلس اور وسط یورپ تک کی فتوحات کی یہ تاریخ متعلقہ مقامات کی تصاویر اور تفصیلی رنگین نقشوں سے مزین ہے جس سے قاری اپنے آپ کو ماضی کے معرکہ ہائے کارزار کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ فتوحات اسلامیہ کی یہ اٹلس قاہرہ کے اُستاذ احمد عادل کمال کا کارنامہ ہے جو دارالسلام قاہرہ نے 2005ء میں عربی زبان میں شائع کی۔ ''اطلس فتوحات اسلامیہ'' کو اُردو قالب میں ڈھالنے کی کہانی خاصی پُرکشش ہے۔ یہ کہانی عبدالمالک مجاہد کی زبانی زیادہ دلچسپ ہوگی جو ہر آن تیشہ فرہاد اُٹھائے کسی نہ کسی سنگلاخ چٹان کی تلاش میں رہتا اور اُس وقت تک سر پھوڑتا رہتا ہے جب تک جوئے شیر بہہ نہ نکلے۔ عبدالمالک مجاہد بتاتے ہیں......

''دارالسلام (قاہرہ) کے ساتھ میرا بڑا پرانا تعلق ہے۔ اس کے مالک محترم عبدالقادر محمود بکار میرے ذاتی دوست ہیں۔ قاہرہ بک فیئر مڈل ایسٹ کا سب سے بڑا کتاب میلہ ہے۔ ہر سال جنوری کے آخر میں چودہ دن کے لیے منعقد ہونے والا بک فیئر اتنے بڑے ایریا میں لگتا ہے کہ آدمی چلتے چلتے تھک جاتا ہے۔ اندازاً پانچ لاکھ افراد اس کتاب میلے میں شرکت کے لیے روزانہ آتے ہیں۔ اس میلے میں دارالسلام (قاہرہ) کے تین سے چار بوتھ ہوتے ہیں جن میں سیلز مینوں کی تعداد سو سے زیادہ ہوتی ہے۔ ''اطلس فتوحات اسلامیہ'' کی تیاری پر دارالسلام (قاہرہ) کو کم و بیش چھ سال لگ گئے۔ 2005ء میں یہ خوبصورت کتاب شائع ہو کر قاہرہ کتاب میلے میں پیش کر دی گئی۔ میں نے ''اطلس فتوحات اسلامیہ'' کو دیکھا تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے رات ہی اس کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ ڈالا۔ میں تصور میں اپنے اُن مجاہدین کو دیکھتا گیا جنہوں نے اسلام کے پرچم کو سر بلند رکھا اور چہار سو فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے۔ اُس رات سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اس بات کا تہیہ کر رکھا تھا کہ اُردو جاننے والوں کے لیے

اس کتاب کو اُردو میں شائع کرنا میرے اُوپر قرض ہے۔ میں نے جناب عبدالقادر بکار سے بڑے لمبے مذاکرات کیے۔ میں نے خطیر رقم کی پیشکش کر دی تا کہ وہ انکار نہ کر سکیں۔ طویل گفتگو کے بعد معاہدہ طے پا گیا۔ علوم تاریخ وجغرافیہ اور لسانیات کے شناور اور دارالسلام ریسرچ سینٹر (لاہور) کے شعبہ سیرت و تاریخ کے انچارج جناب محسن فارانی نے اس کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ عربی نقشوں کو بھی اُردو میں ڈھالا۔ یہ ایک عظیم کام تھا جو اللہ کی توفیق سے مکمل ہو گیا ہے۔''

492 صفحات پر مشتمل، تین سو تاریخی مقامات کی نایاب تصاویر سے مزین اور 150 قدیم و جدید رنگین نقشوں سے آراستہ یہ اطلس اسلامی فتوحات کی روز بہ روز، ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال تفصیلات کا انتہائی نادر مرقع ہے۔ اسے اُردو کی درجن بھر خوبصورت اور انتہائی معلومات افزا کتب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

6 ہجری میں فتح خیبر سے 999 ہجری میں کینیا اور تنزانیہ کے درمیان واقع ممباسا کی فتح تک ایک ہزار سال پہ پھیلے سلسلہ فتوحات کی یہ کہانی جنوں خیز بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ سلطنت عثمانیہ، مراد ثالث کے دور میں قوت و حشمت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ جب مسلمان یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تقریباً دو کروڑ مربع کلو میٹر علاقے کے حکمران تھے۔ اس داستان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کس گردوں کا ٹوٹا ہوا ستارا ہیں اور آسماں نے ہمیں کیوں ثریا سے زمین پر دے مارا ہے۔

میرے دل سے عبدالمالک مجاہد اور اُن کے ہمت شعار رُفقاء کے لیے دعائیں خود بخود نکلتی رہتی ہیں۔ کیا خبر اُن کی کاوش، ہماری نسل نو کی رگوں میں دوڑتے لہو کو گرما دے اور ہمارے نوجوان بھی تدبر کا سلیقہ جان جائیں اور اُن کی آنکھیں بھی خوابوں سے چھلکنے لگیں۔ وہ خواب جو ایمان و یقین سے ہم کنار ہو جائیں تو دریا پاؤں کی ایک ٹھوکر سے دو نیم ہو جاتے اور پہاڑ ہیبت سے سمٹ کر رائی بن جاتے ہیں۔

[20-04-2008]

# کدورتیں — اور شہرِ خوش جمال

مدینہ یاد آ رہا تھا۔

اور مدینہ بلا رہا ہے — ! لیکن ایک نظر احوالِ وطن پر۔

عدالت عالیہ نے فیصلہ صادر کیا کہ جماعت الدعوۃ کے سربراہ حافظ محمد سعید کی گرفتاری اور نظر بندی قطعی طور پر بلا جواز اور غیر قانونی تھی۔ اپنے تفصیلی فیصلے میں سہ رُکنی عدالتی بنچ نے اتفاق رائے سے قرار دیا کہ ''حکومت کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکی جسے نظر بندی کا جواز بنایا جاسکتا ہو۔ عدالت کے سامنے پیش کی گئی انٹیلی جنس رپورٹس نہ صرف غلط ہیں بلکہ وہ درخواست گزار کی نظر بندی کے بعد ضرورت پوری کرنے کے لیے تیار کی گئیں تا کہ قانونی سقم دُور کیا جاسکے۔ 6 اپریل 2009ء کی رپورٹ اُس وقت بنائی گئی جب حافظ سعید کو قید میں ڈالے تقریباً چار ماہ گزر چکے تھے۔ یہ رپورٹ اس اعتبار سے بھی غلط ثابت ہوئی کہ اس میں جن خدشات کی نشاندہی کی گئی تھی ان میں سے کوئی بھی وقوع پذیر نہیں ہوا۔ یہی حال بعد کی تین رپورٹس کا ہے جو الزامات کے حق میں کسی ٹھوس ثبوت سے قاصر ہیں۔ جہاں تک درخواست گزاروں کے ممبئی حملوں میں ملوث ہونے کا تعلق ہے، ہمارے سامنے کوئی ایک بھی ایسی دستاویز پیش نہیں کی جاسکی جس سے درخواست گزاروں یا جماعت الدعوۃ کے ملوث ہونے کا ثبوت ملتا ہو۔ بھارتی لابی کی طرف سے عائد کردہ الزامات کے حوالے سے ہمارے سامنے پیش کردہ رپورٹس میں کوئی ایسی ٹھوس شہادت نہیں جس سے درخواست گزاروں کا ممبئی واقعات سے کوئی تعلق بھی بنتا ہو۔ حکومت کوئی ایسا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکی جو اس الزام کی تصدیق کرتا ہو کہ درخواست گزار ریاستی مفاد کے خلاف کام کر رہے تھے یا سوسائٹی کو اُن سے کوئی خطرہ تھا......''

جسٹس اعجاز احمد چوہدری، جسٹس حسنات احمد خان اور جسٹس زبدۃ الحسنین کا انتیس صفحات پر مشتمل متفقہ فیصلہ حبس بے جا کی درخواست کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ بنچ نے حکومتی درخواست قبول کرتے ہوئے سرکاری وکلا کو موقع دیا کہ وہ الزامات کے حق میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کی رپورٹس پیش کریں۔ بند کمرے میں ان رپورٹس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا لیکن جیسا کہ جج صاحبان نے اپنے فیصلے میں لکھا، انہیں کوئی معتبر شہادت نہ ملی جو درخواست گزاروں کو آزادی کے حق سے محروم کرنے کا جواز بن سکتی۔ 2 جون کو فیصلہ سامنے آیا تو درخواست گزار پانچ ماہ اکیس دن کی سزائے قید بھگت چکے تھے۔ عدالتی فیصلے

کے بعد یہ سزا جس بے جا میں شمار ہوگی۔ امریکہ نے بلا تاخیر حافظ صاحب کی رہائی پر تاسف کا اظہار کیا، بھارتی قیادت بلبلا اُٹھی۔ عدالتی فیصلے کو براہ راست تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ عدل، جمہوریت اور انسانی حقوق کے علم برداروں کو صرف حافظ محمد سعید کی گرفتاری اور قید چاہیے تھی۔ وہ صرف ایسے عدالتی فیصلے کے منتظر تھے جو اُن کی خواہش بیمار پر مہر تصدیق ثبت کر دے۔ اپنے ہاں کے اداروں کو احترام و وقار کی مسند پر بٹھانے اور ہمارے اداروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنے مکروہ اہداف کا غلام سمجھنے کی یہی روش، امریکی چہرے کی بدنمائی کا سبب ہے۔ عافیہ صدیقی پیہم مظالم کی چکی میں پس رہی ہے۔ اس کے جسم ہی کو نہیں، رُوح اور فکر کو بھی شرمناک تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کوئی رحم کی درخواست گزارتا ہے تو کہا جاتا ہے ''ہمارا تو صدر بھی کچھ نہیں کر سکتا کیوں کہ پراسیکیوٹر نے عافیہ پر فرد جرم عائد کر دی ہے۔'' لیکن ہمارے لیے ان کے ضابطے بھی الگ ہیں، توقعات بھی جُدا اور پیمانے بھی مختلف۔ چونکہ انہیں حافظ سعید کے نام سے چڑ ہے اس لیے عدالت کو، ثبوت ہو نہ ہو، شواہد ملیں نہ ملیں، قانون اجازت دے نہ دے، کسی صورت حافظ سعید کو رہا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ امریکہ اور بھارت کی نظروں میں فرد نامطلوب ہے اور یہ بھی صرف پاکستان میں ممکن ہے کہ کوئی بھی ملک، سفارتی آداب کو جھٹلاتے اور تعلقات خارجہ کے تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے ہمارے عدالتی فیصلوں کو نشانہ تنقید بنانے لگے اور حکومت پاکستان چپ سادھے بیٹھی رہے۔ لیکن جو حکومت ڈرون حملوں اور بے گناہ انسانوں کے قتل عام کو بھی امریکہ سفارتی استحقاق خیال کرتی ہے، اُس کی موٹی کھال پر ایسے تبصروں کا کیا اثر ہوگا؟ اب صدر بارک حسین اوباما کے ایک مشیر بروس ریڈل نے کہا ہے کہ '' آئی ایس آئی کے لشکر طیبہ اور جماعت الدعوۃ سے تعلقات برقرار ہیں۔ پاکستان کو چاہیے کہ ممبئی دھماکوں کے ملزمان کو کٹھرے میں لائے کیوں کہ بھارت کے لیے ممبئی حملوں کو بھولنا بہت مشکل ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ لشکر طیبہ اور جماعت الدعوۃ کے دہشت گردوں کے خلاف قدم اُٹھایا جائے۔ امریکہ کو بھی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ پاکستان نے ابھی تک دہشت گردی کے وہ سیل بند نہیں کیے جو بھارت کے خلاف مصروف کار ہیں۔''

یہ ماتم لا حاصل ہے کہ امریکہ بھارت کا وکیل کیوں بنا ہوا ہے؟ امریکی اہلکار، بھارتی اہلکاروں کی زبان کیوں بولتے ہیں؟ سبب واضح ہے۔ خود پاکستان کی سرکار اور اُس کے اہلکار پاکستانی زبان بولنے سے خوف زدہ ہیں۔ اُن کے دلوں میں ہوس اقتدار نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ وہ امریکہ کی دل داری کو جزو ایمان خیال کرتے ہیں۔ ہر وہ شخص اُن کا دشمن ہے جسے امریکہ صف دشمناں میں خیال کرتا ہے اور ہر وہ فرد اُن کے سر کا تاج ہے جو امریکیوں کا چہیتا ہے۔ کوئی نہیں جو دنیا کے دربار میں پوری قوت کے ساتھ پاکستان کا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہو۔ ہم امریکی کروسیڈ کا ہراول دستہ ہیں۔ ہم اپنے بچے اس آگ میں جھونک رہے ہیں۔ ہماری بستیاں آتش کدہ بنی ہوئی ہیں۔ ہماری فوج ایک نامراد جنگ میں اُلجھا دی گئی

ہے۔ ہم اربوں ڈالر کا نقصان اُٹھا چکے ہیں۔ ہماری حاکمیت اعلیٰ غریب کی جورو بنی ہوئی ہے۔ اس سب کچھ کا ثمر ڈیڑھ ارب ڈالر کی وہ امداد ہے جس کا نصف سے زائد امریکیوں کی جیب میں چلا جائے گا۔ ستم یہ ہے کہ ہماری اس اطاعت گزاری اور جاںنثاری کے باوجود کسی معاملے میں امریکہ ہمارے مؤقف کا حامی نہیں۔ ہر مسئلے کو وہ بھارت کی آنکھ سے دیکھتا، بھارت کے دماغ سے سوچتا اور بھارت کی زبان سے بولتا ہے۔ حافظ محمد سعید اور جماعت الدعوۃ پر امریکہ کا کوئی الزاماتی دعویٰ بھی نہیں۔ نائن الیون کی الف لیلہ سے ان کا دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ بھارت نے کچھ داستانیں ضرور گھڑ رکھی ہیں لیکن آج تک کوئی رام کہانی، پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی۔ اس کے باوجود نہ کوئی بھارت کو لگام دینے والا ہے نہ امریکہ کی زبان بند کرنے والا۔

پاکستان کی حکومت، پاکستان کی فوج، پاکستان کی ایجنسیاں، پاکستان کی تنظیمیں، پاکستان کی شخصیات، سب امریکہ، بھارت، افغانستان اور یورپ کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ سب کے سب بھارت کی قیادت میں پاکستان کے خلاف مکروہ مہم کو ہوا دے رہے ہیں۔ وہ دباؤ اس حد تک لے جانا چاہتے ہیں کہ نہ صرف پاکستانی حکومت اُن کے شکنجے میں جکڑی رہے بلکہ اس کی عدالتیں بھی اُن کے من پسند فیصلے صادر کرنے لگیں۔ بارک حسین اوباما کی خوش نوائی کے باوجود امریکی اہلکاروں کی متعصّبانہ تلخ نوائی اور بھارتی نقطۂ نظر کی اندھی حمایت، اس امر کا مظہر ہے کہ امریکہ توازن گنوا چکا ہے اور وہ ایسی مستقیم راہ پر چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جو حق و انصاف کی ترجمان ہو۔

کدورتیں ہی کدورتیں۔ لیکن میرے دل سے نور کا ایک ہالہ سا پھوٹ رہا ہے۔ مدینہ منورہ کے لیے رخت سفر باندھ رہا ہوں اور ایک عجب سی خوشبو میری سانسوں میں بسی جا رہی ہے۔

اے خنک شہرِ کہ آں جا دلبر است

[11-06-2009]

# مولائے یثرب ﷺ کے حضور (1)

جب بھی گرداب بلا بپھرنے لگتا ہے، آنکھیں نامطلوب منظروں کی حدت سے سلگنے لگتی ہیں، دعائیں زائد المیعاد دواؤں کی طرح بے اثر ہوجاتی ہیں اور بے قابو ہوجانے والے حالات کے سدھار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو مجھے مدینہ بہت یاد آتا ہے۔ مجھے ہی کیا ہر اُس شخص کو مدینہ بہت یاد آتا ہے جو کالی آندھی کی طرح محیط ہوجانے والی مایوسیوں میں کسی سائبان، کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے عجیب سا خیال آتا ہے وہ لوگ زندگی کے اعصاب کش آزار کا سامنا کیسے کرتے ہوں گے جن کے پاس کوئی مدینہ نہیں؟ جب روز و شب دشت بے اماں کی طرح دہکنے لگتے ہوں گے اور آگ برساتا سورج سوا نیزے پہ آ کھڑا ہوتا ہوگا، وہ کس خیمہ عافیت کی طرف دیکھتے ہوں گے؟ کون سی چھت اور کون سی چھتری کا تصور انہیں جینے کا سہارا دیتا ہوگا؟ ہم ہزار گناہ گار، عصیاں کار اور راندۂ درگاہ سہی لیکن اپنے دلوں میں ایک چھوٹی سی مخملی ڈبیا ضرور رکھتے ہیں۔ جب بھی دن بھاری اور راتیں کڑی ہونے لگتی ہیں، بڑے بڑے تناور مادی سہارے دیمک زدہ درختوں کی طرح ٹوٹ گرتے ہیں، تلاطم خیز موجوں کے طمانچے کھاتے ہوئے جب کوئی تنکا بھی ہاتھ نہیں آتا تو یہ مخملی ڈبیا خود ہی کھل جاتی ہے۔ مدینہ اپنی تمام تر محبوبیت کے ساتھ پھیلتا چلا جاتا ہے، گھٹاٹوپ تاریکیوں میں جگنوؤں کی ایک قطار سی نمودار ہوتی ہے، صحراؤں میں نخلستان سے کھل اُٹھتے ہیں اور مایوسیوں کی ماری بنجر زمین سے اُمید کی سرسوں یوں پھوٹ نکلتی ہے کہ سارے منظر بدل جاتے ہیں۔ جن کے پاس کوئی مدینہ ہی نہیں وہ کیا کرتے ہوں گے؟ زندگی کے دامانِ چاک کی بخیہ گری کس سوزن سے کرتے ہوں گے؟

اور وہ کس حال میں ہوں گے جن کے پاس کوئی محمد ﷺ ہی نہیں؟ اُن کے دلوں میں جب مایوسی، نا اُمیدی اور بے یقینی کی آگ بھڑکتی ہوگی تو کس کا تصور اُس آگ پر ساون بھادوں کی بارش بن کر برستا ہوگا؟ دُکھ کی گھڑی میں کس کی یاد آنسو پونچھتی ہوگی؟ کس کا خیال اُن کے رت جگوں میں خواب بن کر اُبھرتا ہوگا؟ کس کا نام شکستگی کے کرب کی مسیحائی کرتا ہوگا؟ کتنی ویران، بے در و دیوار، بے سروسامان ہوگی اُن کی زندگی...... نہ مدینہ، نہ محمد ﷺ، نہ رنگ، نہ خوشبو۔

شاید غیر شعوری طور پر یہ فرار کی کوشش تھی۔ میں دس دن کے لیے دبئی چلا گیا۔ دو دن کے لیے آیا اور دس دن ایران میں گزار دیئے۔ لیکن سب خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عملاً میں دبئی کی رونقوں میں بھی غول بیابانی کی طرح تھا، شام کو ڈاکٹر شاہد مسعود کے ساتھ کسی کیفے میں چائے یا کافی پیتے ہوئے ہم پھر گھنٹے

جنگلوں کی طرف نکل جاتے۔ بظاہر ہم ایک دوسرے کی دل جوئی کرتے لیکن سارے تجزیئے ایک دوسرے کے زخموں پر نمک چھڑکتے رہتے۔ لمبی نشست کے بعد ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے تو زخم زخم پاکستان سامنے آ کھڑا ہوتا۔ تہران، قم اور مشہد میں بھی کوئی دبے پاؤں ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

رات دن بھیڑ ہو کہ تنہائی
ایک سایہ سا ساتھ رہتا ہے

مدینہ پیہم دستک دینے لگا۔ فاٹا، سوات بلوچستان، کراچی، دھماکے، آگ، بارود، لہو، لشکر، آپریشن، انسانوں کے چیتھڑے، لیڈروں کے بیانات، بے خانماں لوگ، زندگی کی تارتار قبا اور ہر گھڑی لگتے درد کے پیوند...... اکثر سرشام میں دل کی مخملی ڈبیا کھول کر مدینہ کی طرف نکل جاتا۔ روضۂ رسول ﷺ کی سنہری جالیوں کے سامنے دیوارِ قبلہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور بس بیٹھا رہتا۔

سعودیہ ایئر لائن کا طیارہ اسلام آباد سے اُڑا، کوئی دو گھنٹے ریاض کے ہوائی اڈے پہ کھڑا رہا۔ جب اس کے پہیوں نے پرنس محمد بن عبدالعزیز ایئر پورٹ کے رن وے کو چھوا تو سورج ڈوب رہا تھا اور کہکشاں مدینہ شہر کا رُخ کر رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی بار اس خنک شہر دلبر میں آچکا ہوں لیکن ہر بار ایک عجب سی کیفیت مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، قدم بے قابو ہونے لگتے، ذہن خالی خالی سا ہو جاتا ہے اور کوئی شے آنکھوں میں بے طرح سلگنے لگتی ہے۔ بہت دن ہوئے شدت درد کی کیفیت میں جب مخملی ڈبیا کو بار بار کھولنے سے بے کلی اور بڑھ گئی تو میں نے ایک کالم لکھا تھا ''مدینہ دُور ہے۔'' وہ دن اور آج کا دن، مدینہ مجھے بلاتا رہتا ہے۔ ذرا دیر ہو جائے تو آخر شب کے کسی گداز لمحے میں ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا میرا کندھا پکڑ کر مجھے جگاتا اور کان میں مشکبوسی سرگوشی کرتا ہے ''اتنی دیر کر دی؟''

روضۂ رسول ﷺ کی سنہری جالیوں کے سامنے کھڑے لوگ بظاہر وہیں کھڑے دکھائی دیتے ہیں، چھوٹے چھوٹے کتابچے کھولے، دعائیں مانگتے ہوئے، روتے ہوئے، گم صم جالیوں کو دیکھتے ہوئے، دربانوں کی سرزنش پر دائیں بائیں حرکت کرتے ہوئے لیکن دراصل وہ وہاں نہیں ہوتے، بہت دُور کی بھید بھری وادیوں کی طرف نکل جاتے اور جانے کس کس کو پکارتے ہوئے خود بھی ایک گونج بن جاتے ہیں۔

میں باب السلام سے داخل ہوا تو یکایک کسی نے کان میں کہا۔ ''خالی ہاتھ ہی آ گئے ہو؟'' گناہوں، لغزشوں اور کوتاہیوں کا بھاری پشتارہ میرے کندھوں پہ لدا ہوا تھا اور میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ نہ پھول، نہ کوئی تحفہ، نہ کوئی سوغات...... ندامت نے میرے قدموں میں زنجیر سی ڈال دی لیکن ایک مقناطیسی کشش مجھے اپنی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔ جب میں جالیوں کے عین سامنے پہنچا اور درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا تو اب کی بار بھی گم ہو گیا۔ آناً فاناً ساری بھیڑ چھٹ گئی، میں یکہ و تنہا رہ گیا۔ سامنے سنہری

جالیاں تھیں اور جالیوں سے پرے نور کے فوارے سے پھوٹ رہے تھے۔ خوشبو میں ڈوبی ٹھنڈی پھوار مجھے بھگوئے دے رہی تھی اور میں ہولے ہولے تحلیل ہو رہا تھا پھر جانے کیوں میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جب بھی حضوری اور حاضری کی سعادت ملے، یہی حال ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ آنسوؤں کے سوا اور کوئی نذرانہ ہوتا ہی نہیں جو حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا جاسکے۔ سارے درد جذب کر لینے والے ایک شفیق لمس نے مجھے چھوا۔ میں نے دیکھا کہ بھیڑ پھر سے آباد ہوگئی ہے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا ہوں اور مجھے ایک ایک کر کے اُن سب کے نام یاد آرہے ہیں جنہوں نے کہا تھا ''ہمارا سلام پیش کرنا'' اور پھر وہ بھی جن کو میرے یہاں آنے کی خبر بھی نہیں لیکن جنہیں میں بھول نہیں پاتا۔

میں کرید کرید کر عزیزوں، دوستوں اور جان پہچان والوں کے نام یاد کرنے لگا۔ سلام و درود، دعاؤں اور التجاؤں کے بعد میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ میں دوسروں کو موقع دینے کے لیے اپنی جگہ چھوڑنے کو تھا کہ کسی نے مجھے کہنی ماری اور بولا۔ ''تمہیں میری یاد نہیں آئی؟ نہ میرے رسول ﷺ کو میرا اسلام پہنچایا، نہ میری دعاؤں اور التجاؤں کی عرضی گزاری؟'' میں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ سب لوگ اپنے آپ میں مگن تھے تو پھر یہ کون تھا؟ پل بھر بعد پر کسی نے میرا کندھا ہلایا۔ ''کتنے بے مروت شخص ہو تم میرا نام تک بھول گئے۔'' میں گھبرا گیا۔ وہ میرے عین پیچھے کھڑا تھا، اُس کے کپڑے خون آلود تھے، کہیں کہیں سے جلے ہوئے بھی تھے، چہرے اور ماتھے پر کئی زخم تھے جن سے لہو رس رہا تھا۔ میں نے ڈر کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟'' اُس نے ایک درد بھری سسکی لی اور خون آلود چہرہ میرے کندھے پہ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں پاکستان ہوں۔ تمہارا پاکستان۔''

[14-06-2009]

---

# مولائے یثرب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور (2)

زخم خوردہ پاکستان میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ خون کے قطرے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سرخ رنگ کے قالین پر گر رہے تھے اور میرے بدن پر کپکپی سی طاری تھی۔ پاکستان، سنہری جالیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بار بار میرا کندھا ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں التجاؤں سے چھلک رہی تھیں اور میں دعاؤں کی قبا بننے میں مصروف تھا۔ میرے ہونٹ نہیں ہل رہے تھے لیکن دل ہی دل میں دعائیں حرم کے کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں اور سنہری جالیوں کو بوسہ دے کر یوں پلٹ رہی تھیں کہ ہر سو ایمان و یقین کے چشمے پھوٹنے لگے تھے۔ ''کوئی کہہ رہا تھا مایوس نہ ہو۔ پاکستان قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ امتحان کے دن گزر جانے کو ہیں۔ آزمائش کی راتیں تمام ہونے کو ہیں۔ اپنے ایمان کو متزلزل نہ ہونے دینا۔ اپنی پہچان نہ بھولنا۔ اپنا تشخص تحلیل نہ ہونے دینا۔ اپنے شہیدوں کے لہو سے دغا نہ کرنا۔ اُن نعروں کو یاد رکھنا جن کے جلو میں تمہارے آبا و اجداد نے پاکستان کی طرف سفر کیا تھا۔ آپس میں ایک ہو کے رہنا۔ تفریق اور تقسیم سے بچنا کہ یہ کار شیطان ہے۔ پھر دیکھنا کوئی پاکستان کا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا......'' ایک عطر بیز گونج میرے اندر کے گنبد میں دائرے بنا رہی تھی اور میرا دل آسودگی سے بھر گیا تھا۔ میں نے پہلو میں کھڑے پاکستان کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظریں ابھی تک سنہری جالیوں پر جمی تھیں۔ لیکن پل بھر میں وہ کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ اُس کے سارے چاک سل گئے تھے۔ اُجلے دامن پر کوئی دھبا باقی نہ رہا تھا۔ چہرے اور ماتھے پر کوئی زخم نہ تھا۔ اُس کے رخسار جوانی کی حدت سے تمتما رہے تھے اور اُس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

کتنے محروم و کم نصیب ہیں وہ جن کے پاس کوئی مدینہ نہیں!

کتنے تہی داماں و قلاش ہیں وہ جن کے پاس کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں!!

میری نگاہ ایک بار پھر جالیوں پر پڑی۔ تین خواب گاہوں کی نشاندہی کے لیے سبز رنگ کے تین گول کتبے لگے تھے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابی بکر صدیقؓ اور عمر بن خطابؓ۔ اور میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے کروٹ لی۔ کتنے مفلس اور سوختہ بخت ہیں وہ جن کی تاریخ میں کوئی ابوبکرؓ ہے نہ عمرؓ، کوئی عثمانؓ ہے نہ علیؓ۔ کیا لوگ تھے کہ عظمت انسانی اُن کے جلال و جمال کی دہلیز پہ سر جھکائے کھڑی ہے۔ کیا ارفع مقام ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں درخشاں ستاروں سے تشبیہہ دی۔ شرک کے مارے ہوئے راہ گم کردہ معاشرے سے کیسے بے مثل و بے نظیر افراد نے جنم لیا کہ انسانیت کی پیشانی کا جھومر بن گئے۔ کس کی

رفاقت وہم نشینی کا اعجاز تھا کہ کردار و عمل کے سانچے یکسر تبدیل ہو گئے۔ کیا سعادت تھی کہ انہوں نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آس پاس دیکھا، چلتے پھرتے، کلام فرماتے، وعظ و تلقین کرتے، نماز کی امامت فرماتے، معمولاتِ حیات بجا لاتے، دشمنانِ اسلام سے لڑتے، بے نواؤں کی دستگیری کرتے اور تاریخ انسانی کے سب سے بڑے انقلاب کی بنیادیں اُستوار کرتے دیکھا۔ اور کیا بے بہا اعزاز تھا اُن کے لیے جنہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہوئی۔ جو ہمدم و ہمراز ٹھہرے۔ محرم و دم ساز قرار پائے۔ اور اُن کی رفعتوں کا تصور کیجئے جو اس جہاں سے گزر جانے کے بعد بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔ جن کا رشتہ رفاقت موت کے بعد بھی برقرار و اُستوار ہے۔ جو اب بھی حاضری اور حضوری کی لذتوں سے سرشار ہیں۔

ابوبکر صدیقؓ کیا دل لے کے آئے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پایاں عشق اور لازوال محبت میں کسی اور کو اپنے قریب نہ آنے دیا۔ مردوں میں وہ پہلے تھے جو اسلام لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا قصد کیا تو صدیق اکبرؓ ہی کو اپنا رفیق سفر چنا۔ قرآن کریم نے ''دو میں دوسرا'' کا حوالہ دے کر اُن کے مقام بلند پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اللہ نے اُس کی مدد کی اور اُس وقت کی جب کافروں نے اُسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ وہ دو میں دوسرا تھا اور دونوں غار میں چھپے ہوئے تھے۔ اُس وقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھی سے کہا تھا غم نہ کھا، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

بیماری کی شدت بڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ حضرت بلالؓ حاضر خدمت ہوئے۔ نماز کی امامت کے بارے میں پوچھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ابوبکرؓ سے کہو نماز پڑھائے۔'' حضرت عائشہؓ بولیں۔ وہ بہت ہی نرم اور گداز دل رکھتے ہیں۔ اپنے اُوپر قابو نہ رکھ سکیں گے۔ رونے لگیں گے اور نمازیوں کی نماز میں خلل پڑے گا۔ بہتر ہو گا حضرت عمرؓ نماز پڑھا دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا۔ ''ابوبکرؓ سے کہو۔'' حضرت عائشہؓ اُٹھ کر حضرت حفصہؓ کے پاس گئیں اور کہا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں۔ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کی دلیل دہرائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔ ''ابوبکرؓ سے کہو۔'' حضرت حفصہؓ پلٹیں اور حضرت عائشہ سے کہنے لگیں۔ تم نے خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کرایا۔ اور وہ چاندنی رات تھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حریم عائشہ میں جلوہ افروز تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر نبی کے دو وزیر آسمان کے فرشتوں اور دو زمین والوں میں سے ہوتے ہیں۔ فرشتوں میں میرے وزیر جبرائیل اور میکائیل ہیں اور اہل زمین سے میرے دو وزیر ابوبکرؓ اور عمرؓ ہیں۔'' ارشاد ہوا ''بس کسی کا مجھ پر کوئی احسان نہیں اُس کا بدلہ ہم نے دنیا میں ہی دے دیا۔ سوائے ابوبکرؓ کے۔ اُس کا بدلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔'' ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوئے کہ آپ کے دائیں طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ اور بائیں طرف حضرت عمرؓ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں موجود صحابہ سے فرمایا۔ ''قیامت کے دن بھی ہم اِسی

طرح اُٹھائے جائیں گے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت کا بارگراں اُٹھانا، اسلامی ریاست کی نگہبانی کرنا اور پورے عزم کے ساتھ اُسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کرنا کوئی کار آسان نہ تھا۔ حضرت عمرؓ سمیت بعض جید صحابہؓ نے مصلحت اور نرمی کا مشورہ دیا لیکن صدیق اکبرؓ نے منکرین زکوٰۃ اور نبوت کے دعویٰ داروں کے خلاف پوری قوت سے اقدام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی راہ میں صدقہ کے لیے کہا تو سارے گھر کا اثاثہ قدموں میں لا ڈھیر کیا۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ "گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا۔" بولے

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بس

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حلقہ صحابہ میں تشریف فرما تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ حاضر خدمت ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص آگ سے آزاد شخص کو دیکھنے کا خواہش مند ہو، وہ ابوبکرؓ کو دیکھ لے۔"

اور کتنے بے مایہ ہیں وہ جن کی صدیوں پر محیط تاریخ میں کوئی ابوبکر صدیقؓ نہیں!!

سنہری جالیوں کے جال کے اُس طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دو وزراء کے جلو میں محوِ خواب تھے اور میں صدیوں کی مسافت پہ کھڑا شاہ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کے جاہ و جلال میں کھو گیا تھا۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

[15-06-2009]

## مولائے یثرب ﷺ کے حضور (3)

جنید و بایزید ہی کیا یہ تو زیرِ آسماں اور بالائے زمین وہ بارگاہ مقدس ہے کہ قدسی بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ صدیق اکبرؓ اور عمر بن الخطابؓ بھی کیا بخت لے کر آئے کہ ابد تک حضور ﷺ کی ہم نشینی کے اعزاز بلند سے ہم کنار ہو گئے۔ بلا شبہ یہ رفعت و شان اُن ہی کے نصیب میں آ سکتی تھی جن سے حضور ﷺ کی محبت، تمام محبتوں سے قوی تھی اور جنہیں خالق ارض و سما اس فضیلت سے ہم کنار کرنا چاہتا تھا۔

اور پھر میں نے سوچا..... کتنا قابل رحم ہے اُن کا افلاس جن کے پاس عمرؓ کے مرتبہ و مقام کی کوئی ہستی نہیں۔ تاریخ عالم کا ورق ورق کھنگال ڈالیے۔ قبیلوں، گروہوں اور قوموں کے احوال پر نظر ڈالیے۔ اُن کے ہیروز، حکمرانوں، مفکرین، مصلحین، فاتحین کو دیکھیے۔ کوئی عمرؓ بن الخطاب کے پاسنگ بھی نہیں ملے گا۔ آل اسماعیل کی ایک شاخ بنو عدی کا فرزند، نام آور خطاب کا بیٹا، تنومند جسم، لمبا قد، وجیہہ و شکیل، نہایت قوی، سخت مزاج، تند خو، مسلمانوں کو آزار پہنچانے میں پیش پیش، لیکن لوحِ تقدیر پر رقم وہ سعید لمحہ آیا تو ایک نئے عمرؓ نے جنم لیا جو حضور ﷺ کی مجسم دعائے مستجاب بن گیا۔ وہ جس کی حکمت و حکمرانی کا لوہا غیر بھی مانتے ہیں۔ تاریخ دان بتاتے ہیں۔ نبوت کا چھٹا سال جا رہا تھا۔ یہ ذوالحجہ کا مہینہ تھا اور بدھ کا دن۔ حضور ﷺ قریش مکہ کے طرزِ عمل سے دل گرفتہ اپنے صحابہؓ کے ہمراہ تشریف فرما تھے کہ اچانک دونوں ہاتھ بارگاہ الٰہی میں دعا کے لیے اُٹھائے اور عرض کیا۔ "اے اللہ! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) سے جو شخص بھی تجھے زیادہ عزیز و محبوب ہے، اُس کے ذریعے اسلام کو قوت عطا فرما۔" اللہ نے عمرؓ کو چن لیا اور ابوجہل کو ہمیشہ کے لیے نامرادی کی سیاہ بختیوں کی نذر کر دیا۔

حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

بصرہ کے حسنؓ، حبشہ کے بلالؓ اور روم کے صہیبؓ کو اللہ تعالیٰ نے کن رفعتوں سے نوازا لیکن کتنی عجب بات ہے کہ مکہ کی خاک سے رشتہ و پیوند رکھنے کے باوجود ابوجہل، ابوجہل ہی رہا۔ یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ عمر اس نیت سے گھر سے نکلے کہ آج نئے دین کے علم بردار محمد ﷺ کا (نعوذ باللہ) کام تمام کر دیں گے۔ راستے میں نعیم بن عبداللہ نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے۔" بولے....

''محمد ﷺ کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔'' اُس نے کہا ''پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی تمہارا دین چھوڑ کر محمد ﷺ کا دین اپنا چکے ہیں۔'' غضبناک ہو کر پلٹے۔ حضرت خباب بن ارتؓ سورۃ طٰہٰ پڑھ رہے تھے۔ بہن اور بہنوئی کو بُری طرح پیٹا۔ بہن فاطمہؓ نے خون آلود چہرہ لیے کہا ''میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' عمر کے دل میں زلزلہ سا بپا ہوا۔ بولے ''یہ اوراق مجھے دو، میں خود پڑھوں گا۔'' بہن نے کہا ''اسے صرف پاک لوگ چھو سکتے ہیں۔'' عمر اُٹھے، غسل کیا۔'' سورۃ طٰہٰ کی چند آیات پڑھیں اور بولے ''یہ تو بڑا عمدہ اور محترم کلام لگتا ہے۔ مجھے بتاؤ محمد ﷺ اس وقت کہاں ہوں گے؟'' بتایا گیا کہ آپ کوہ صفا کے پاس دارارقم میں تشریف فرما ہیں۔ عمر سیدھے وہاں پہنچے۔ دستک دی۔ ایک صحابی نے دروازے کی جھری سے دیکھا کہ عمر تلوار بغل میں لیے کھڑے ہیں۔ حضور ﷺ کو خبر دی۔ حضرت حمزہؓ بولے.... ''دروازہ کھول دو۔ اگر وہ اچھی نیت سے آیا ہے تو اُسے ہم عطا کریں گے اور اگر وہ بُرے ارادے سے آیا ہے تو ہم اُسی کی تلوار سے اُس کا کام تمام کر دیں گے۔'' دروازہ کھلا۔ عمرؓ کو حضور ﷺ کے پاس لایا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یا اللہ! یہ عمر بن خطاب ہے۔ یا اللہ! اسلام کو عمر بن خطاب کے ذریعے عزت اور قوت عطا فرما۔'' عمرؓ تصویر حیرت بنے کھڑے تھے۔ اُن کی نگاہیں سرور عالم ﷺ کے رُخ انور پر جمی تھیں۔ پھر وہ بلند آہنگ لہجے میں بولے ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا اور اسلام کی تاریخ ایک نئے عہد میں داخل ہوگئی۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور حضور ﷺ کو عمر بن خطابؓ یا عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کے قبول اسلام کی دعا مانگے چوبیس گھنٹے نہیں گزرے تھے۔

اور پھر عمرؓ بن الخطاب نے اُن بلندیوں کو چھوا جو صرف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے مطلوب و محبوب کو مل سکتی ہیں۔ اُن کے عہد خلافت میں اسلامی ریاست کرہ ارضی کے شرق و غرب اور شمال و جنوب کی وسعتوں پر محیط تھی لیکن کمال عجز کا عالم یہ تھا کہ کپڑوں پر پیوند لگے تھے اور بیت المال کے اُونٹوں کی گلہ بانی خود فرماتے تھے۔ آخری حج سے پلٹ رہے تھے۔ وادی ضجنان کے مقام پر رُک گئے۔ فرمایا ''بے شک اللہ جسے چاہے نواز دیتا ہے۔ میں کبھی اس وادی میں اپنے والد خطاب کے اُونٹ چرایا کرتا تھا۔ مجھ سے کوتاہی ہوتی تو وہ مجھے بُری طرح مارتا پیٹتا تھا اور آج یہ وقت ہے کہ میرے اور اللہ کے درمیان کوئی نہیں جس کا مجھے خوف ہو۔'' پھر ایک شعر پڑھا۔ ''تمہارے سامنے جو کچھ ہے، اُس کی حلاوت باقی نہیں رہے گی۔ صرف اللہ کی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ یہ مال و دولت، یہ اولاد، سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ بے شک اب موت کے حوض میں داخل ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ وہی حوض جس میں ہم سے پہلے لوگ داخل ہوئے۔''

فیروز لولو نامی ایک نابکار کے ہاتھوں گہرا زخم کھائے تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے

عبداللہ کو بلایا اور فرمایا: ''اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو..... عمرؓ آپ کو سلام کہتا ہے۔ یاد رکھنا امیر المومنین نہ کہنا۔ عرض کرنا۔ عمرؓ بن خطاب اجازت مانگتا ہے، اُسے اپنے دونوں رفیقوں کے ساتھ دفن کیا جائے۔''

یہ محرم کی پہلی تاریخ تھی۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے آپ کی میت قبر میں اُتاری۔ نماز جنازہ حضرت صہیب رومیؓ نے پڑھائی جنہیں حضرت عمرؓ اپنا دوست کہا کرتے تھے۔

میں روضۂ رسول ﷺ کی جالیوں کے عین سامنے، دیوار سے ٹیک لگائے، حضرت محمد ﷺ، ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ بن خطاب کے تین کتبوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ حضور ﷺ ایک بڑی سی سنہری مسند پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے ہیں۔ کابینہ کا اجلاس جاری ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ ''ایک سائل پاکستان کی اُنگلی تھامے آیا ہے۔ اُسے خالی ہاتھ لوٹانا اچھا نہیں لگتا۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ پاکستان وہ سرزمین ہے جس کا مطالبہ کرنے والوں نے لا اله الا الله کے نعرے بلند کیے تھے۔ ہمیں کوئی تدبیر کرنا ہوگی.....''

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور ایک بار پھر میں اپنے پیکرِ خاکی کو وہیں چھوڑ کر کہیں دُور نکل گیا۔

[17-06-2009]

# رب کعبہ کے حضور!

اور جب میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا اور کرۂ ارضی کے ہر گوشے سے آئے ہوئے ہر رنگ ونسل، ہر قبیلے کے مسلمان میرے ہی طرح دائرے میں گردش کرتی لہروں کا حصہ بنے ہوئے تھے اور فضا ''لبیك اللهم لبیك'' کی صداؤں سے گونج رہی تھی تو میں نے سوچا...... ''کتنے محروم وکم نصیب ہیں وہ لوگ جن کے پاس بیت اللہ جیسا کوئی مرکز ثقل نہیں ۔ جو اللہ کی توحید اور خلق خدا کی مساوات کا ایسا کوئی مظہر نہیں رکھتے جن کے پاس ایسا کوئی گھر نہیں جو ہزاروں میل دُور سے آئے لاکھوں دردمندوں کو مادرِ مشفق کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتا ہو۔ جس کی سیاہ مخملی قبا سے ہر پل محبت کی پھوار پھوٹتی رہتی ہو، جو آگے بڑھ کر گناہ گاروں، خطا کاروں کو گلے لگا لیتا ہو، جو دُور دیس سے آئے افتادگان خاک کو اپنے حصار شفقت میں لے کر اُن کے سارے دُکھ جذب کر لیتا ہو......!''

میں مدینہ منورہ سے رُخصت ہوا تو وصل کی لذت سے سرشار دل پر ہجر کی کسک غالب آرہی تھی۔ سڑک کے راستے مکہ معظمہ آتے ہوئے میری آنکھیں گاڑی کے شیشوں سے چپکی رہیں اور میں کبھی سنگلاخ پہاڑوں کے سیاہ رنگ پتھروں اور کبھی ریگ صحرا کی خاکستری موجوں میں گئے زمانوں کے نورانی نقوش پا تلاش کرتا رہا۔ جانے اس شاہراہ سے دائیں یا شاید بائیں کتنی دُور سے میرے حضور ﷺ نے اپنے رفیق خاص، صدیق اکبرؓ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کا سفر کیا ہوگا۔ جانے اُن کی اُونٹنیوں کے قدم کہاں کہاں پڑے ہوں گے؟ جانے کہاں کہاں انہوں نے آرام فرمایا ہوگا؟ کس کس مقام پر انہوں نے پانی کے ساتھ وہ ستو کھائے ہوں گے جو صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ نے ایک تھیلے میں ڈال کر اُونٹنی کے کجاوے سے باندھ دیئے تھے۔ اسماءؓ یہ تھیلا باندھنے کے لیے گھر سے ڈوری لانا بھول گئی تھیں چنانچہ کمر سے بندھی لمبی ڈوری (نطاق) کاٹ کر ستو کا تھیلا باندھ دیا۔ حضور ﷺ اس تدبیر سے خوش ہوئے اور اسماءؓ کو ''ذات النطاقین'' کا لقب عطا فرمایا۔ میری نگاہیں ڈھونڈتی رہیں کہ وہ کون سا ٹیلا ہوگا جہاں کھڑی بنونجار کی بیٹیوں نے ''طلع البدر علینا'' کا سرمدی نغمہ گایا ہوگا۔

تلاش کا سفر بڑا کٹھن ہوتا ہے لیکن اس میں ایک خاص لذت بھی ہوتی ہے ۔ جب یہ سفر کھونے اور پانے کے آشوب سے آزاد ہو جائے تو اور بھی آسودگی بخش ہو جاتا ہے ۔ میری نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا کھوج کچھ نہ پا سکے گا۔ مجھے کوئی اُونٹنی نظر آئے گی نہ اُس کے نقش پا ملیں گے، نہ نور کا وہ ہالہ دکھائی دے گا جو دو عظیم مسافروں کے سروں پہ سایہ فگن تھا۔ لیکن میرا دل آنکھ جھپکنے پر آمادہ نہ تھا۔

شہر مکہ کی پولیس چوکی سے ذرا آگے آ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ وہ کس وقت اچانک گاڑی کے اندر آ کر میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں تو اُسے روضۂ رسول ﷺ کے عین سامنے چھوڑ آیا تھا لیکن جانے کب سے وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور مجھے احساس ہی نہ ہوا۔

حرم میں داخل ہوتے وقت بھی وہ میرے آس پاس تھا۔ طواف کے دوران بھی اُس نے میرے احرام کا ایک کونہ تھامے رکھا۔ مقام ابراہیم پر نفل ادا کرتے وقت بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ صفا مروہ کی سعی کے دوران بھی وہ سائے کی طرح میرے ساتھ جڑا رہا۔ میں نے جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ میری ساری پوٹلیاں دھری رہ گئیں۔ دوستوں عزیزوں کی فرمائشی عرضیوں کا دفتر کھل ہی نہ سکا۔ میں نے اپنے لیے کچھ مانگنے کی کوشش کی تو بھی نہ مانگ سکا کہ ہر بار اُس کی پکار حاوی ہو جاتی تھی۔

اُس کے ماتھے پر سبز پٹی بندھی تھی جس پر ''پاکستان'' لکھا ہوا تھا۔ میں جب کبھی دیارِ حجاز آیا پاکستان کے لیے دعا کرنا نہ بھولا لیکن وہ ڈھیر ساری دعاؤں میں سے بس ایک دعا ہوتی تھی۔ اب کی بار تو وہ میرے دل، میری رُوح اور میرے احساس کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ روضۂ رسول ﷺ کی جالیوں سے لے کر خانہ خدا کی تجلیوں تک وہ میری ہر دعا کا سرنامہ بن گیا۔ میں خود، میرے اہل و عیال، میرے بچے، میرے عزیز، میرے دوست سب پچھلی صفوں میں جا کھڑے ہوئے اور پاکستان سبز عمامہ سر پہ سجائے دعاؤں کا امام بن گیا۔ میں اُس کی سلامتی، اُس کی بقاء، اُس کی ترقی، اُس کی خوشحالی، اُس کے وقار اور اُس کے افتخار کے سوا کچھ مانگ ہی نہ پایا۔ مانگتا کیسے؟ وہ میرے ساتھ جڑا بیٹھا تھا اور پل بھر کے لیے بھی جُدا نہ ہوتا تھا۔

عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ میں مغرب کے انتظار میں حجر اسود کی سیدھ میں بیٹھا تھا کہ یکا یک ایک للکار سی اُٹھی۔ سانولے رنگ، مضبوط جان جثّے اور اُستوار قد کاٹھ کا ایک شخص احرام باندھے باب ملک عبدالعزیز سے داخل ہوا۔ وہ ٹھہرے ہوئے قدموں کے ساتھ خانہ کعبہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس قدر اُونچی آواز میں تلبیہ (**لبيك اللهم لبيك**) پڑھ رہا تھا کہ ایک گونج سی پیدا ہو رہی تھی۔ حرم میں بیٹھے ہر شخص کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس کے لہجے میں ایک درد بھری پکار بھی تھی اور اپنائیت کا ایسا انداز جیسے کوئی گھر کے باہر کھڑا صاحب خانہ کو آواز دے رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ طواف کرنے والوں کے ہجوم میں گم ہو گیا لیکن اُس کی پکار اس وقت تک گونجتی رہی جب تک اذانِ مغرب کی گونج نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں نہیں لے لیا۔

میں دیر تک اُس شخص کے سحر سے نہ نکل سکا جس کا عشق بول رہا تھا۔ جسے کچھ پتا نہ تھا کہ اُس کے

آس پاس کون ہے؟ جو ہزاروں کے ہجوم میں تنہا تھا۔ ہم سب بھی اپنے دلوں میں اسی عشق کی جوت جگائے یہاں آتے ہیں۔ اسی بے تابی شوق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گھڑیوں کا الارم لگا کر تہجد کی نماز پڑھتے ہیں۔ کعبتہ اللہ سے قریب تر بیٹھنے کی سعی کرتے ہیں۔ دعائیں مانگتے، گڑگڑاتے اور روتے ہیں اور جب واپسی اختیار کرتے ہوئے بورڈنگ کارڈ تھام کر ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہیں تو ساری توجہ اپنے اسباب پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ جب پاکستان کے کسی ایئرپورٹ پر اُترتے ہیں تو آپ کے پاس زم زم کے دو چار کنستروں، کھجور کی پوٹلیوں، جانماز کے بنڈلوں اور پلاسٹک کی تسبیحوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سارا عشق، سارا جنون ہم اُسی طرح میقات پر چھوڑ آتے ہیں جس طرح جاتے ہوئے وہاں سے احرام باندھتے ہیں۔ مکہ مدینہ سے ہمارا عشق ہمارے کردار میں ڈھل جاتا تو ہم یوں خوار وزبوں کیوں ہوتے؟

مکہ سے جدہ اور وہاں سے اسلام آباد آتے ہوئے میں نے بہت تلاش کیا لیکن وہ میرے آس پاس نہ تھا۔ جہاز میں بھی کوئی ایسا دکھائی نہ دیا جس کے ماتھے پہ سبز پٹی بندھی ہو اور اُس پر ''پاکستان'' لکھا ہو۔ شاید وہ مکہ میں ہی رہ گیا۔ شاید وہ حجر اسود کے سامنے یا حطیم میں میزاب رحمت کے نیچے بیٹھا انتظار کر رہا ہو کہ کب مدینہ کی کابینہ کی سفارش بیت اللہ شریف پہنچتی اور کب کاتب تقدیر اس پر اپنے دستخط ثبت کرتا ہے۔

[18-06-2009]

---

# کیا سرفراز نعیمی کا لہو بھی!

وہ جمعتہ المبارک کا دن تھا اور مسجد نبوی ﷺ کے دالان ہجوم عاشقان سے چھلک رہے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد جب میں ایک گوشے میں بیٹھا کبھی روضۂ رسول ﷺ اور کبھی عاشقان رسول ﷺ کی طرف دیکھ رہا تھا تو طرح طرح کے خیالات قلب و ذہن میں مچلنے لگے تھے۔ مجھے اصحاب صفہؓ یاد آ گئے تھے جو بارگاہ رسالت ﷺ سے کسب فیض کے لیے جانے کہاں کہاں سے یہاں آئے تھے۔ انہیں حضور ﷺ سے اور حضور ﷺ کو اُن سے کیسی محبت تھی کہ داستانیں چھوڑ گئی۔ اُن میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی تھے۔ فرماتے ہیں "میں نے 70 ایسے افراد کو دیکھا کہ اُن کے کپڑے اُن کی رانوں تک نہیں آتے تھے۔ جب نماز پڑھتے تھے اور رکوع میں جاتے تھے تو کپڑوں کو اپنے ہاتھ سے سمیٹ لیتے تھے کہ پردہ دری نہ ہو۔ ایک دوسرے سے یوں جڑ مل کر بیٹھے تھے کہ ایک کے ذریعے دوسرے کی پردہ پوشی ہوتی رہے۔ کئی بھوک اور ضعف سے دوران نماز گر جاتے۔" ایک دن کچھ نے حضور ﷺ سے عرض کیا "کچھ کھانے کو نہیں ملتا، کھجوروں نے ہمارے پیٹ جلا دیئے ہیں۔" حضور ﷺ نے خاموشی اختیار کی لیکن دل ہی دل میں کہا "تمہیں کیا خبر، ایک یا دو مہینے سے رسول ﷺ کے گھر میں دُھواں نہیں اُٹھا۔ صرف پانی اور کھجور پر بسر ہے۔" پھر مجھے اپنے ہاں کے وارثانِ منبر و محراب، واعظانِ خوش کلام، صاحبانِ جُبّہ و دستار اور سفیرانِ دعوت وارشاد کا خیال آیا جو دنیا کے ہو کر رہ گئے ہیں اور جن کا کروفر بڑے بڑے اہل دولت وحشمت کو بھی شرماتا ہے۔ جمعہ کے وقت ہجوم ایک بے کراں سمندر بن چکا تھا۔ بصد مشکل سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کے برآمدے تک پہنچ پایا۔ امام مسجد نبوی ﷺ، خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ مجھے اپنے فون پر ایک پیغام موصول ہوا "لاہور میں بم دھماکا، ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہید ہو گئے۔" میرے دل میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی اور آپ ہی آپ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ نماز تمام ہوئی۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ "اللہ اُس پاک باز شہید کے درجات بلند فرما، اُسے اُس مقام بلند سے نواز جو سچے عاشقان رسول ﷺ کے لیے مخصوص ہے، اُسے دربار رسالت ﷺ کے خاصان میں شمار فرما۔" مغرب کے بعد میں نے روضۂ رسول ﷺ پر حاضری دی اور شہید کی رُوح کا سلام پہنچایا۔ جالیوں سے آتی ٹھنڈی معطر ہوا کے ایک جھونکے نے کہا "وہ ہمارے حلقہ نور میں پہنچ چکی ہے۔"

علماء کے قتل کا سلسلہ ایک مدت سے جاری ہے۔ ہر مسلک اور ہر مکتب فکر اپنے شہداء کی فہرست رکھتا ہے۔ سرفراز نعیمی تو ایک صلح کل شخص تھا۔ میں نے کبھی اُس کی زبان سے کوئی تلخ جملہ، کوئی تند و تیز لفظ اور

کوئی ناثر اشیدہ تبصرہ نہیں سنا۔ ایک خاص مسلک کا ترجمان اور سرکردہ نمائندہ ہونے کے باوجود اُس کی گفتگو میں دوسروں کے لیے ملائمت اور نرمی تھی۔ وہ دینی تعلیم کے علاوہ جدید دُنیوی علوم سے بھی آراستہ تھے۔ حافظ قرآن ہونے کے ناتے اُن کا سینہ انوار کا خزینہ تھا۔ وہ توپ، تلوار، بندوق اور کلاشنکوف جیسی چیزوں سے ناآشنا تھا۔ وکالت کی ڈگری بھی لے رکھی تھی اور دلیل پر یقین رکھتا تھا۔ اُس کے لہجے میں عالمانہ تفاخر کی رمق تک نہ تھی۔ وہ گھن گرج کا آدمی تھا ہی نہیں۔ ساون کی بارشوں کے خروش کے بجائے وہ دسمبر کی رِم جھم جیسا تھا جو پھوار کی طرح برستی اور دلوں کو نہال کر جاتی ہے۔

مجھے دوبار جامعہ نعیمیہ کی تقریبات میں جانے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ کم از کم تین بار وہ میرے گھر تشریف لائے۔ وہ جب بھی کسی تقریب کے لیے بلاتے تو پہلے ٹیلی فون کرتے، پھر باضابطہ دعوت نامہ بھجواتے اور پھر خود تشریف لاتے۔ میں ہر بار کہتا کہ ڈاکٹر صاحب فون ہو گیا، دعوت نامہ آ گیا، اب آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں۔ لیکن وہ لطافت میں ڈوبا ایک ہی جملہ فرمایا کرتے ''اس بہانے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے گا۔'' میں نے کبھی انہیں چمکتی دمکتی کسی عالی نسب گاڑی پر نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ہی پرانے ماڈل کی چھوٹی سی گاڑی پر ہوتے جو کئی ہچکیاں لینے کے بعد اسٹارٹ ہوتی تھی۔ ہمارے جید علمائے کرام میں سے شاید ہی کوئی ایسی گاڑی میں بیٹھنے کی خجالت برداشت کرے۔ انہوں نے موٹر سائیکل رکھا ہوا تھا۔ میں نے خود ایک بار انہیں موٹر سائیکل پر سوار دیکھا۔ وہ ان خرخشوں سے بے نیاز تھے۔ اُن کے لباس میں بھی کمال کی فقیرانہ سادگی تھی۔ نہ جبہ، نہ عمامہ، نہ کلاہ، نہ دستار۔ کوئی واقف نہ ہو تو قیاس نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ مولانا ڈاکٹر سرفراز نعیمی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے بڑے باپوں کی اولاد چھوٹی اور ہلکی نکلی لیکن مولانا محمد حسین نعیمی کی رُوح آسودہ ہو گی کہ اُن کا بیٹا سرفراز، شہادت کے منصب عظمیٰ پر سرفراز ہوا اور انہیں بھی سرفراز کر گیا۔ ڈاکٹر سرفراز نعیمی محنت اور مشقت کرنے والے شخص تھے۔ انہوں نے بھرپور ریاضت سے نہ صرف اپنے عظیم والد کی علمی وراثت کو سنبھالا بلکہ اس میں گراں قدر اضافہ بھی کیا۔ ایک بار انہوں نے مجھے جامعہ کا تفصیلی دورہ بھی کرایا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اس عظیم کام کے لیے ڈاکٹر صاحب وقت کہاں سے نکالتے اور وسائل کیسے فراہم کرتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران علامہ اقبال کا ایک شعر مسلسل میرے ساتھ ساتھ رہا۔ کبھی خیال میں، کبھی ہونٹوں پر

تو اے مولائے یثرب ﷺ آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی، میرا ایماں ہے زنّاری

بلاشبہ ہماری سوچ مغرب زدہ ہے اور ہمارا ایمان شرک و بت پرستی میں لت پت ہے۔ ایسے

میں صرف حضور ﷺ کی نگاہ کریم ہی دلوں کی دنیا بدل سکتی اور سوچ کو روشنی عطا کر سکتی ہے۔ مولائے یثرب ﷺ کی چارہ سازی کے بغیر نہ علم کسی کام کا نہ حکمت و دانش سے کچھ حاصل۔ ڈاکٹر سرفراز نعیمی یقیناً مولائے یثرب ﷺ کے دامان رحمت کے سائے تلے تھے۔ عشق رسول ﷺ اُن کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ رسالت مآب ﷺ کے خاکوں کا مسئلہ تھا تو سرفراز نعیمی احتجاج کے سب سے بڑے پرچم بردار تھے۔ انہیں قید و بند سے بھی گزرنا پڑا لیکن ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ نواز شریف کے خاندان سے تعلق کے باعث انہیں مشرف حکومت کی طرف سے دباؤ کا بھی نشانہ بننا پڑا۔ وہ سرکار دربار کے آدمی نہیں تھے۔ چاہتے تو میاں صاحب سے ٹکٹ مانگ کر قومی اسمبلی یا سینیٹ میں پہنچ جاتے لیکن کبھی اس کی آرزو نہ کی۔ جامعہ نعیمیہ کی دیکھ بھال اور اس کا فروغ، اُن کی بڑی ترجیح رہی۔ اتحاد المسلمین کے لیے وہ ہمیشہ سرگرم رہے۔ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کے فورم سے بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ نفرتوں کے کاروبار سے ناآشنا تھے۔ اُن کی زندگی کے آخری ایام سے اندازہ ہوتا ہے جیسے بہت دُور سے اُن کا محبوب انہیں بلا رہا تھا اور انہیں اپنے لہو میں نہا کر قبائے شہادت پہننے کی جلدی تھی۔

بیت اللہ کا ایک طواف ڈاکٹر سرفراز نعیمی کی رُوح پاک کی نذر کرنے کے بعد مقام ابراہیم کے سامنے آب زمزم پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کیا شہید مرد درویش کا لہو بھی رُخ پاکستان کا غازہ نہیں بن سکے گا؟

[20-06-2009]

# حج ــــ بدعنوانی کے دروازے بند کریں! (1)

بہت سی خواہشیں، ضرورتوں سے جنم لیتی ہیں اور بہت سی آرزوئیں حرص و ہوس کی کوکھ سے پھوٹتی ہیں۔ انسان انہی ضرورتوں، خواہشوں اور آرزوؤں کے ریگ زاروں میں بھٹکتے بھٹکتے تمام ہو جاتا ہے۔ دل بے مدعا بھی ایک نعمت ہے جو انسان کو قناعت کے خیمہ عافیت کی طرف لے جاتی ہے اور بے مہار خواہشوں کے آزار سے پناہ دیتی ہے۔ البتہ ایک آرزو ہر مسلمان کے دل میں چنبیلی کے پھول کی طرح مہکتی رہتی ہے کہ کاش کسی روز اُس کے معمولات کی باگیں دیارِ حجاز کی طرف مڑ جائیں۔ اُسے حج و عمرہ کی سعادت نصیب ہو۔ اُسے روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کی توفیق ملے۔ کروڑوں انسان لمبے عرصے تک اس آرزو کی آتش خاموش میں سلگتے اور خواب کو اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتے رہتے ہیں۔ بالآخر کچھ کے لیے بابِ کرم وا ہو جاتا، کچھ کو انتظار کرنے والوں کی لمبی قطار میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور کچھ کم نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سنگلاخ سینوں میں چنبیلی کا پھول کھل ہی نہیں پاتا اور کھلتا بھی ہے تو اس کی خوشبو حرص و ہوس کے مرطوب جنگلوں کی باس میں گم ہو جاتی ہے۔

اب کی بار میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ تھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کئی زائرین عمرہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اُن پاکستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو برس ہا برس سے وہاں موجود ہیں اور حج سے متعلقہ معاملات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ سعودی شخصیات سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے افراد سے بھی گفتگو رہی۔ میں نے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت طے کر لیا تھا کہ کچھ معروضات صدر زرداری اور وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی خدمت میں پیش کروں گا کہ اُن کی ذاتی توجہ اور مداخلت کے بغیر شاید اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نہ نکل سکے۔ بدگمانی گناہوں میں شمار ہوتی ہے۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لینے سے روکا گیا ہے۔ اس لیے میں اُن کہانیوں سے صرف نظر کر رہا ہوں جو سعودی عرب میں پھیلی ہوئی ہیں کہ کس طرح سرکاری عازمین حج کے لیے عمارتوں کا انتخاب ہو رہا ہے؟ کس کے تعلق دار کیا گل کھلا رہے ہیں؟ کون سے تین بڑوں کی عالی مرتبت میٹنگ میں فی حاجی کے حساب سے مال کی بندر بانٹ پر گفتگو ہوئی؟ میرے ذرائع مستند بھی ہیں اور قابل اعتماد بھی لیکن میں ان سب سے انحراف کرتے ہوئے چند پہلوؤں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو پیپلز پارٹی کی حکومت کے لیے توجہ طلب ہیں۔

حج کے انتظام و انصرام کو حکومتی شکنجوں اور بیوروکریسی کے گورکھ دھندوں سے آزاد کر کے پرائیویٹ

آپریٹرز کے ہاتھ میں دینے کی پالیسی، سعودی حکومت کی وضع کردہ ہے۔ اس پالیسی کے تحت بتدریج تمام حجاج حکومتی گرفت سے آزاد ہو جائیں گے۔ اس وقت پاکستان سے کم وبیش ایک لاکھ ساٹھ ہزار حاجی فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے بھیجے جا رہے ہیں۔ اَسّی ہزار حجاج کا انتظام وزارت مذہبی اُمور خود کرتی ہے جب کہ اَسّی ہزار حجاج کا کوٹہ 591 پرائیویٹ حج آپریٹرز میں بانٹ دیا گیا ہے۔ عمومی طور پر یہ تجربہ اچھا رہا ہے۔ لیکن پرائیویٹ حج اسکیم پر کڑے وزارتی کنٹرول کے تحت بعض سنگین مسائل پیدا ہو رہے ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے کسی بڑے انقلابی اقدام کی ضرورت ہے۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کسی حج آپریٹر کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ اس سال اُسے کتنے حاجیوں کا کوٹہ ملے گا۔ اس کا براہ راست تعلق مکہ اور مدینہ میں حجاج کی رہائش گاہوں سے ہے۔ جب تک آپریٹر کو معلوم نہ ہو کہ اُسے کتنے حجاج کا کوٹہ ملے گا، وہ اُن کی رہائش کے لیے کسی سے کوئی معاہدہ نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرے ممالک کی حکومتیں اور کمپنیاں قریبی اور اچھی رہائش گاہ مناسب کرایوں پر حاصل کر لیتی ہیں۔ جب ہمارے آپریٹرز کو اپنے کوٹے کا پتا چلتا ہے تو بچی کھچی عمارتوں کے نرخ بھی آسمان تک پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ گزشتہ برس کی بدنظمی اپنی مثال آپ تھی۔ عین موسم الحج میں وزارت کے تین سیکرٹری تبدیل ہوئے۔ معاملات عدالتوں میں رُلتے رہے۔ مقدمات کا تعلق پرائیویٹ حاجیوں سے تھا لیکن وزارت حج اپنے حاجیوں کا مناسب اہتمام بھی نہ کر پائی۔ سعودی حکام کے ٹائم ٹیبل کے مطابق تمام حکومتوں پر لازم ہے کہ وہ 15 رجب تک ٹور آپریٹرز اور ان کے کوٹے کی تفصیلات فراہم کر دیں۔ حکومت پاکستان نے گزشتہ برس تقریباً چار ماہ کی تاخیر کی۔ جب ذوالقعدہ میں حج پروازیں شروع ہوئیں اور دوسرے ممالک کے حجاج سرزمین مقدس پہنچنے لگے تو ہماری وزارت حج اُس وقت بھی کوٹوں سے کھیل رہی تھی۔ ردوبدل جاری تھا۔ سعودی وزارت حج پیہم برہمی کا اظہار کر رہی تھی لیکن یہاں کی ترجیحات ہی کچھ اور تھیں۔ یہی صورت حج پاسپورٹوں کی بروقت تیاری نہ ہونے سے پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے سبب ویزوں میں بھی تاخیر ہوئی۔ اور یہ ستم بھی صرف پاکستان ہی میں ہوا کہ ہر سیکٹر سے سینکڑوں عازمین، احرام باندھے حاجی کیمپوں میں بیٹھے رہ گئے۔ کئی جہاز خالی جاتے رہے۔ شاید پاکستان ہی کے تلخ تجربے کے باعث اس سال سے انٹرنیشنل پاسپورٹ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ پرائیویٹ ٹور آپریٹرز کو تشویش ہے کہ انہیں اپنے عازمین کے پاسپورٹ تیار کروانے میں بھی مشکلات پیش آئیں گی۔ وزارت مذہبی اُمور کی نااہلی کو وزارت داخلہ کا تڑکا بھی لگ گیا تو گزشتہ برس کی بدنظمی دوچند ہو جائے گی۔

اس برس کی حج پالیسی میں ٹور آپریٹرز کی پانچ کیٹیگریز بنانے کا ایک نیا تصور پیش کیا گیا ہے۔ ہر کیٹیگری کے لیے ایک مخصوص نقد زرِ ضمانت ضروری قرار دی گئی ہے۔ اے کیٹیگری کے ہر ٹور آپریٹر کو پچاس لاکھ، بی کو چالیس لاکھ، سی کو تیس لاکھ، ڈی کو بیس لاکھ اور ای کو دس لاکھ روپے، نقد کی صورت (کیش

گارنٹی) وزارت مذہبی اُمور کے کھاتے میں جمع کرانا ہوں گے۔ اگرچہ ہر کیٹگری کے تعین کے لیے کچھ شرائط وضع کی گئی ہیں لیکن ان سب کی اصل بنیاد ''صوابدید'' ہے۔ کسی کمپنی کو کسی بھی کیٹگری میں رکھنے کے لیے وزارت کے اپنے اہلکار اور افسران مسند انصاف پر بیٹھیں گے۔ نئی حج پالیسی میں قرار دیا گیا ہے کہ کسی بھی کمپنی کو دیئے جانے والے کوٹے کا تعین اُس کی کیٹگری کے تعین کے بعد ہوگا۔ یوں ایک بار پھر کوٹے کی گٹھڑی کھول دی گئی ہے اور جب بھی یہ گٹھڑی کھلتی ہے، منڈی، بولیوں اور مول تول کا کاروبار بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اب ہر ٹور آپریٹر کے سامنے تین سوال کھڑے ہو گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کا شمار کس کیٹگری میں ہوگا، دوسرا یہ کہ اسے کتنے حاجیوں کا کوٹہ ملے گا اور تیسرا یہ کہ وہ اتنی بھاری رقم کی کیش گارنٹی کا بندوبست کیسے کرے؟ چونکہ بیوروکریسی کا دھندہ اِسی طرح کے سوالوں کی بنیاد پر چلتا ہے اس لیے وہ اپنے ہتھیار تیز کیے بیٹھے ہیں۔ پرائیویٹ کمپنیوں کی درجہ بندی ناقابل فہم ہے۔ حکومت ہی کی شرائط کے مطابق ہر کمپنی کے لیے پچاس لاکھ روپیہ ''پیڈ اپ کیپٹل'' ضروری ہے۔ اب پچاس لاکھ کی نقد زرضمانت کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کمپنی اپنے سارے اثاثے بیچ کر حکومت کو دے دے۔ ''نقد زرضمانت'' کی بیخ کئی نئے مسائل پیدا کرے گی۔ کمپنیوں کو نئے سرمایہ کار تلاش کرنا پڑیں گے۔ حجاج کو مزید بوجھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ایک اندازے کے مطابق وزارت حج کو اس طرح دو ارب روپے سے زائد کی رقم وصول ہوگی۔ بعض اطلاعات کے مطابق اس کا ''مصرف'' بھی تلاش کر لیا گیا ہے۔ اگر صدر اور وزیر اعظم نے کیش زرضمانت کے اس فتنہ پرور تصور کا خاتمہ نہیں کیا اور درجہ بندیوں کی تجویز پر خط تنسیخ نہ پھیرا تو وزارت مذہبی اُمور، حکومت کی ''نیک نامی'' میں اتنا اضافہ کرے گی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کیسے لوگ ہیں جو مکہ مدینہ کے مسافروں کی جیب تراشی سے بھی باز نہیں آتے؟

[28-06-2009]

# حج ــــ بدعنوانی کے دروازے بند کریں (2)

وزارت مذہبی اُمور کا بنیادی وظیفہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ حجاج کو ہر ممکن سہولت فراہم کرنے اور اُن کے سفر سعید کو آسان بنانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں روایتی سرکاری سوچ کی کارفرمائی ہے۔ عمر بھر پائی پائی جوڑ کر تکمیل آرزو کا اہتمام کرنے والا حاجی، ان کے لیے شکار کی حیثیت رکھتا ہے جس کو نچوڑنے کے لیے نت نئے حربے ایجاد کیے جاتے ہیں۔ پرائیویٹ ٹور آپریٹر کو حاجی کھلی مارکیٹ سے حاصل کرنا ہوتے ہیں جہاں زبردست مسابقت پائی جاتی ہے۔ اُسے اپنی ساکھ بحال رکھنے کی فکر بھی ہوتی ہے۔ اُسے خوف لاحق رہتا ہے کہ کسی کوتاہی پر سعودی وزارت حج اُس کی کمپنی کی بندش کا فرمان جاری کر سکتی ہے۔ دو چار شکایتیں ہو گئیں تو پاکستانی وزارت مذہبی اُمور اُس کا لائسنس منسوخ کر سکتی ہے۔ اچھی خدمات نہ دی گئیں تو رُسوائی کی کہانیاں پاکستان تک جائیں گی اور اگلے برس کوئی حاجی تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر ہر پرائیویٹ حاجی اپنی رہائش گاہ اور دوسری سہولیات کا موازنہ دیگر کمپنیوں کے حجاج سے کرتا ہے۔ یہی اسباب ہیں کہ ہر آپریٹر کم سے کم رقم کا پیکج بنانے، مکہ اور مدینہ میں اچھی رہائش گاہیں لینے، منیٰ میں قریب ترین مکتب کا اہتمام کرنے اور حاجیوں کو زیادہ سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معلم کی فیس، منیٰ کی رہائش اور ٹرانسپورٹیشن کی مدد کے لیے مخصوص رقم پرائیویٹ آپریٹرز سے حکومت ضرور وصول کر لیتی ہے لیکن اپنے حاجیوں کی سہولت کے لیے ان آپریٹرز کو ساڑھے تین سو ریال سے لے کر دو ہزار ریال فی حاجی زائد دے کر بہتر مکتب حاصل کرنا پڑتے ہیں۔ وزارت حج کے ''مانیٹرز'' پرائیویٹ اسکیم کے حاجیوں کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی چھوٹی موٹی مشکل پیش آئے اور انہیں آرگنائزر کو دبوچنے کا موقع ملے۔ حج ختم ہونے پر اسلام آباد میں ان شکایات کے دفتر کھل جاتے ہیں۔ ٹور آپریٹرز کی پیشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پیشگی جمع کرائی گئی گارنٹی (پانچ ہزار روپے فی حاجی) کی واپسی میں رخنے ڈالے جاتے ہیں، ''صوابدید'' کا شیش ناگ پھر پھنکارنے لگتا ہے۔ اپنی کمپنی کو شکایت کے داغ سے بچانے اور گارنٹی حاصل کرنے کے لیے ٹور آپریٹر کو ایک بار پھر وزارتی افسروں اور اہلکاروں کا لقمہ تر بننا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ان اَسّی ہزار حجاج کی آپ بیتیاں سننے والا کوئی نہیں ہوتا جو خود سرکاری اسکیم کا حصہ ہوتے ہیں اور جنہیں قدم قدم پر مشکلات و مصائب سے پالا پڑتا ہے۔ تازہ حج پالیسی میں بھی وزارت مذہبی اُمور نے نوید دی کہ سرکاری حجاج کو دو ہزار میٹر سے دُور کی رہائش گاہیں دی جائیں گی۔ کم و بیش دو کلومیٹر کا فاصلہ کاغذوں میں بتایا گیا ہے۔ عملاً ان حاجیوں کو جانے کتنی دُور، کس طرح کی

رہائش گاہوں میں ٹھہرایا جائے گا اور ان پر کیا گزرے گی۔ اتنی دُور رہائش کے لیے بھی حکومت سرکاری حاجیوں سے (رہائش کی مد میں) 3200 ریال فی کس لے رہی ہے جب کہ پرائیویٹ آپریٹرز اتنی ہی رقم میں اس سے کہیں قریب تر رہائش فراہم کررہے ہیں۔ آج تک کسی کو نہیں بتایا گیا کہ سرکاری حجاج نے اپنی مشکلات کے بارے میں کتنی شکایات کیں؟ ان شکایات پر کیا کارروائی عمل میں آئی؟ کتنے اہلکاروں کے خلاف کارروائی کی گئی اور آئندہ کے لیے کیا پیش بندی کی گئی؟

بدعنوانی کا ایک اور دریچہ، ٹور آپریٹر کو اس کے مطلوبہ فلائٹ شیڈول کی فراہمی ہے۔ وزارت کے کرتوں دھرتوں کو جب اندازہ ہو جائے کہ کسی ٹور آپریٹر کے لیے ایک مخصوص تاریخ پر حاجیوں کو مکہ پہنچانا مجبوری بن گیا ہے تو وہ مول تول کرتے اور اُس کی مجبوری سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

پی آئی اے اربوں روپے خسارے میں جانے والا ادارہ ہے۔ وہ صرف عازمین حج و عمرہ کو اپنے خسارے میں کمی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وزارت مذہبی اُمور نے کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی کہ نجی ایئرلائنز کو بھی حج آپریشن میں لایا جائے تاکہ صرف دو کمپنیوں (پی آئی اے اور سعودیہ) کی اجارہ داری ختم ہو۔ 2007ء میں حج کا کرایہ 47 ہزار روپیہ تھا۔ گزشتہ برس 2009ء میں میں کم وبیش چالیس ہزار کا اضافہ کر کے 86600 روپے کر دیا گیا۔ جواز یہ تھا کہ پٹرول کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ اب یہ قیمتیں 2007ء کی سطح سے بھی نیچے آ گئی ہیں لیکن کرائے کی مد میں صرف 13600 روپے کمی کی گئی ہے۔ اس سال کرایہ 73000 روپیہ ہوگا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مجموعی رقم میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ گزشتہ سال بھی سرکاری اسکیم کے ہر حاجی کو دو لاکھ روپے ادا کرنا تھے اور اس سال بھی دو لاکھ روپے وصول کیے جائیں گے۔ اب کے وزارت مذہبی اُمور کی دلیل یہ ہے کہ ریال کا نرخ بڑھ گیا ہے اور رہائش کی مد میں زیادہ خرچ آئے گا۔ اس کے علاوہ ہر حاجی کو پاسپورٹ بھی بنوانا ہے جس کے لیے اُسے 2100 روپیہ الگ ادائیگی کرنا ہوگی۔ وزارت نے تو حکم جاری کر دیا کہ 11 جولائی تک عازمین حج اپنی درخواستیں جمع کرا دیں لیکن اس قلیل عرصے میں اُن کے پاسپورٹ کیسے تیار ہوں گے؟ منیٰ وعرفات تو دُور ہیں لیکن عمر رسیدہ مردوں اور عورتوں پر کیا گزرے گی جو اس شدید گرمی میں پہروں لمبی قطاروں میں پگھلتے رہیں گے۔ بنگلہ دیش اور بھارت نے متوقع مشکلات کی پیش بینی کرتے ہوئے سعودی حکومت سے بین الاقوامی پاسپورٹ کی پابندی ایک سال کے لیے مؤخر کرا لی ہے۔ ہماری وزارت کے منہ میں گھنگھنیاں پڑی ہیں لیکن رال ہے کہ مسلسل ٹپک رہی ہے۔ منیٰ میں پاکستان کے سرکاری حجاج میں سے بیشتر کو منیٰ کی حدود سے باہر، مزدلفہ میں ٹھہرایا جاتا ہے جہاں سے انہیں رمی جمرات کے لیے میلوں کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ پرائیویٹ آپریٹرز اضافی رقم دے کر کوشش کرتے ہیں کہ حاجیوں کو قریبی مکتب دلایا جائے۔ سرکار اس سے بے نیاز ہے۔ گزشتہ سال انڈیا حج مشن نے اپنے سرکاری اور پرائیویٹ عازمین حج کے لیے جنوبی ایشیا فاؤنڈیشن کے ساتھ ایک

معاہدہ کر لیا جس کے تحت 630 ریال فی حاجی کے حساب سے اس کے تمام حجاج کو منیٰ اور عرفات میں خصوصی سہولتیں دی جائیں گی اور بھارت کے تمام حاجی ایک ساتھ رہیں گے۔ ہمارے کار پردازانِ وزارت کی ترجیحات دوسری ہیں۔

بلاشبہ پرائیویٹ آپریٹرز خرابیوں اور کوتاہیوں کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کا سخت محاسبہ ہونا چاہیے لیکن یہ کام وزارت کے بجائے کسی معتبر کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔ سعودی حکومت کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی ٹور آپریٹرز کی کارکردگی بہت عمدہ ہے۔ 591 میں سے صرف چار کمپنیاں معمولی بے قاعدگیوں کی مرتکب پائی گئیں جب کہ مجموعی طور پر 250 عالمی کمپنیوں کو بلیک لسٹ کیا گیا جن میں بھارت کی 21 کمپنیاں بھی شامل ہیں۔

صدر زرداری اور وزیراعظم گیلانی کو وزارت مذہبی اُمور کے معاملات پر فوری توجہ دیتے ہوئے بدعنوانی کے تمام دروازے اور دریچے بند کر دینے چاہئیں۔ لاکھوں کی نقد زرضمانت، کیٹیگریز کی درجہ بندی، کوٹے کی صوابدیدی تقسیم، مطلوبہ پرواز شیڈول اور مکہ مدینہ میں رہائشوں کا معاملہ بدعنوانی کے بڑے بڑے پھاٹک ہیں۔ ان تمام معاملات کو شفاف بنانے کے لیے کوئی بااختیار پارلیمانی کمیٹی بھی بنائی جاسکتی ہے۔ اگر حکومت اس سب کچھ کو ''معمولی'' سمجھ کر نظرانداز کر دیتی ہے تو جسٹس افتخار محمد چودھری توجہ فرمائیں۔ حج جیسے مقدس مشن کو کرپشن کی آلائشوں سے پاک کرنا ہر اُس شخص کی ذمہ داری ہے جس کے دل میں خوف خدا کی رمق ہے اور جو کچھ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

[29-06-2009]

# ریاض — ایک تحیر کی کہانی

ریاض کے شاہ خالد بن عبدالعزیز ایئرپورٹ سے شہر کو جاتے ہوئے کشادہ شاہراہ کے دائیں ہاتھ مجھے وسیع علاقے پر کسی بہت بڑے تعمیراتی منصوبے کے آثار نظر آئے۔ یہاں کے عمومی موسم کے برعکس ریاض کے آسمان پر بادل تیر رہے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ انجینئر شفیق میتلا گاڑی چلاتے ہوئے بار بار کہہ رہے تھے کہ "ایسا موسم یہاں سالوں بعد آیا ہے۔" میں نے کہا...... "میتلا صاحب! میں نے سوچا کہ اسلام آباد سے کوئی سوغات تو آپ لوگوں کے لیے لیتا آؤں۔" شفیق میتلا پیشے کے اعتبار سے انجینئر، طبیعت کے اعتبار سے قلندر اور مزاج کے اعتبار سے سراپا پاکستانی ہیں۔ قومی تاریخ اور شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ گفتگو شروع کرتے ہیں تو دبستان سا کھل جاتا ہے۔ کوئی تیس برس سے یہاں مقیم ہیں اور مقامی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ میری اُن سے پہلی باضابطہ ملاقات تھی لیکن اُن کی اپنائیت برسوں کی دوستی میں گندھی لگی۔

گاڑی چل رہی تھی اور تعمیراتی منصوبے کے آثار ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ میں نے شفیق میتلا سے پوچھا۔ "یہ کیا بن رہا ہے؟" گاڑی چلاتے چلاتے انہوں نے ایک نظر دائیں ہاتھ دیکھا اور سرشار سے لہجے میں بولے۔ "یہ خواتین یونیورسٹی تعمیر ہو رہی ہے اور شاید دنیا کی سب سے بڑی خواتین یونیورسٹی ہے۔ یونیورسٹی کا نام شاہ عبدالعزیز السعود کی عظیم ہمشیرہ شہزادی نورہ بنت عبدالرحمٰن کے نام پر رکھا گیا ہے۔" گاڑی چل رہی تھی اور ریاض آمد کے بعد میرا پہلا تاثر خوبصورت موسم میں قوس قزح کی طرح پھیلتا چلا گیا کہ آخر کار اسلامی ممالک میں بھی تعلیم پر سرمایہ کاری کرنے کا رُجحان قوی ہو رہا ہے۔

اُمت مسلمہ کے ہمہ پہلو زوال کا ایک بڑا سبب یہی رہا ہے کہ تعلیم کو کبھی ایک بالاتر ترجیح نہیں سمجھا گیا۔ وسائل کا رُخ بالعموم ایسے منصوبوں کی طرف رہا جو قوم کے مستقبل کی تعمیر کے لیے چنداں مفید نہ تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اکیسویں صدی کی ایک دہائی گزر جانے کے بعد بھی اسلامی دنیا کے ستاون ممالک میں صرف پانچ سو سے کچھ اُوپر یونیورسٹیاں ہیں جب کہ صرف بھارت میں پونے نو ہزار کے قریب یونیورسٹیاں کام کر رہی ہے۔ جاپان کے ایک شہر ٹوکیو میں یونیورسٹیوں کی تعداد پورے عالم اسلام کی جامعات سے زیادہ ہے۔ ناخواندہ اور بے ہنر افراد کی بڑی تعداد کا تعلق مسلم ممالک سے ہے۔ سائنس، ایجادات، تحقیق اور علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں ہم کسی گنتی شمار میں نہیں آتے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر

کتاب حکمت کے نزول کا آغاز ہی لفظ اقراء سے ہوا۔ ہمارا دین ہر مرد وزن پر تحصیل علم کو لازم قرار دیتا ہے۔ یہ ہماری کم نصیبی نہیں تو کیا ہے کہ آج بھی ہم تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور دنیا زقندیں بھرتی، منزلیں سر کرتی آگے ہی آگے جا رہی ہے۔ اقبال نے کس دردمندی سے کہا تھا۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی

جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

یہ احساس کس قدر طمانیت بخش ہے کہ پچھلے کم وبیش ایک عشرے سے سعودی عرب تعلیمی انقلاب سے ہم کنار ہے۔ خادم الحرمین شریفین شاہ عبد اللہ بن عبد العزیز کے وژن میں تعلیم کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ پہلے ولی عہد اور بعد ازاں فرمان روا کی حیثیت سے انہوں نے تعلیم کو مرکزی اہمیت دی اور قومی وسائل کا بڑا حصہ جدید علوم کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ انھی پُرعزم کاوشوں کا ثمر ہے کہ سعودی عرب میں خواندگی کی شرح 87 فیصد تک پہنچ گئی ہے جب کہ پندرہ سے چوبیس سال کی عمر کے نوجوانوں میں یہ شرح 99 فیصد کو چھونے جا رہی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کے لیے تعلیم نسواں کا ایک الگ ادارہ بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون نورہ بنت عبد اللہ الفائز کو نائب وزیر تعلیم مقرر کیا گیا ہے۔ وہ سعودی تاریخ کی پہلی خاتون وزیر ہیں۔

شہزادی نورہ بنت عبدالرحمٰن کو شاہی خاندان میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ شاہ عبد العزیز السعود بڑے تفاخر سے کہا کرتے تھے۔ ''میں نورہ کا بھائی ہوں۔'' اُن کا شمار خاندان کی متمول خواتین میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی ایک تہائی میراث رفاہی کاموں اور فروغ علم کے لیے وقف کر گئیں۔ پرنس نورہ یونیورسٹی میں بھی سعودی حکومت کے ساتھ ساتھ شہزادی کے قائم کردہ ٹرسٹ کا اہم کردار ہے۔

یونیورسٹی کا منصوبہ تحیر کی ایک داستان سے کم نہیں۔ اس پر لاگت کا تخمینہ 115 ارب امریکی ڈالر لگایا گیا ہے۔ یونیورسٹی کا رقبہ 80 لاکھ مربع میٹر پر محیط ہے۔ تعمیرات کا رقبہ 30 لاکھ مربع میٹر پر مشتمل ہوگا۔ یونیورسٹی ایک انتظامی بلاک، 13 تدریسی بلاکس، 700 بستروں کے ایک ٹیچنگ اسپتال، جدید ترین لیبارٹریز اور ایک بڑے رہائشی بلاک پر مشتمل ہوگی جس میں اساتذہ اور اسٹاف کی کالونیاں اور طالبات کے ہاسٹلز بنیں گے۔ اس عظیم درس گاہ میں 26 ہزار طالبات تعلیم حاصل کر سکیں گی۔ یونیورسٹی میں جدید علوم وفنون کے تمام اہم شعبوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوگا جس کے لیے عالمی سطح کے ماہرین اور اساتذہ کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔

نسیم محمود اکبر ایک پُرعزم اور نہایت ہمت شعار پاکستانی ہیں۔ برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں اور زرعی شعبے میں بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔ نسیم محمود علمی خانوادے کے فرزند ہیں۔ شعروادب کا ذوق نہایت

پختہ ہے۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ پرنس نورہ بنت عبدالرحمٰن یونیورسٹی کی چمن آرائی کا کام انہیں تفویض ہوا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ سات لاکھ مربع میٹر علاقہ لان پر مشتمل ہوگا جہاں گھاس لگے گی۔ آٹھ لاکھ 10 ہزار مربع میٹر جگہ چمن اور پھول پھلواری کے لیے مخصوص ہوگی۔ بارہ ہزار سایہ دار درخت لگیں گے۔ 19500 کھجور کے درخت لگائے جائیں گے۔ سرسبز گھاس کے قطعات، پودوں اور درختوں کو پانی دینے کے لیے ایک خودکار سسٹم لگایا جارہا ہے۔ یونیورسٹی میں طالبات کی سہولت کے لیے ایک مونوٹرین کا بھی اہتمام ہوگا۔

میں نے محسوس کیا کہ پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان تعلیم کے شعبے میں قریبی اشتراک کار کی بڑی گنجائش ہے۔ ریاض کے گورنر شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز ان دنوں بھارت کے دورے پر ہیں جہاں جامعہ اسلامیہ نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان تعلیمی تعاون کے کئی منصوبوں پر بات ہوئی ہے۔ اس وقت بھی سعودی طلبا کی قابل ذکر تعداد بھارتی درس گاہوں میں زیر تعلیم ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ساری دنیا میں پھیلے ہمارے سفرائے کرام کی ترجیحات ہی کچھ اور ہوتی ہیں۔ سعودی عرب کی سرزمین اہل پاکستان کے لیے بے حد زرخیز ہے اور خادم الحرمین شریفین پاکستان سے خصوصی قلبی رشتہ و تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کچھ کمی ہے تو اس کا سبب ہماری بے نیازی اور تغافل کے سوا کچھ نہیں۔

ریاض، سعودی عرب کا دارالحکومت ہی نہیں، مملکت کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ جدید شہر کی تمام سہولتوں اور رعنائیوں کے باوجود وہ تمام تر علتوں سے پاک ہے۔ گزشتہ روز مجھے ایک دیرینہ دوست خوبصورت شامی ریستوران لے گئے۔ کھانا سجانے والے ویٹر سے میرے دوست نے عربی میں کہا ''یہ بہت بڑا صحافی ہے اور پاکستان سے آیا ہے۔'' جوان رعنا نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور عربی میں کچھ بولا۔ میرے دوست نے قہقہہ لگایا۔ میں نے پوچھا ''کیا کہتا ہے۔'' کہنے لگے ''کہہ رہا ہے، امریکہ کے خلاف لکھتا ہے یا حق میں؟ یہ بتاؤ گے تو پتا چلے کہ بڑا صحافی ہے یا چھوٹا؟''

[18-04-2010]

# ''دارالسلام'' سے سوئے مدینہ

میرے لیے ریاض کی ایک خصوصی کشش دارالسلام اور اُس کے منتظم عبدالمالک مجاہد ہیں۔ ریاض کا قصد کرتے ہی میرے ذہن میں ایک عظیم الشان طباعتی ادارے کا تصور اُبھرتا ہے جس نے 23 برس قبل ایک بہت ہی چھوٹے سے پبلشنگ ہاؤس کے طور پر آنکھ کھولی تھی اور آج وہ بھرپور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہے۔ ایک شخص کے عزم راسخ، مستقل مزاجی اور ہمت شعاری کی یہ داستان میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں لیکن ہر بار یوں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ کہانی پہلی بار کہی جا رہی ہے۔ خطاطوں کے معروف گھرانے میں پیدا ہونے والے عبدالمالک مجاہد نے بھی خطاطی کا فن سیکھا اور سعودی عرب کی وزارت دفاع میں خوشنویس کے طور پر نوکری کر لی۔ تب گوجرانوالہ کے چھوٹے سے گاؤں کیلیانوالہ کے باسی عبدالمالک کے حاشیہ وہم وگماں میں بھی نہ تھا کہ آنے والے چند برسوں میں وہ عالم اسلام کے ایک معروف اشاعتی ادارے کا سربراہ ہوگا اور یہ ادارہ اسلامی علوم بالخصوص قرآن وحدیث کے فروغ کا قابل ذکر سرچشمہ بن جائے گا۔

قدرت جب لالے کی حنا بندی کرنے پر آتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہونے لگتے ہیں اور سینہ سنگ میں بھی کونپلیں انگڑائی لینے لگتی ہیں۔ ملازمت کے دنوں میں عبدالمالک کو ایک رپورٹ کے ذریعے معلوم ہوا کہ یہودیت کے فروغ کے لیے قائم لبنان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے کی مالکہ ایک یہودی خاتون ہے۔ اس خبر یا اطلاع میں بظاہر چونکا دینے والی کوئی بات نہ تھی لیکن یکایک عبدالمالک کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوئی جو بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ دیر تک روتا اور سوچتا رہا کہ کیا میں اُس یہودی خاتون سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے دین حق کے فروغ کے لیے کچھ نہیں کر رہا۔ یہی وہ دن تھا جب پہلے پہلے عبدالمالک مجاہد کے دل میں اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے ایک طباعتی ادارے کے تصور نے انگڑائی لی اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس تصور کو عملی سانچے میں ڈھالنے کی تدابیر کرنے لگا۔

مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایک بڑے کام کے لیے چن لیا تھا۔ 1988ء میں عبدالمالک نے چند مخلص رُفقاء کی مدد سے چھوٹا سا کتاب گھر قائم کیا۔ 1992ء میں اُسے دارالسلام کا نام دیا گیا۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں قائم یہ ادارہ ابر بہاری سے سیراب ہونے والے پودے کی طرح تیزی سے نمو پانے لگا۔ اور آج وہ بلاشبہ نجی شعبے کا ایک ایسا عظیم ادارہ بن چکا ہے جس کی خدمات کا دائرہ مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔ عبدالمالک مجاہد اپنے آپ کو خوش نصیب خیال کرتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی

تائید ونصرت حاصل ہے اور ایسے مخلص محنتی اور باصلاحیت افرادِ کار کی ایک ٹیم بھی جس کے بغیر اس درجہ و مقام کے ادارے قائم ہو سکتے ہیں نہ اتنی مختصر مدت میں اس قدر بیش بہا کام کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے کسی کالم میں عبدالمالک مجاہد کو ایک ادارہ قرار دیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ ہمارے ہاں کے تو ادارے بھی اُس کے سامنے ہیچ ہیں۔ سرکار کے اہتمام میں قائم ہونے اور تنخواہوں کے آشوب میں مبتلا اہلکاروں کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے ادارے سفید ہاتھی کی طرح فنڈز ہڑپ کرنا تو جانتے ہیں لیکن اُن کی فردِ عمل خالی ہی رہتی ہے۔

دارالسلام دنیا کی مختلف زبانوں میں ایک ہزار سے زائد انتہائی معیاری کتب شائع کر چکا ہے جن کے لاکھوں نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔ اب تک قرآن کریم کے اٹھارہ زبانوں میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں اُردو، انگریزی، ہسپانوی، بنگالی، پشتو، فرانسیسی، مالا باری، تامل، ترکی، انڈونیشی، البانوی، فلپائنی، نیپالی، سندھی، فارسی، ٹاگلوگ اور سواحلی زبانیں شامل ہیں۔ دس مزید زبانوں کے تراجم اس سال کے اختتام تک شائع ہو جائیں گے جن میں تلگو، مراٹھی، صومالی، چینی، گجراتی، پنجابی، ہوسا، سنہالی، یوروبا، اور امہاری زبانیں شامل ہیں۔ دنیائے اسلام کے کسی ریاستی یا غیر ریاستی ادارے کے بارے میں کم از کم میں نہیں جانتا جس نے قرآن کریم کے اتنے تراجم شائع کیے ہوں۔ ادارے کے مرتب کردہ منصوبہ کار کے مطابق 2012ء کے اختتام تک دنیا کی چالیس زبانوں میں قرآن حکیم کے تراجم شائع ہو جائیں گے۔ کالم کی تنگ دامانی مانع ہے ورنہ میں بتاتا کہ عبدالمالک مجاہد نے درست اور معیاری ترجمے کے لیے کتنا کڑا نظام وضع کر رکھا ہے اور اس ضمن میں وہ خود ذاتی طور پر کتنی محنت و کاوش کرتے ہیں۔

حال ہی میں دارالسلام نے صحاح ستہ یعنی احادیث کی چھ بنیادی کتابوں کے انگریزی تراجم شائع کیے ہیں۔ یہ سارا سرمایہ 38 جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ اب ان کے معیاری اُردو ترجمے کا سلسلہ تکمیل پذیر ہے۔ قرآن اور سیرت نبوی ﷺ کے اٹلس انتہائی خوبصورت انداز میں شائع کیے گئے ہیں۔ ”اٹلس فتوحات اسلامیہ“ کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ پانچ سو صفحات پر مشتمل اسلامی تاریخ کی فتوحات کا یہ انسائیکلوپیڈیا اپنی نوعیت کی انتہائی عظیم کاوش ہے۔ بچوں کے لیے دارالسلام نے ایک خصوصی شعبہ قائم رکھا ہے۔ اسلامی فکر کی تہذیب و تربیت کے لیے اتنا عمدہ اور دل کش لٹریچر شاید ہی کسی دوسرے ادارے نے شائع کیا ہو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دارالسلام کی شائع کردہ کتب انتہائی اعلیٰ طباعتی معیار کی حامل ہیں۔ اس معیار کو برقرار رکھنے کے لیے اٹلی، لبنان، سعودی عرب، چین اور پاکستان کے طباعت گھروں کی خدمات سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ دارالسلام کا نیٹ ورک سعودی عرب کے متعدد شہروں کے علاوہ متحدہ عرب امارات، برطانیہ، کوالالمپور، ہیوسٹن، نیویارک، کینیڈا تک پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کے 28 ممالک میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔

بلاشبہ عبدالمالک مجاہد، برسرِ جہاد ہے۔ اس کے سر میں ایک سودا سمایا ہوا ہے اور ایسے کام کے لیے سودائیوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے کرشمے کسی صاحبِ جنوں کے ہاتھوں ہی جنم لے سکتے ہیں۔ میں ریاض میں قیام کے دوران دوبار انہیں ملا۔ دونوں بار یہ تاثر لے کر اُٹھا کہ معجزہ فن کی نمود خونِ جگر سے ہی ممکن ہے۔ عبدالمالک مجاہد ایک مشن کو اپنے جگر کا خون دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے عزم کو جواں رکھے۔

ریاض کا آسمان کھل گیا ہے۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ آج شہرِ جاناں کا قصد ہے۔ میرے ایک دوست کو فکر لاحق ہے کہ مدینہ منورہ میں ہماری دیکھ بھال کون کرے گا۔ لابی میں چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اُس نے پوچھا ''مدینہ میں ہے کوئی جان پہچان والا۔'' اس سوال میں جانے کیا تھا کہ مضروب دل کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے اور پورے بدن میں ایک ارتعاش بپا ہو گیا۔ میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنے آپ سے پوچھا مدینہ میں ہے کوئی میری جان پہچان والا؟ اور اس سوال کے ساتھ ہی میری آنکھیں بھر آئیں، حلق میں نمک سا گھلنے لگا۔ میں نے دوست کو بتانا چاہا کہ ''ہاں ہے۔ بہت ہی دیرینہ بڑا گہرا تعلق ہے اُس سے......وہی مجھے بار بار بلاتا ہے۔ وہی میری میزبانی کرتا۔ میرے ساتھ ساتھ رہتا، میرا غم بانٹتا، میرے آنسو پونچھتا ہے۔'' میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بصد مشکل میرے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا ''مدینہ میں بھی بھلا کوئی اجنبی ہوتا ہے۔'' میرے دوست نے منہ پھیر کر میری طرف دیکھا اور آنسو اُس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔

[19-04-2010]

# مدینۃ النبی ﷺ

ریاض کے دوستوں کی وارفتگی کی حدوں کو چھوتی محبت دیر تک یاد رہے گی۔ خودرو کونپلوں کی طرح پھوٹ آنے والی محبتیں، بڑی پاکیزہ ہوتی ہیں۔ لوبھ اور لالچ سے بے نیاز۔ میرا اُن میں سے کسی سے تعارف تک نہ تھا۔ لیکن اُن کی چاہت میں برسوں کی شناسائیاں تھیں۔ اللہ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔

ریاض سے مدینہ آتے ہوئے ہمارا بوئنگ جب شہر جاناں کے قریب آنے لگا اور اُس نے ڈھلوان کا سفر شروع کیا تو ایک بار پھر دل و دماغ میں اگربتیوں کے معطر دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا وہی غبار سا اُٹھا جس سے میں اچھی طرح مانوس ہوں لیکن اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔ طیارہ اُترنے کو پر تول رہا تھا میری نگاہیں کبھی دائیں کبھی بائیں کے گہرے سانولے چٹیل پہاڑوں پر پڑ رہی تھیں اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اگلی ہی ساعت میں پلک جھپکوں تو سبز گنبد میرے سامنے ہو اور میں وصل کی مشکبو پھوار سے بھیگتا چلا جاؤں۔ سیدنا انسؓ بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ جب بھی سفر سے واپس تشریف لاتے اور دُور سے مدینہ کے در و دیوار پر نظر پڑتی تو مدینہ منورہ کی محبت کی وجہ سے اپنی اُونٹنی کو تیز چلاتے اور کسی دوسری سواری پہ سوار ہوتے تو اُسے ایڑ لگاتے۔ میں بوئنگ طیارے کو ایڑ نہیں لگا سکتا تھا۔ لیکن دل میرے قابو میں نہ تھا۔ خالق ارض و سما نے یقیناً ازل سے ہی خاک مدینہ کے لیے دائمی عظمتیں اور نعمتیں مقدر کر دی تھیں۔ لاریب اسلام مکہ کی گھاٹیوں پہ اُترا لیکن اس آفتاب جہاں تاب کی کرنیں مدینہ کے اُفق سے پھوٹیں۔ کیا شہر دلبر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں رچ بس گیا اور کیا مقام ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان دعاؤں کی پوٹلیاں باندھے دربارِ رسالت مآب ﷺ میں حاضری دیتے اور تسکین قلب و جاں کی جھولیاں بھر بھر کے لے جاتے ہیں۔

مدینہ سنگ و خشت کی بستی نہیں۔ کہنے کو ایک شہر سہی لیکن یہ ایک احساس، ایک رُوح، ایک خیال، ایک جذبہ، ایک محبت اور ایک وارفتگی ہے۔ شرعی ضابطہ بندی کے اعتبار سے مدینہ کی حاضری نہ مناسک حج کا حصہ ہے نہ فرائض عمرہ کا۔ سب کچھ مکہ معظمہ اور اس کے گرد و نواح میں تکمیل پا جاتا ہے لیکن دلوں کی دنیا میں ایک خلا دشت آرزو کی طرح سلگتا رہتا ہے۔ بھرا بھرا ہونے کے باوجود تشنگی کا شدید احساس تیز نوکیلے کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔ اور جب مسافر مدینہ کا رُخ کرتا ہے تو اپنایت کی ٹھنڈی ہوا آگے بڑھ کر اُس کے ماتھے پر بوسہ دیتی، اُس کی اُنگلی تھامتی اُسے شاہ مدینہ ﷺ کے دربار میں لا کھڑا کرتی ہے۔ کوئی کیسا ہی ہو اُس کی دیوار جاں ٹوٹ ٹوٹ جاتی اور وہ پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ یہ

بکھراؤ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کی گود میں سمٹ کر لامحدود ہو جاتا ہے۔ مدینہ اس کے محسوسات میں سماتا چلا جاتا اور ممتا کی سی شفقت کی ملائمت اُسے تھپکیاں دینے لگتی ہے۔ یہ وہ شہر جاناں ہے جس کا محکمہ موسمیات کے زائچوں اور درجۂ حرارت کے پیمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے اپنے موسم، اپنی آب و ہوا ہے۔ خطہ ارض پہ آباد ساری بستیوں، سارے قصبوں، سارے شہروں سے جدا، یہی آب و ہوا دُور دُور کی بستیوں میں بیٹھے کروڑوں افراد کے دلوں پہ دستک دیتی اور ان کے خوابوں میں تمنا کی نیلم پری بن جاتی ہے۔

طیارے کے پہیوں نے رن وے کو چھوا۔ میں نے جانا کہ شہر جاناں کی خاک سے میرا رشتہ جڑ گیا ہے۔ مطار محمد بن عبدالعزیز سے نکلنے میں دس منٹ بھی نہ لگے۔ میرے میزبان نے بڑھ کر معانقہ کیا۔ گاڑی چلی اور ایک جدید شہر کے خدوخال اُبھرنے لگے۔ میں اس جدت کی چکا چوند میں ایک بار پھر صدیوں پہلے والے شہر مدینہ کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔ تب تو یہ کچے پکے کھجور کے چھپروں والے گھروں کی چھوٹی سی بستی ہوگی۔ جہاں تارکول کی کشادہ سڑکیں لیٹی اور آسمان کو چھوتی بلند قامت عمارتیں کھڑی ہیں وہاں ریت کے ٹیلے، کھجوروں کے جھنڈ اور شتربانوں کے خیمے ہوں گے۔ اس پانچ ستارہ ہوٹل کی جگہ بکریاں چر رہی ہوں گی۔ اس عالی شان دفتر کے پچھواڑے میں قبیلہ بنی اوس کے گھر ہوں گے۔ یہیں کہیں بنونجار کی وہ بچیاں رہتی ہوں گی جنہوں نے ''بدر کی گھاٹیوں سے چاند نکل آیا'' کا شیریں نغمہ گایا تھا۔ اس پندرہ منزلہ رفیع الشان ہوٹل کے مقام پر سیدنا ابوایوب انصاریؓ کا گھر ہوگا جہاں حضور ﷺ کی اُونٹنی رُک گئی تھی۔ وہ شام بھی کیا شام ہوگی جب آپ ﷺ صدیق اکبرؓ کے ہمراہ مدینہ میں اُترے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن، مدینۃ النبی ﷺ کی شوکت و عظمت میں کوئی کمی نہ آئی۔ کیسے آسکتی ہے کہ اس بستی کی نسبت محمد عربی ﷺ سے ہے اور کرۂ ارض پر کوئی نسبت اس سے بڑھ کر، اس سے معتبر نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی تھی ''اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ سے بھی بڑھا دے۔'' رسالت مآب ﷺ کی یہ دعا، دعائے خلیل کی طرح اللہ کے حضور قبول ہوئی۔ اب مکہ کی محبت کے ساتھ ساتھ مدینہ کی محبت بھی ہر مسلمان کا سرمایہ ہے اور دعائے رسول ﷺ کے عین مطابق بعض حالتوں میں مکہ سے بھی فزوں۔ ایک محبت قاعدوں اور قرینوں کی پابندیوں کے اندر نہر کے آب رواں کی طرح ہے اور دوسری دریا کی متلاطم لہروں کی مانند کناروں سے چھلکتی ہوئی۔ ایک حواس خمسہ کے بطن سے پھوٹتی خرد جیسی، دوسری حد فہم و ادراک سے گزر جانے والے عشق و جنوں کی طرح۔

ظہر کی نماز سے قبل ہی ہم مسجد نبوی ﷺ پہنچ گئے۔ عمرہ کا موسم عروج پر ہے اور ہجوم بے کراں۔ مقامی تعطیلات کے باعث سعودی باشندے بھی اہل خانہ کے ہمراہ سعادتیں سمیٹنے نکلے ہیں۔ باب الملک فہد سے اندر آتے ہی اندازہ ہوا کہ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ اس کے باوجود حج کے دنوں کی کیفیت

نہیں۔ میں ابھی تک دبارِ رسالت ﷺ میں حاضری نہیں دے سکا۔ عجب آشوب ہے کہ روضۂ رسول ﷺ کے وصل کی تمنا بے تاب کیے رکھتی ہے۔ دل قابو میں نہیں رہتا اور قدموں سے کوسوں آگے نکل جاتا ہے لیکن دربارِ نبوت ﷺ میں سلام پیش کرنے کے لیے مجھے پہروں جسم کی ساری توانائیاں سمیٹنا پڑتی ہیں۔ شہ کون و مکاں ﷺ کی بارگاہ اور اپنی تہی دامانی کا احساس کچھ کے دینے لگتا ہے۔ لوگوں نے مجھے جانے کتنی عرضیاں تھما رکھی ہیں۔ اور میں پاکستان سے یہاں آ جانے کے بعد بھی بابِ جبریل کے پاس حاضری کی اجازت کی عرضی تھامے کھڑا ہوں۔ شاید شہنشاہ ارض و سما کی نظر مجھ پر پڑ جائے۔ شاید حاضری کا اذن ہو جائے۔ شاید حضور ﷺ پہچان جائیں کہ یہ وہی ہے جو کہا کرتا تھا "مدینہ دُور ہے۔" شاید، شاید!!

[21-04-2010]

---

# رحمت عالم ﷺ کے حضور (1)

فجر کے کوئی پانچ گھنٹے بعد اور ظہر سے تقریباً ڈھائی گھنٹے قبل میں بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضری کی نیت سے حرم میں داخل ہوا تو بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ راہیں کشادہ تھیں اور دبیز سرخ رنگ قالینوں میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ مرمریں ستونوں سے ٹیک لگائے قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے تھے۔ کچھ کسی گوشے میں گہری نیند سو رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ پاکستان ہی سے آیا ایک معمر شخص ہولے ہولے چل رہا تھا اور بولے جا رہا تھا۔ میں نے پہلے تو سمجھا کہ شاید سیل فون پر کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ اب اُس کے جملے میرے کانوں میں پڑ رہے تھے...... "اب بلایا ہے تو بھول نہ جانا...... پھر بھی بلاتے رہنا...... ساری عمر حاضری کے جتن کرتا رہا ہوں...... پہلی بار گندم کی کٹائی کے دنوں میں گھر سے نکل آیا ہوں...... صرف جناب سرکار ﷺ کی خاطر...... اب میری لاج رکھنا...... میرے بیٹے بڑے نکمے ہیں...... اُن پہ کوئی نظر کردیں سرکار ﷺ......!" مرد بزرگ سرکار مدینہ ﷺ سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اُس کے ہاتھ میں دعاؤں والا کوئی کتابچہ بھی نہ تھا۔ بس وہ اپنی دُھن میں مگن دھیمے، میٹھے اور پُر یقین لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ یہی اُس کی دعائیں تھیں، یہی مناجات، یہی ہدیہ درود وسلام۔ اُس کا طرز کلام ایسا تھا جیسے وہ حضور ﷺ کے دربار میں سر جھکائے دوزانو بیٹھا ہو۔ حضور ﷺ کے ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسم ہو۔ وہ باتیں سن رہے ہوں اور اپنے عظیم رُفقاء صدیقؓ وعمرؓ کی طرف دیکھ کر تبسم فرما رہے ہوں۔

مجھے اس مرد سادہ پہ رشک آیا۔ علم وآگہی بے بہا نعمتیں سہی لیکن وہ تکلف کے کتنے پردے حائل کر دیتی ہیں؟ سچے اور بے لاگ جذبوں کی تراش خراش کے لیے سوچ کا رندا چلنے لگے اور اظہار کے لیے شایان شان لفظوں کی تلاش ناگزیر ہو جائے تو آدمی کتنی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ جذبۂ بے اختیار شوق کی آگ دل محبوب تک پہنچتے پہنچتے کس قدر ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ دل جب دماغ اور زبان کے خرخشوں میں پڑ جائے تو عجب بے چارگی کی تصویر بن جاتا ہے۔ اُن سارے بندھنوں سے آزاد محبت میں کتنی بے ساختگی، کیسی اپنائیت اور کس قدر سچائی ہوتی ہے۔ مجھے مولانا رومی کی بیان کردہ حکایت یاد آئی۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کوہ طور کی سمت جا رہے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف واعزاز حاصل تھا۔ راستے میں ایک چرواہے کو دیکھا جس کا ریوڑ اِدھر اُدھر گھاس پہ منہ مار رہا تھا۔ چرواہا خود ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھا، گرد وپیش سے بے نیاز اپنے اللہ سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ "اے اللہ! تو مجھے مل جائے تو میں تیرے بالوں میں تیل ڈالوں، کنگھی کروں، جوئیں نکالوں۔ تجھے نہلاؤں دھلاؤں، تجھے اچھے اچھے کپڑے

پہناؤں......'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُسے ٹوکا۔ اُسے سمجھایا کہ ذات باری تعالیٰ سے اس طرح کی گستاخی نہیں کرتے۔ آئندہ محتاط رہنا...... چرواہا شرمسار ہوا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ناخوشی کا اظہار کیا اور فرمایا:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

''تو بندوں کو ہم سے ملانے کے لیے آیا ہے، جُدا کرنے کے لیے نہیں۔'' لیکن میں نہ کوہ طور کو جاتی پگ ڈنڈی کے کنارے بکریاں چرانے والا چرواہا ہوں، نہ پنجاب کے کسی دُور افتادہ گاؤں سے آنے والا ناخواندہ دیہاتی، سو میری محبت کا بے ساختہ پن، شکنجوں میں کسا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

میں نے محبت کی پوٹلی کو پکی گرہ ڈال رکھی تھی اور ہولے ہولے قدم اُٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ سوئے ادب کے خوف نے مجھے بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ جوں جوں میں روضۂ رسول ﷺ کے قریب جا رہا تھا، میری دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور میری سانسیں جیسے اُکھڑنے کو تھیں۔ میں جیسے گرد و پیش سے کٹ کر کھو سا گیا۔ ہجوم نہ تھا کہ دھکم پیل کی کیفیت ہوتی اور میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ صرف اوسان بحال نہ تھے اور حواس میں خلل سا پڑ گیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ ضرور تھا کہ میں چل رہا ہوں۔

پھر یکا یک مجھے یوں لگا جیسے میں چل نہیں رہا بلکہ کوئی مقناطیسی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ سنبھلا تو سنہری جالیاں عین میری نگاہوں کے سامنے تھیں اور شفقت کا ایک نورانی ہالہ جیسے میرا حلقہ کیے ہوئے تھا۔ اندر سے کوئی خودکار سسٹم آن ہو گیا اور ہونٹوں سے درود و سلام کی نغمگی پھوٹنے لگی۔ پل بھر میں کوئی اجنبی ہاتھ ساری اجنبیت، ساری جھجک اور سارے تکلفات اُچک لے گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں برسوں کی جلاوطنی کے بعد اپنے گھر لوٹ آیا ہوں۔ جیسے دشت بے اماں کی سلگتی ریت کے لمبے سفر کے بعد یکا یک مخملی گھاس اور گھنے سایہ دار درختوں والے نخلستان نکل آیا ہوں۔ جیسے بے مہر موسموں کی اذیتوں کے بعد آغوشِ مادر کی نرم و گداز ممتا نے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ہو۔ جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے (فیض)

لیکن یہ بے وجہ تھوڑا ہی تھا۔ میں رحمت للعالمین ﷺ کی بارگاہ میں کھڑا تھا۔ دنیا کو امن و آشتی کا درس اور انسانی حقوق کا عظیم چارٹر دینے والے محسن انسانیت ﷺ کے حضور۔ گالیاں کھا کر دعائیں دینے اور خون کے پیاسوں کو قبائیں عطا کرنے والے نبی کریم ﷺ کے آستانے پہ۔ میں جب بھی روضۂ

رسول ﷺ کے سامنے تصویرِ عجز بنا کھڑا ہوتا ہوں مجھے ''مدینہ دُور ہے'' کے عنوان سے لکھا گیا کالم بے اختیار یاد آجاتا ہے۔ جانے وہ عرضِ نیاز کی کون سی سعید ساعت تھی کہ اس کے بعد سے مدینہ مجھے مسلسل بلاتا رہتا ہے۔ میں غم ہائے روزگار میں اُلجھ کے بھول جاؤں تو مجھے آواز دیتا ہے۔ میرے کان میں سرگوشی کرتا ہے...... ''تم تو کہتے تھے مدینہ دُور ہے۔ اب دیکھو، مدینہ کس قدر قریب ہے۔ تمہیں کس طرح بلاتا رہتا ہے...... اس کی فصیل کے سارے دروازے تمہارے لیے کھلے رہتے ہیں...... اب تو ''دُوری'' کا گلا نہیں رہا نا؟ بس آتے جاتے رہا کرو...... اپنا گھر جانو......''

اپنائیت کی ٹھنڈی معطر فضا سے میں بھیگ رہا تھا۔ عزیزوں اور دوستوں کی عرضیاں میری پوٹلی میں بندھی تھیں۔ میں نے ہولے ہولے اس کی گرہ کھولی۔ سنہری جالیوں کے اندر سے ایک سرگوشی سی آئی۔ ''کیا لائے ہو؟'' ندامت کے احساس سے مجھے پسینہ آنے لگا۔ کیا بتاتا کہ حضور ﷺ ہم افتادگانِ خاک کے پاس ہے ہی کیا؟ ہم تو بس سوالوں کی گٹھڑیاں ہی لا سکتے ہیں۔ آپ کے لیے، آپ کے رُفقاء صدیقِ اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے لیے میں کچھ بھی نہیں لا سکا۔ فقیر کے پاس کشکول کے سوا ہوتا ہی کیا ہے؟ شرمندگی سے نڈھال میں پوٹلی بند کرنے لگا تو ایک مہکار سی اُٹھی۔ ''تمہارے سوال، تمہاری عرضیاں بھی مجھے بے حد عزیز ہیں۔ بولو! کس کس کا سلام اور کس کس کا پیغام لائے ہو......'' میں نے گٹھڑی کی گرہ کھولی اور ایک گردان سی شروع کر دی۔ عرضیاں میرے آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں اور سنہری جالیوں سے آتی مہکار میرے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔

[22-04-2010]

---

# رحمت عالم ﷺ کے حضور (2)

میں سنہری جالیوں کے عین سامنے ایک ستون سے لگا کھڑا تھا۔ ساری عرضیاں پیش کی جا چکی تھیں اور میرا دل اُن دعاؤں سے معمور تھا جو لفظ و بیاں کے سانچے میں ڈھل ہی نہیں پاتیں۔ جو پھول کے غلاف میں لپٹی خوشبو کی طرح آپ ہی آپ اُٹھتی اور جالیوں کو چھوتی باب جبریل سے گزرتی سبز گنبد کی طرف اُڑ جاتی ہیں۔ لفظ، جملے، بیان، چھوٹی چھوٹی آریاں ہیں جو دعاؤں کے پر کاٹ دیتی ہیں۔ دعاؤں کے کتابچے، اعزا و اقارب کی التجاؤں والی ڈائریاں اور رنگا رنگ عرضیاں، حضوری کے سرور کو کھا جاتی ہیں اور روضۂ رسول ﷺ کے عین سامنے، رحمتہ للعالمین ﷺ سے صرف چند فٹ دُور بھی کوئی بے حضور اور بے سرور رہے تو اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہو گی؟ میں اکثر سوچتا ہوں...... کیا میرے حضور ﷺ اپنے عین سامنے کھڑے غلام کے جذبہ و احساس سے نا آشنا ہو سکتے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ میرے دست طلب کی لکیریں کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا رب کریم، اپنے محبوب ﷺ کے سامنے دست بستہ کھڑے بندے کے قرطاس دل کی تحریریں نہیں پڑھ سکتا؟ مانگنا کسے کہتے ہیں؟ کیا دہلیز کے ساتھ لگے کھڑے کاسہ بہ دست فقیر کے لیے صدا لگانا ضروری ہے؟ حرم کعبہ، حرم نبوی ﷺ، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کہیں بھی مرصع لفظوں اور عقیدت میں گندھی دعاؤں میں کبھی مشکل پیش نہیں آتی، لیکن روضۂ رسول ﷺ کی سبز جالیوں کے سامنے پہنچتے ہی ساری دعائیں جیسے تحلیل ہو جاتی ہیں۔ دل کی کیتلی میں ایک اُبال سا اُٹھتا ہے، حلق میں نمک کی ڈلی سی گھلنے لگتی ہے اور ساری دعائیں، آنکھوں کے راستے رخساروں پر ڈھلکنے لگتی ہیں۔ کیا میرے حضور ﷺ کو عرضیوں کی ضرورت ہے؟

عرضیاں، حاضری کو حضوری میں نہیں بدلنے دیتیں۔ عشق و مستی کی راہ میں سو سو پردے حائل کر دیتی ہیں۔ حجاب ہی حجاب، نقاب ہی نقاب۔ لیکن ہم کمزور، بے یقین، تھڑدِلے سے لوگ ہیں۔ ہم جل تھل کر دینے والی باران رحمت میں کھڑے ہو کر بھی سیراب نہیں ہوتے۔ عرضی، حاضری، حضوری، میرے ذہن، میں سب کچھ گڈمڈ سا ہو رہا تھا۔ ایک اطمینان البتہ تھا کہ چلو ساری عرضیاں ختم ہو گئیں۔ میں نے نگاہ اُٹھا کر اُس گول تختی کی طرف دیکھا جو حضور ﷺ کی مرقد مبارک کی نشاندہی کے لیے جالیوں کے باہر لگائی گئی ہے۔ میرا دل زور سے دھڑکا اور یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا کہ ایک عرضی تو رہ ہی گئی۔ میں نے سبز لفافے میں لپٹی یہ عرضی بھی نکالی اور دل گیر لہجے میں کہا...... "حضور ﷺ یہ پاکستان کی عرضی ہے۔ آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ مجھے سلام پیش کرنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ زخم زخم ہو رہا ہے۔ حضور ﷺ اس پہ کرم

کی نگاہ فرمائیے۔''

پھر عرضیاں میرے ذہن سے محو ہو گئیں۔ میں قبلہ کی سمت والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور گم ہو گیا۔ گمشدگی کی اس کیفیت میں سارا مدینہ ایک نگینہ بن کر میرے دل کی مخملی ڈبیا میں بند ہو گیا۔ میری سوچ مجھے وہیں چھوڑ کر صدیوں پیچھے چلی گئی۔ میرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم، میرے جد امجد ابی بکر صدیقؓ اور امیر المومنین عمرؓ ابن الخطاب عین میرے سامنے آرام فرما رہے تھے اور میں تاریخ کے دھندلکوں سے منظر تراش رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو سوال اُٹھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کہاں بنائی جائے؟ سیدنا ابوبکرؓ نے کہا...... ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ نبی جہاں فوت ہو، وہیں دفن کیا جاتا ہے۔'' صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ایک طرف کیا۔ سیدہ عائشہؓ کے حجرہ مبارک میں ہی قبر کھدی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کر دی گئی۔ حضرت عائشہؓ بدستور اُس حجرے میں مقیم رہیں۔ جنوبی حصے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک تھی اور شمالی حصے میں حضرت عائشہؓ کی رہائش گاہ۔ سیدنا ابوبکرؓ فوت ہوئے تو حضرت عائشہ کی اجازت سے اُن کی تدفین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں پہلو میں کر دی گئی لیکن اس طرح کہ صدیق اکبرؓ کی قبر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر سے ایک ہاتھ نیچے کی طرف رکھی گئی۔ یوں کہ اُن کا سر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شانوں کے برابر رہے۔ حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو اُن کے صاحب زادے نے حضرت عائشہؓ سے خصوصی اجازت چاہی۔ انہوں نے اجازت مرحمت فرما دی۔ عمرؓ ابن الخطاب کی قبر، صدیق اکبرؓ کی قبر سے ایک ہاتھ نیچے رکھی گئی۔ یوں کہ اُن کا سر صدیق اکبرؓ کے کندھوں کے برابر آ گیا۔ سیدہ عائشہؓ اب تک اُسی حجرے میں رہ رہی تھیں۔ عمر فاروقؓ کی قبر بننے کے بعد انہوں نے اپنی رہائش اور قبروں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرا دی۔ فرمایا...... ''پہلے میرے شوہر اور میرے والد تھے۔ اب عمرؓ بھی ہیں جن سے میرا پردہ ہے۔''

میں اِسی گمشدگی کی کیفیت میں چودہ پندرہ صدیاں پہلے والے مدینہ میں گردش کرتا رہا۔ وہ ساری بستی شاید آج کی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر سمٹ آئی ہو اور آج ایک دنیا اس مسجد کے مرمریں ستونوں سے لگی کھڑی ہے۔ سہل اور سہیل نامی دو یتیم بچوں کی معصوم رُوحیں جنت کے جھروکوں میں کھڑی کس احساس طمانیت کے ساتھ سبز گنبد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم مسجد اور لاکھوں انسانوں کے ہجوم کو دیکھتی ہوں گی۔ یہ قطعہ زمین اُن کی ملکیت تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں مسجد بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ معاوضے کی ادائیگی پہ اصرار کیا لیکن دونوں بچے قیمت وصول کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ شاید انہیں اندازہ تھا کہ قدرت انہیں ایسی سعادت سے مالا مال کر رہی ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی طرف آتے ہوئے میں سڑک کے دونوں طرف بکھرے سیاہ رنگ پتھروں، بنجر ویرانوں، بے آب و گیاہ گھاٹیوں اور چٹیل پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا میرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِسی راستے سے گزرے ہوں گے؟ میں ایک بار پھر صدیوں پیچھے پلٹ گیا۔ وہ کیا شب تھی کہ

سیدنا علی المرتضیٰؓ سبز چادر اوڑھے حضور ﷺ کے بستر پر سو رہے تھے اور حضور ﷺ، صدیق اکبرؓ کے ہمراہ مکہ سے نکل کر مدینہ کا رُخ فرما رہے ہوں گے۔ کیا اُس وقت ان سیاہ رنگ پتھروں، ان گھاٹیوں، ان بنجر ویرانوں اور ان چٹیل پہاڑوں کو خبر تھی کہ دو اُونٹنیوں پہ سوار یہ دو افراد ایک نئی دنیا، ایک نیا عالم، ایک جہاں تازہ آباد کرنے جا رہے ہیں؟ کسی ذی رُوح کے وہم و گمان میں بھی تھا کہ یثرب نامی بستی کیا رفعتیں پانے والی ہے؟ کیا کوئی جانتا تھا کہ دو قدم آگے چلنے والی اُونٹنی پر سوار شخص ایک دن تاجداروں کا تاجدار ہو گا۔ ابد تک کروڑوں اربوں انسان اُس کے نام کا کلمہ پڑھیں گے اور وہ انسانیت کا سارا نظام، تہذیب واقدار بدل کے رکھ دے گا۔

میں 140 کلو میٹر فی گھنٹہ چلنے والی گاڑی میں بیٹھا ہوں جو فراٹے بھرتی مکہ معظّمہ جا رہی ہے۔ میرے حضور ﷺ اور صدیق اکبرؓ کو مکہ لے جانے والی اُونٹنیوں کی رفتار کیا ہو گی؟ ان ویرانوں میں کتنی راتیں، ان گھاٹیوں میں کتنے دن؟ مجھے مکہ کا ہو کے رہ جانے والا بابا یاد آیا جو پاپیادہ مدینہ کا سفر کرتا ہے اور جس کی پوٹلی میں کوئی عرضی نہیں ہوتی اور جس کی حاضری، حضوری کی سرمدی لذتوں سے سرشار ہوتی ہے۔

[24-04-2010]

# مکہ معظّمہ (1)

گاڑی فراٹے بھرتی مکہ معظّمہ کی طرف جارہی تھی۔ ایئر کنڈیشن چل رہا تھا اور ہم ٹھنڈی فضا میں، احرام باندھے، نرم و گداز سیٹوں پر نیم دراز تھے۔ دُور دہکتی دھوپ میں کوئلے جیسے سیاہ پتھروں میں راستہ بناتی دو اُونٹنیاں چل رہی تھیں۔ دھوپ چمکی ہو چلی تھی اور حد نظر تک کوئی گھنا یا سایہ دار درخت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ غار ثور سے نکلنے کے بعد وہ چار ہو گئے تھے۔ لہو کے پیاسے اہل قریش بھٹکتے پھر رہے تھے۔ محمد ﷺ اور اُس کے رفیق سفر کو ڈھونڈ نکالنے والے کے لیے ایک سو سرخ اُونٹوں کا انعام مقرر ہو چکا تھا۔ قبیلہ بنو مدلج کے سردار سراقہ بن مالک کو خبر ہوئی کہ محمد ﷺ کا مختصر قافلہ ایک مقام پر دیکھا گیا ہے۔ اُس نے گھوڑے پہ زین کسی، نیزہ سنبھالا اور آن کی آن میں ہوا ہو گیا۔ صدیق اکبرؓ کی نگاہ دُور ایک گھڑ سوار پر پڑی۔ پریشان ہوئے۔ قافلہ سالار گویا ہوئے۔ ''ڈرو مت۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

سراقہ بن مالک نے قافلے کو آلیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔'' اُس کے دل میں شدید خوف نے کروٹ لی۔ آواز دی ''اے محمد ﷺ مجھے اس عذاب سے نکالیے، میں واپس جانا چاہتا ہوں۔'' حضور ﷺ نے دعا فرمائی۔ سراقہ نے کہا۔ ''مجھے ایک پروانہ امن عطا فرمائیے جو آپ کے اور میرے درمیان نشانی رہے۔'' چمڑے کے ایک ٹکڑے پر صدیق اکبرؓ کے غلام نے چند الفاظ لکھے۔ سراقہ نہال ہو کر واپس چلا گیا...... ابھی وہ چند قدم ہی گیا تھا کہ حضور ﷺ نے آواز دی ''سراقہ! اُس دن تمھیں کیسا لگے گا جس دن تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ ابن ہرمز کے کنگن ہوں گے؟'' سراقہ کے دل میں بدلتی ہوئی رُت کی ہوائیں چلنے لگی تھیں لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ کسی دن محمد ﷺ اتنا طاقت ور ہو جائے گا کہ دنیا کی سپر پاور اُس کے قدموں میں ڈھیر ہو جائے گی اور کسریٰ بن ہرمز کے کنگن میری کلائیوں کی زینت بنیں گے۔ وہ مسکرایا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ مکہ واپس پہنچ کر اُس نے قریش سے کہا۔ ''اس طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں چپہ چپہ چھان آیا ہوں۔''

گاڑی کے شفاف شیشوں سے جھانکتے ہوئے میں سنگلاخ سرزمین کے نشیب و فراز دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بنو مدلج کے سردار سراقہ بن مالک کا گھوڑا کس مقام پر ہوگا جب سرور کونین ﷺ کی زبان مبارک سے ایک بشارت ہوئی اور بری نیت سے اپنے تعاقب میں آنے والے ایک بدو کو مالا مال کر گئی! بعض ساعتیں کتنی سعید ہوتی ہیں کہ یکا یک کسی انسان کا مقدر بدل کے رکھ دیتی ہیں؟ سراقہ بن مالک مکہ

واپس آتے ہوئے کیا سوچتا رہا ہوگا۔

مکہ، طائف اور حنین کی فتوحات کے بعد حضور ﷺ جعرانہ کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک شخص تمام رُکاوٹیں توڑتا، دندناتا ہوا آگے بڑھا۔ انصار کے ایک دستے نے اُسے روکا لیکن وہ بڑھتا چلا گیا۔ حضور ﷺ اُونٹنی پہ سوار تھے۔ بدو نے رکاب تھامی اور بولا ''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں سراقہ بن مالک ہوں۔ یہ ہے آپ کا عطا کردہ پروانہ۔'' حضور ﷺ نے فرمایا ''ہاں آج کا دن مہربانی اور احسان کرنے کا دن ہے۔ وفا نبھانے کا دن ہے۔ میرے قریب آؤ سراقہ۔'' اور پھر ایک دست شفقت سراقہ کے دونوں جہان منور کر گیا۔ اب وہ صحابی رسول ﷺ تھا اور سپاہ اسلام کا صف شکن جانباز۔ حضور ﷺ نے انتقال فرمایا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ رُخصت ہوئے۔ یہ امیرالمومنین عمرؓ ابن الخطاب کا عہد تھا جب کسریٰ کی سلطنت نگوں ہوئی۔ کسریٰ بن ہرمز کے کنگن، اُس کی طلائی پیٹی اور تاج مدینہ منورہ پہنچے۔ لمبی عمر پانے والا سراقہ شاید نبی ﷺ کی بشارت بھول چکا تھا۔ مال غنیمت خلیفتہ المسلمینؓ کے سامنے لایا گیا۔ کسی نے بتایا کہ یہ کسریٰ بن ہرمز کے کنگن ہیں۔ امیرالمومنینؓ کی آنکھیں بھر آئیں۔ بولے ''سراقہؓ بن مالک کہاں ہے؟ اُسے ڈھونڈ کر لاؤ۔' سراقہؓ کو لایا گیا۔ عمرؓ بولے ''میرے قریب آؤ سراقہ۔ آج میرے نبی ﷺ کی بشارت پوری ہونے کا دن ہے۔ اپنے ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ امیرالمومنینؓ نے کنگن اُس کی کلائیوں میں ڈال دیئے۔ سو سرخ اُونٹوں کے لالچ میں محمد ﷺ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہونے والے بدو کو کیا خبر تھی کہ نبی رحمت ﷺ کی ایک نگاہ اُسے کن رفعتوں پر سرفراز کرنے والی ہے۔''

ہماری گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ کشادہ ہموار شاہراہ سے دُور پتھروں، گھاٹیوں، پہاڑیوں اور ریت کے ٹیلوں کے بیچوں بیچ چلنے والے قافلے کو ہم سے بہت پیچھے رہ جانا چاہیے تھا لیکن وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں مدینہ سے مکہ جا رہا تھا اور یہ قافلہ نور مکہ سے مدینہ کو سفر کر رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھ سے دُور نہیں ہو رہا تھا۔ میں جب بھی شیشے سے باہر جھانکتا وہ مجھے صاف دکھائی دیتا۔ سیدالانبیاء ﷺ، صدیق اکبرؓ، اُن کے غلام اور ایک رہبر پر مشتمل یہ چار رُکنی کارواں بھی کیا کارواں تھا کہ تاریخ انسانی کو عظیم ترین انقلاب سے ہمکنار کر گیا۔

مکہ کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے وہ قافلہ میری نگاہوں سے اُوجھل ہو گیا۔ ایک نئی پُرجلال بارگاہ کا دروازہ کھل رہا تھا۔ کعبتہ اللہ میں ایک عجیب طرح کا شکوہ ہے۔ سیاہ مخملیں غلاف میں لپٹی یہ عمارت وہ مرکز ثقل ہے جس کی طرف ساری دنیا کے مسلمان کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس پہ نگاہ پڑتے ہی رُوح میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے۔ بندگی کا احساس لہو کی ایک ایک بوند میں کسمسانے لگتا ہے۔ صنم آشنا دل رکھنے والوں کی جبینوں میں بھی ہزاروں سجدے مچلنے لگتے ہیں۔ بڑے بڑے تاجداروں کے سر خود بخود خم ہونے لگتے ہیں۔ اپنی فرد عمل کے اوراق کھلنے لگتے ہیں۔ اور دعاؤں کا باب فضیلت وا ہو جاتا ہے۔

اہلیہ اور بیٹی کے ہمراہ عمرہ کی ادائیگی میں دو گھنٹے لگ گئے۔ حرم لبالب بھرا تھا۔ عشاء کی نماز سے پہلے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے میں نے کعبتہ اللہ پر نظر ڈالی۔ روشنیوں سے نہائے ہوئے صحن حرم کے بیچوں بیچ اللہ کے سیاہ پوش گھر کا جاہ وجلال ہولے ہولے شفقت، دلبری اور دل داری میں بدلنے لگا۔ اُس کی مہکار حوصلہ دینے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ دست عطا پھیلا ہوا ہے اور میزاب رحمت سے پکار اُٹھ رہی ہے۔ ''مانگ کیا مانگتا ہے۔'' اے رب کریم! ہم نے کیا مانگنا ہے؟ ہم تو دعا کا سلیقہ بھی گنوا بیٹھے ہیں؟ مانگنے کے آداب سے بھی نا آشنا ہیں؟ تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ ہماری دھڑکنوں میں بسی ان تمناؤں سے بھی واقف ہے جو لفظوں میں نہیں ڈھل سکتیں۔ ہم یہاں تک آسکتے تھے۔ آ گئے ہیں، باقی کام تمہارا ہے۔

رحمتیں بھیج، عنایات کی ارزانی کر
ہم کو مہمان بلایا ہے تو مہمانی کر

علماء، حضور انور ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ ''میری مسجد (مسجد نبوی ﷺ) میں ایک نماز دیگر مساجد میں ہزار نماز سے بہتر ہے۔ البتہ مسجد الحرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں سے بھی بڑھ کر ہے۔''

بے کراں رحمتیں! بے حد وحساب عنایات! میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اس حساب سے مسجد الحرام کی ایک نماز کی فضیلت، پچپن سال چھ ماہ بیس دن کی نمازوں کے برابر بنتی ہے اور ایک دن کی پانچ نمازوں کا ثواب دو سو ستر سال نو مہینے دس دن کی نمازوں کے برابر ہے۔

نبی ﷺ کے فرمان کی رُوح، مسجد الحرام کی فضیلت اور اُس کے درجہ ومقام کو واضح کرنا ہے لیکن ہم اعداد وشمار کی بھول بھلیوں کو ہی حاصل رکوع وسجود سمجھنے لگتے ہیں۔ خانہ کعبہ کے رُوبرو مقدار ثواب کے بہی کھاتے اور روضۂ رسول ﷺ کے سامنے عرضیوں کی پوٹلیاں، دُور سے آئے مسافروں کی منزل کھوٹی کر دیتی ہیں۔ لذت وکیف کی رُوح پرور ساعتیں، لالچ اور خواہش کے آشوب میں گم ہو کر ساری سرشاری گنوا بیٹھتی ہیں۔ لیکن ہم انسان ہیں اور یہ سب کچھ ہماری فطرت کا حصہ ہے۔

مسجد الحرام سے باہر نکلتے ہی مجھے وہ قافلہ پھر سے یاد آنے لگا جسے میں شاہراہ مدینہ کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ اس بستی پر اُترنے والی وہ شب کس قیامت کی شب ہوگی جب میرے حضور ﷺ، صدیق اکبرؓ کا بازو تھامے یہاں سے نکلے ہوں گے؟

[25-04-2010]

---

# مکہ معظّمہ (2)

مکہ معظمہ کا ایک قرآنی نام ''اُمّ القریٰ'' بھی ہے یعنی تمام بستیوں کی ماں۔ بلاشبہ یہ ماں ہی ہے کہ دنیا بھر کے فرزندانِ توحید اُس کی ممتا کی کشش سے بندھے ہیں۔ پرہیز گار، عصیاں گار، گناہ کار، نیکوکار، فقیر و بے نوا، غنی و تاجدار، سب کو اُس مادرِ مشفق کی آغوش میں پناہ ملتی ہے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں

ہم جیسے لوگ خواہشوں کے بندے، تمناؤں کے جنگلوں میں بھٹکتے، آرزوؤں کے آزار میں مبتلا، کثرت کی طلب میں ہلکان، لالچ میں لت پت، نام و نمود کے صحراؤں میں سرگرداں، دنیا کی چکا چوند کے اسیر، عہدہ و منصب کے پجاری، دوسروں کو کہنی مار کر آگے نکل جانے کے لیے سرگرم جمع جتھا کے آرزومند، خود پرستی کے مرض کا شکار، اپنے قد کاٹھ کے لیے سب کچھ کر گزرنے پہ تیار، انہی بے ثمر راہوں میں بھٹکتے عمریں تمام کر دیتے ہیں۔ لیکن دل کی کھیتی، صحرائے بے اماں کی طرح دہکتی رہتی ہے۔ ازل ازل کی پیاسی زمین کی طرح اس میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، پھر سنگلاخ چٹانیں بن جاتی ہیں جن سے کسی روز لاوا پھوٹ نکلتا ہے۔ انسان کو پتا ہی نہیں چلتا اور سرطان اندر ہی اندر پھیلتا چلا جاتا ہے، گھن چاٹتا رہتا ہے اور عمر رائیگاں مٹھی میں بند ریت کی طرح سرکتی رہتی ہے۔ کیسی محرومی ہے کہ ہم ماں کی آغوش کو بھی بھلائے رکھتے ہیں۔

خانہ کعبہ کے عین سامنے ایک مرمریں ستون سے ٹیک لگائے میں اپنی محرومیوں کی بیاض ورق ورق کھول رہا تھا کہ مکہ مدینہ کو آپس میں ملانے والی شاہراہ ہجرت کے کنارے بچھڑ جانے والا چھوٹا سا کارواں پھر یاد آ گیا۔ گروہِ دشمناں تو شاید آسودہ ہو گیا ہو کہ اسلام کا پیغام بر کہیں دُور نکل گیا ہے لیکن ہجرت کی شب اُم القریٰ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ کعبۃ اللہ کے سینے میں کیسا درد اُٹھا ہوگا؟ مکہ کے گرد ہالہ کیے پہاڑ کس کرب سے گزرے ہوں گے؟ کیا حضور ﷺ کے لیے عرصہ حیات تنگ کر دینے والوں میں سے کسی کو اندازہ تھا کہ ایک دن مکہ کی سرزمین غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں کے لیے تنگ ہو جائے گی اور اس کی فضائیں اسم محمد ﷺ کے اُجالے سے دمک اُٹھیں گی؟ حرم کعبہ سے جب اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو اس کا ارتعاش گئے زمانوں کے دُور اندر تک محسوس ہوتا ہوگا اور جانے کس کس کی ہڈیوں کی راکھ سلگنے لگتی ہوگی۔ تاریخ انسانی کے پاس ایسے کتنے معجزے ہیں؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کی فضیلت کے بارے میں فرمایا۔ ''اللہ کی قسم! تو اللہ تعالیٰ کی زمین پر بہترین جگہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین بھی۔ اگر مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کر دیا جاتا تو میں تجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔''

میں جب بھی مکہ کے کسی بازار، کسی سڑک سے گزرتا ہوں، سوچ کا راہوار بہت دُور نکل جاتا ہے۔ سامان سے لدی پھندی دکانیں، لوگوں سے چھلکتے بازار، بھیڑ، شور، ہنگامے، ہلچل، گاڑیاں، ہارن، آوازیں، رونق، اور زندگی سے بھرپور شہر لیکن میرے دل و دماغ کے نگار خانے میں بجی پرانی تصویروں کی گرد جھڑنے لگتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے اوراق اُلٹنے لگتے ہیں اور بے شمار کرداروں کے چہرے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ وہ جو اسلام سے بہرہ مند ہوئے۔ وہ جنہیں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا اعزاز حاصل ہوا، وہ جو بے مثل رفعتوں سے ہم کنار ہوئے، وہ جو راندۂ درگاہ ٹھہرے، جن کے لیے نامرادیاں لکھ دی گئیں، جن کے دلوں پر مہریں ثبت ہو گئیں۔ جن کے کان سماعت سے محروم کر دیئے گئے اور جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔

حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

بصرہ نے حسن بصریؒ، حبشہ نے بلال حبشیؓ، اور روم نے صہیب رومیؓ جیسی عظیم و جلیل ہستیاں جنم دیں اور مکہ کی خاک سے ابوجہل اُٹھا، کتنے تعجب کی بات ہے۔

لیکن یہ تعجب، یہ حیرتیں ہم جیسوں کے لیے ہیں جو ہر بات کو حواس خمسہ کی میزان پر پرکھتے اور عقل و خرد کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ عزتوں اور ذلتوں کے فیصلے کرنے والے قادر مطلق کے پیمانے جُدا ہیں۔ آج بھی خانہ کعبہ کی کنجیاں عثمان بن طلحہؓ کے پاس ہیں۔ یہ وہی عثمان بن طلحہ ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اور بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے تحمل سے سب کچھ برداشت کرتے ہوئے صرف اس قدر فرمایا تھا۔ ''عثمان! ایک دن تم دیکھو گے کہ یہ چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی، میں جسے چاہوں گا عطا کروں گا؟'' عثمان بن طلحہ تمسخر کی ہنسی ہنسا اور تن کر بولا ''کیا اُس دن سارے عرب ہلاک اور ذلیل ہو چکے ہیں گے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نہیں عثمان! اُس دن تو قریش بہت معزز ہوں گے۔'' اور وہ دن فتح مکہ کا دن تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو فرمایا ''عثمان چابیاں میرے حوالے کرو۔'' عثمان کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ جید صحابہؓ کعبہ کی پاسبانی اور کلید کعبہ کے آرزو مند تھے۔ اُن میں سیدنا عباسؓ بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چابی عثمان بن طلحہ کو سونپتے ہوئے فرمایا۔ ''عثمان یہ چابی تمہارے پاس ہی رہے گی۔'' نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر قریش مکہ کے حوالے کرنے اور ایک سو سرخ اُونٹ

انعام میں پانے کی حرص میں مبتلا سراقہ بن مالک کو خبر تھی کہ اُس کا نام کس فرو اعزاز کی زینت بننے والا ہے۔ نہ حضور ﷺ کو چابی دینے سے انکار کرنے اور تمسخر اُڑانے والے عثمان بن طلحہؓ کو اندازہ تھا کہ وہ اور اُس کی آنے والی نسلیں کس سعادت عظمیٰ سے بہرہ مند ہونے والی ہیں۔ اسلام تلواروں سے نہیں نبی کریم ﷺ کی شان رحمت سے پھوٹا جو ابد تک شیریں جھرنے کی طرح جاری رہے گی۔

کئی بار زیارت کرنے کے باوجود، گزشتہ روز میں ایک بار پھر مکہ کے جنوب میں واقع جبل ثور دیکھنے چلا گیا جس کے غار میں حضور ﷺ اور صدیق اکبرؓ نے تین دن اور تین راتیں گزاری تھیں۔ محبت و عقیدت سے سرشار لوگ پہاڑ کی اُونچی چوٹی پر چڑھ رہے تھے۔ مجھ میں اتنا دم خم نہ تھا۔ دیر تک جبل ثور کے قدموں میں کھڑا میں سوچتا رہا کہ غار ثور کی کہانی فتح مکہ کی داستان سے کتنی مختلف ہے۔ مجھے وہ مقام معلوم ہوتا تو ضرور اُس کی زیارت کرتا جہاں سے حضور ﷺ کا کارواں مکہ میں داخل ہوا تھا۔ تب بھی ابوبکر صدیقؓ آپ کے پہلو میں تھے۔ دیکھا کہ مشرکین مکہ کی عورتیں فاتحین کے گھوڑوں کے منہ اپنے دوپٹوں سے صاف کر رہی ہیں۔ ابوبکرؓ نے تبسم کیا۔ حضور ﷺ بولے ''ابی بکرؓ! کچھ یاد ہے حسانؓ نے کیا کہا تھا۔'' حضرت ابوبکرؓ نے حسان بن ثابتؓ کے دو اشعار پڑھے۔ ''میری بیٹی مر جائے اگر تم ہمارے گھوڑوں کو کدا کے مقام کے دونوں سروں پر غبار اُڑاتے نہ دیکھو۔ وہ اپنے سواروں سے باگیں چھڑا چھڑا کر بھاگیں گے۔ اُن پر کاٹھیاں پڑی ہوں گی اور عورتیں اپنے دوپٹوں سے اُن کے چہروں کی گرد صاف کریں گی۔'' حضور ﷺ گویا ہوئے ''گھوڑوں کو کدا کے مقام ہی سے شہر میں داخل کرو جہاں سے حسانؓ نے کہا تھا۔''

میں کدا کے مقام اور اُس راہ سے آشنا نہیں جہاں سے اُس محمد عربی ﷺ کا قافلہ اُم القریٰ میں داخل ہوا تھا جس محمد عربی ﷺ پر آٹھ سال پہلے مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ اللہ اکبر! حرم سے اذان کی مشکبو گونج بلند ہو رہی ہے اور اسمِ محمد ﷺ کا اُجالا دل کی راہ داریوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔

[26-04-2010]

---

# طائف

خانہ کعبہ، حرم کی انگشتری میں سیاہ نگینے کی طرح جڑا ہے اور دعاؤں سے معمور فضا تازہ گلابوں کی طرح مہک رہی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے آئے انسان، ایک ہی جذبے، ایک ہی کیفیت سے سرشار، ایک ہی دُھن میں مست ہیں۔ نیل کے ساحل سے کاشغر کی خاک تک پھیلے ایک ارب سے زائد مسلمان، مختلف سیاسی وحدتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، مختلف مفادات کے حامل، لیکن یہاں اُن کی شہریت، اُن کے پاسپورٹ، اُن کی شناخت، اُن کی قومیت، سب تحلیل ہو کر ایک پہچان میں گم ہو گئے۔ وہ صرف فرزندانِ توحید، صرف بندگانِ خدا ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے لیکن یوں جڑے بیٹھے ہیں جیسے برسوں کی رفاقت ہے۔ ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کر رہے لیکن سر جوڑے لمبی کہانیاں کہہ رہے ہیں۔ وہ زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار ملے ہیں۔ لیکن زمانوں کی اپنائیت اُن کے انگ انگ سے چھلک رہی ہے۔

عصر کی نماز کا وقت تھا۔ اندر بے پناہ رش کے باعث میں باب عبدالعزیز کے سامنے صحن میں بنی ایک صف میں کھڑا ہو گیا۔ زمین خاصی گرم تھی۔ ترکی سے آیا ایک بوڑھا بصد مشکل لاٹھی کے سہارے چلتے ہوئے آیا اور میرے دائیں ہاتھ کھڑا ہو گیا۔ بائیں کندھے پہ رکھی جانماز اُتاری اور مجھ سے مدد چاہی کہ بچھا دوں۔ میں نے اسے عین اُس کے سامنے بچھانا چاہا لیکن اُس نے میرا بازو پکڑ لیا اور اشارے سے سمجھایا کہ اسے دوسری طرح لمبا کر کے بچھاؤ۔ یعنی اس طرح کہ اُس کے پاؤں بے شک تپتی زمین پر رہیں لیکن جب ہم سجدہ کریں تو دونوں کے ماتھے مخملی جانماز پہ ٹکیں۔ میں نے چاہا کہ ترک بوڑھا جانماز پہ رہے اور اُس کے پاؤں زمین کی تپش سے بچے رہیں لیکن وہ نہ مانا۔ نماز ختم ہوئی تو اُس نے اپنا بایاں بازو میرے کندھے پہ رکھتے ہوئے شکستہ سی انگریزی میں پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟'' میں نے کہا ''پاکستان۔'' میں نے اُس کے سرخ و سفید چہرے پر پھیلی شفق گہری ہوتی محسوس کی۔ اُس نے اپنے بازو کا دباؤ بڑھاتے ہوئے مجھے اپنی طرف کھینچا اور میرے ماتھے پہ بوسہ دیا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ماتھے پہ ثبت بوسوں کی حرارت رُوح کی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔ یہ جانماز ترکی کا بوڑھا اپنے ساتھ لے جائے گا اور میرا سجدہ بھی دیار قسطنطنیہ چلا جائے گا۔ حرم ایک بڑی جانماز کی طرح میرے سامنے پھیلا تھا جس پر لاکھوں کروڑوں سجدے ہزاروں کہکشاؤں کی طرح دمک رہے تھے اور آسمان حسرت و حیرت سے اُسے تکے جا رہا تھا۔ عبودیت میں بھی کیا عجب انداز کی طرح داری و سرشاری ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

## مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

اس مقام بندگی کا سرچشمہ ایمان و یقین کے کوہستانوں سے پھوٹتا ہے۔ جب ہزار سجدوں سے نجات حاصل کر لینے والی جبیں ایک دہلیز پہ خم ہوتی ہے تو بندگی نا قابل یقین رفعتوں کو چھونے لگتی ہے۔ ایمان و یقین میں گندھی اِسی بندگی کے حامل مرد مسلمان کو علامہ نے بندہ مولا صفات کا نام دیا ہے جس کا دل ہر دو جہاں سے غنی اور جس کا ہاتھ، اللہ کے ہاتھ کی برکات سے مالا مال ہو کر غالب و کار آفریں، کار کشا و کار ساز بن جاتا ہے۔ لیکن کیا ہماری بندگی، ایمان و یقین کی اس تمازت سے ہم کنار ہے؟ اگر ہے تو ہم مرد مومن کے مطلوب سانچے میں کیوں نہیں ڈھل رہے؟

اپنے کمرے میں آتے ہی میں ایک بار پھر ''شارع ہجرت'' کی طرف نکل گیا۔ ایک بار پھر مختصر سا نورانی قافلہ سیاہ پتھروں اور بنجر گھاٹیوں سے راستہ بناتا دکھائی دیا۔ مجھے متعدد بار دیار حجاز آنے کی سعادت ملی لیکن نہ جانے کیوں کبھی مجھے مکہ معظمہ سے کوئی ساٹھ کلو میٹر دُور، طائف جانے کا خیال نہیں آیا۔ اب کے میں کسی نماز کے بعد حرم کے مرمریں ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ یکا یک میرا دل چاہا کہ میں طائف جاؤں۔ شاید آج وہاں صدیوں پہلے کے کچھ آثار موجود نہ ہوں لیکن وہ پہاڑ تو اپنی جگہ ہیں جنہوں نے حضورﷺ کو اہل طائف تک پیام حق پہنچاتے اور ستم کا نشانہ بنتے دیکھا تھا۔ میں نے مکہ میں مقیم اپنے دوست سے کہا کہ طائف جانا چاہتا ہوں۔ وہ بولا ''کسی سے ملنا ہے؟'' میں نے کہا ''نہیں۔ وہاں میرا کوئی شناسا نہیں۔ بس اُس بستی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو میرے حضورﷺ کے لیے نامہرباں تھی لیکن آج اُسی پیغام حق کی روشنی سے دمک رہی ہے۔'' پروگرام بن ہی رہا تھا کہ مجھے کسی مقامی نمبر سے فون آیا۔ ''میرا نام راجہ کمال ہے۔ میں طائف سے بول رہا ہوں۔ آپ سے ملنے آنا چاہتا ہوں۔'' مجھے حیرت ہوئی کہ میرے دل کی دھڑکن نے طائف پہ کیسے جادستک دی۔ عشاء سے ذرا پہلے راجہ کمال صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے ہمراہ راجہ ریاض بھی تھے۔ دونوں پاکستانی لگ بھگ دو عشروں سے یہاں مقیم ہیں۔ دونوں کا ذاتی کاروبار ہے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے طائف آنے کی دعوت دی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے حرم کے جگمگاتے میناروں کو دیکھا اور میرا یقین پختہ ہو گیا کہ آرزو، لفظوں میں ڈھل کر دعا نہ بن پائے تو بھی بارگاہ ناز تک ضرور پہنچتی ہے۔

طائف خوبصورت مقام ہے۔ مکہ سے طائف جانے والی نئی سڑک مری کی طرح پہاڑوں کے اندر بل کھاتی ہوئی اُوپر کو اُٹھتی ہے۔ راجہ کمال اور راجہ ریاض منتظر تھے۔ روایتی پاکستانی میزبانی نے ہمیں شرابور کر دیا۔ جب ہم وہ مقام دیکھنے نکلے جہاں کبھی کھجور کا باغ تھا اور جس جگہ اہل طائف کے پتھروں سے زخمی ہو جانے کے بعد حضورﷺ نے پناہ لی تھی۔ آسمان پہ سرمئی بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اور ٹھنڈی

ہوا چل رہی تھی۔ سیرت کی کتب میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ اور آپ کے رفیق سفر، حضرت زید بن حارثؓ اوباشوں کے چنگل سے نکل کر اس باغ میں پہنچے تو دھوپ میں شدت تھی اور آپ ﷺ کے زخموں سے لہو رِس رِس کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ عین اُس وقت بادل کا ایک ٹکڑا آپ ﷺ پہ سایہ فگن ہو گیا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شاید انہی بادلوں میں وہ ٹکڑا بھی ہو جس نے صدیوں قبل میرے حضور ﷺ پہ چھاؤں کی تھی۔ آسمان سے ایک پھوار سی پڑی جو صرف گاڑی کا شیشہ دکھا سکا۔ یہ باغ قریش مکہ کے ایک بڑے زمیندار ربیعہ کا تھا۔ اُس وقت ربیعہ کے دونوں بیٹے عتبہ اور شیبہ باغ میں موجود تھے۔ انہیں ترس آیا۔ اپنے عیسائی غلام عداس کے ذریعے ایک تھالی میں انگوروں کا ایک بڑا خوشہ بھجوایا۔ عداس نے مختصر سی گفتگو کی اور اُس کے دل میں ایک جگنو سا چمک اُٹھا۔ عتبہ اور شیبہ محروم رہے۔ وہ جنگ بدر میں لشکر کفار کا حصہ تھے۔ عتبہ کا بیٹا ابو حذیفہ اسلام لا کر لشکر نبوی ﷺ میں شامل تھا۔ عتبہ اور شیبہ دونوں ہلاکت سے دو چار ہوئے۔

ایک جگہ سڑک کے کنارے، بڑے بڑے سیاہ فام پتھروں کے عین نیچے ایک بہت قدیم مسجد بنی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں زخموں سے چور حضور ﷺ نے کچھ دیر قیام کیا تھا۔ میں زیادہ دیر وہاں نہ رُک سکا۔ اس قطعہ ارضی کا مرتبہ بھی کیا ہو گا جس کی خاک میں رسول پاک ﷺ کا لہو رچا بسا ہے؟ ایک دن اُم المومنین حضرت عائشہ نے پوچھا ”اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ پر کوئی احد کے دن سے بھی زیادہ سخت اور سنگین گزرا ہے؟“ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ”ہاں! مجھ پر سب سے مشکل اور سنگین دن وہ تھا جب میں اسلام کی دعوت دینے کے لیے طائف گیا تھا۔“ طائف ہی میں جبرئیل نے حضور ﷺ سے کہا تھا کہ ”آپ ﷺ چاہیں تو ان دو پہاڑوں کو آپس میں ملا کر اس گستاخ قوم کو پیس دیا جائے۔“ رحمت عالم ﷺ کا جواب تھا ”نہیں! مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسی اولاد پیدا کرے گا جو اللہ کی عبادت کرے گی اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گی۔“

آج حضور ﷺ پر پتھر برسانے والوں کی نسل اللہ کی عبادت کرتی اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتی۔ جا بجا انگور اور انار کے باغات بہار دکھا رہے ہیں اور طائف صدیوں آگے آ چکا ہے۔ میں سرِ شام طائف سے پلٹا تو بادل گہرے ہو گئے تھے اور ہوا کی خنکی خاصی بڑھ گئی تھی۔

[28-04-2010]

---

# موسسہ جنوبی ایشیا اور عدنان امین کاتب

طائف میں جابجا کھلے پھولوں کے رنگ عجب شوخ تھے۔ ایسے گلاب میں نے کم کم دیکھے ہیں۔ انار کے درختوں پہ عنابی رنگ کی کلیاں پھوٹ رہی تھیں۔ مکہ اور مدینہ کی طرح طائف کے پہاڑ بھی سنگلاخ ہیں جن پر روئیدگی کی کوئی رمق تک نہیں لیکن طائف میں سرسبزی و شادابی کثرت سے ہے۔ زرعی فارمز اور باغات یہاں کی پہچان ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر یاد آیا جو انہوں نے نواسہء رسول ﷺ حضرت امام حسینؓ کی عظیم قربانی کے حوالے سے کہا تھا۔

تا قیامت قطعِ استبداد کرد

موجِ خون او چمن ایجاد کرد

''اُس نے قیامت تک کے لیے ظلم واستبداد کا خاتمہ کر دیا اور اُس کے لہو کی موج سے چمنستان لہلہا اُٹھے۔'' حسینؓ کا لہو، احد اور طائف میں بہنے والے لہو کا ہی تسلسل تھا۔ اس لہو نے ہی قطع ظلم واستبداد کی بنیاد رکھی اور بے آب وگیاہ وادیوں کو تختہ ہائے لالہ وگل میں بدل دیا۔ طائف کے چمن زاروں کو دیکھ کر میرے ذہن میں مسلسل یہ مصرع گونجتا رہا۔

موجِ خون او چمن ایجاد کرد

میں مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ آ رہا تھا کہ فون پر ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔ ''میں ڈاکٹر ارسلان سبکتگین ہوں، آپ کا شاگرد۔ میری تقرری یہاں بطور ڈائریکٹر حج ہوگئی ہے۔ آپ کی راہنمائی اور دعاؤں کا خواست گار ہوں۔'' ارسلان ستر کی دہائی میں میرا شاگرد رہا۔ سی ایس ایس افسر ہے اور محنت شعار۔ میں نے اُسے دیارِ حجاز میں تقرری کی مبارک باد دی۔ اگلے دن ارسلان مجھے ملنے مکہ معظّمہ آ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ محنت اور دیانت کے ساتھ فرائض کی سرانجام دہی اور رزق حلال کی جدوجہد ہر کہیں کارِ ثواب ہے لیکن دیارِ پاک میں پاکستانی حجاج کی خدمت پر مامور ہونا ایک بڑی سعادت بھی ہے۔ ارسلان کی تقرری میرے دیرینہ دوست بحراللہ ہزاروی کی جگہ ہوئی ہے جو کم وبیش آٹھ سال خدمات سرانجام دینے کے بعد وطن واپس جا رہے ہیں۔ وہ عربی زبان پر گہرا عبور رکھتے ہیں۔ سعودی عرب میں حج انتظامات سے منسلک شخصیات اور اداروں سے اُن کا قریبی رابطہ بڑا مؤثر رہا ہے۔ انہیں خبر ہوئی۔ ملنے آ گئے۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ پاکستانی حجاج کے لیے انتظامات کی نگرانی کرنے والے ادارے، موسسہ حجاج جنوبی ایشیا کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اگلے دن اس کا اہتمام کر دیا۔ مدتوں بعد مجھے اس ادارے کے

سربراہ کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا جس کی جانفشانی اور اعلیٰ کارگزاری کی داستانیں ایک عرصے سے سن رہا تھا۔

دنیا بھر سے آئے حجاج اور عازمین عمرہ کی دیکھ بھال اور اُن کے لیے گوناگوں انتظامات، حکومت سعودی عرب کی سب سے بڑی ترجیح ہے۔ ایک ہی شہر میں 30 لاکھ کے لگ بھگ افراد کا جمع ہونا، ایک ہی سمت حرکت کرنا اور ایک ہی جگہ مقیم ہونا کوئی آسان بات نہیں۔ حکومت سعودی عرب اصلاح احوال کی مشق مسلسل سے گزرتی رہتی ہے اور حجاج کو آسانیاں فراہم کرنے کے لیے سہولیات وانتظامات کو بہتر سے بہتر بنانے کا عمل جاری رکھتی ہے۔ اس مقصد کے لیے چھ ادارے، کارپوریشنز یا موسسات قائم کیے گئے ہیں جو دنیا بھر سے آئے حجاج کے زمینی انتظامات کی نگرانی کرتے ہیں۔ موسسہ جنوبی ایشیا پر سب سے زیادہ حجاج کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ہے۔ پاکستان، بھارت، بنگلادیش، افغانستان، سری لنکا، برما، نیپال اور بھوٹان کے حاجی اس موسسہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ دوسرا موسسہ غیر عرب افریقی ممالک کے حجاج کے لیے ہے، تیسرا موسسہ جنوب مشرقی ایشیا، چوتھا موسسہ عرب ممالک، پانچواں موسسہ ایران جب کہ چھٹا موسسہ ترکی، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے لیے مخصوص ہے۔ گزشتہ برس سوان فلو کے باعث حجاج کی تعداد نسبتاً کم رہی۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 23 لاکھ 13 ہزار 278 افراد نے فریضہ حج ادا کیا جن میں سے تقریباً سات لاکھ افراد مقامی اور سولہ لاکھ سے زائد باہر کے ممالک سے آئے ہوئے تھے۔ مردوں کی تعداد خواتین کی تعداد سے کوئی دس فیصد زیادہ تھی۔ موسسہ جنوبی ایشیا نے کم وبیش پانچ لاکھ حجاج کی میزبانی کی۔ باہر سے آئے، مجموعی طور پر سولہ لاکھ حجاج نے دنیا بھر کے 184 ممالک کی نمائندگی کی۔

موسسہ کا دورہ میرے لیے دلچسپ بھی تھا، معلومات افزا بھی اور چشم کشا بھی۔ یہ ایک خوبصورت عمارت ہے جس کا افتتاح تقریباً نو برس قبل گورنر مکہ عبدالمجید بن عبدالعزیز آل سعود مرحوم نے کیا تھا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے جب صدر دروازے کے باہر موسسہ کے ڈائریکٹر جنرل تعلقات عامہ احمد میر نے ہمارا استقبال کیا۔ معروف عرب صحافی اور موسسہ کے جریدے کے مدیر خالد ثابت بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ احمد میر نے نہایت عمدہ بریفنگ دی اور موسسہ کے مختلف شعبے دکھائے۔ موسسہ کے قیام کے وقت اس سے منسلک ممالک سے آنے والے حاجیوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کم تھی۔ جس میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ دس سال قبل تک یہ تعداد تین لاکھ کو چھو رہی تھی اور اب پانچ لاکھ سے تجاوز کر رہی ہے۔ موجودہ چیئرمین عدنان محمد امین کاتب کوئی سولہ برس سے موسسہ کے چیئرمین ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ادارے کی کارکردگی کو بہتر، مؤثر اور کارگر بنانے کے لیے اَن تھک محنت کی ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ موسسہ کے سربراہ کا تقرر حکومت نہیں کرتی بلکہ اس کا انتخاب موسسہ کے زیر اہتمام آنے والے مکاتب کے معلمین کرتے ہیں جن کی تعداد اس وقت نوّے کے قریب ہے۔ یہ انتخاب

چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ جناب عدنان محمد امین کا تب کا انتخاب پہلی بار 1994ء میں عمل میں آیا۔ اس کے بعد سے وہ مسلسل منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے عہد کو حسن انتظام، استعداد کار اور خدمات حجاج کے اعتبار سے سنہری دور کہا جاتا ہے۔

جناب احمد میر نے مجھے موسسہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی دورہ کرایا۔ چھوٹا سا میوزیم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں مختلف تصاویر اور ماڈلز کے ذریعے حج کی پوری تاریخ سمو دی گئی ہے۔ اس میوزیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ کس قدر تبدیلیاں آگئی ہیں۔ نصف صدی پہلے تک حاجی رسی اور ڈول کے ذریعے زمزم کنوئیں سے نکالا کرتے تھے۔ بوسیدہ ٹاٹ کے خیموں کی جگہ اب فائر پروف ایئر کنڈیشنڈ خیمے مستقلاً نصب کر دیئے گئے ہیں۔ مختلف گیلریز میں حجاج کی خدمت کرنے والے بزرگان دین کی تصاویر آویزاں ہیں جن کا مقصد نئے معلمین کو اُسی جذبے کے ساتھ حاجیوں کی خدمت پر آمادہ کرنا ہے۔ موسسہ میں معلمین اور متعلقہ عملے کی خصوصی تربیت کا بھی اہتمام ہے۔ رات کے دس بجے بھی وہاں کلاسز جاری تھیں۔ خواتین کی خدمت کے لیے اب معلمات بھی تیار کی جارہی ہیں جو مختلف مکاتب سے وابستہ ہوں گی۔ یہ ایک طرح کا معاون عملہ ہوگا۔ موسسہ کا وسیع و عریض آڈیٹوریم مکہ معظمہ کے لوگوں کے لیے ایک علمی ثقافتی مرکز بھی ہے جہاں تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ موسسہ کی لائبریری بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

جناب عدنان امین کا تب خاص طور پر رات کو دفتر آئے۔ انہیں کام سے کام رکھنے والا نہایت ہی کم گو شخص خیال کیا جاتا ہے۔ مجھے اس محبت اور اپنائیت سے ملے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ کھل کر باتیں کیں اور اپنی افتادِ طبع کے برعکس بولتے چلے گئے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں کہنے لگے کہ پاکستانی حج مشن کی کارکردگی بہت اچھی ہے۔ پاکستان اور بھارت سے آئے ہوئے حجاج کا رویہ بھی باقی کی نسبت عمدہ ہوتا ہے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ اس سال سرکاری حج اسکیم کے تحت آنے والے تمام حجاج کو پرانے منیٰ میں خیمے ملیں گے جس کے متعلق حکومت پاکستان نے بڑا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ عدنان امین کا تب سے مل کر دل و دماغ کھل سے گئے۔ اُٹھتے وقت انہوں نے ایک بڑے فریم میں آراستہ غلاف کعبہ کا ایک بڑا ٹکڑا مجھے پیش کیا اور بولے ''اس برس تم حج میں میرے مہمان ہو گے۔''

مکہ کی رات ڈھل رہی تھی اور اللہ کی بے پایاں عنایات کا احساس میری آنکھوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

[29-04-2010]

---

# جبینیں تری آستانے ترے!

رُخصتی کا لمحہ بھی کیا درد رکھتا ہے۔

حرم کعبہ دُور دیس سے آئے عازمین عمرہ سے چھلک رہا ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ مجمع کم ہوگیا ہے۔ اگلی نماز میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عاشقان کا ہجوم بے کراں ہو چلا ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ اللہ کا گھر کبھی تنہا نہیں ہوا۔ مطاف ہر آن عقیدت مندوں کی چاپ سے آباد رہتا ہے۔ زیریں فرش سے بالائی منزلوں اور چھتوں تک، صحن حرم سے بیرونی احاطوں تک، جبینیں سجدہ ریز ہوتی رہتی ہیں۔ مسافر عمر بھر کی آرزو کا چراغ روشن کیے ہزاروں میل کی مسافتیں طے کر کے یہاں آتے ہیں، سجدوں کی سوغات حریم کبریا کی دہلیز پر رکھتے اور پھر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ پھر سے آنے کے لیے، کچھ عمر بھر کے لیے۔

بس اک داغ سجدہ مری کائنات<br>
جبینیں تری آستانے ترے!

یہ گھڑی دو گھڑی بھی زمانوں پر محیط ہوتی ہے۔ کیسے کیسے لوگ کس کس طرح ریزہ ریزہ جوڑ کر زادِ راہ جمع کرتے ہیں۔ شجر آرزو کو کیوں کر خون جگر سے سیراب کرتے ہیں۔ ہجر کی لمبی راتوں میں وصل کے خواب بوتے ہیں۔ مسلسل عرضیاں ڈالتے، مسلسل ریمائنڈر بھیجتے رہتے ہیں۔ تب کسی دن فائل منظوری کے لیے پیش ہوتی اور اذنِ باریابی جاری ہوجاتا ہے۔ مسافر دعاؤں، تمناؤں اور عرضیوں کی گٹھڑیاں باندھتے اور منزل جاناں کے دل کشا سفر پر نکلتے ہیں۔ اُن کی جبین نیاز میں ہزاروں سجدے مچلنے لگتے ہیں۔ وہ لمحہ اُن کے لیے حاصل زندگی ہوتا ہے جب اُن کی نگاہ خانہ کعبہ اور گنبد خضریٰ پر پڑتی ہے۔ آرزو کی تکمیل کی یہ گھڑیاں ہی اُن کے لیے سرمایۂ حیات ہوتی ہیں۔

پھر ایک دن وہ اپنے سجدے حرمین شریفین کی آغوش میں چھوڑ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ حرمین ان سجدوں کو سمیٹ کر اپنے توشہ خانے میں رکھ لیتے، مسافر کو حاضری کی سند دے کر رُخصت کرتے اور نئے آنے والوں کی دل داری میں لگ جاتے ہیں۔

یہ عجب سلسلہ ہے۔ کچھ زندگی بھر جتن کرتے رہتے ہیں اور پروانہ جاری نہیں ہوتا۔ کچھ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا حکم صادر ہوجاتا ہے۔ کچھ التجائیں کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ کچھ اپنی ہی دُھن

میں کسی اور راہ چل رہے ہوتے ہیں کہ دست غیب اُن کا رُخ اپنی بارگاہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ یہ بھی عجب ماجرا ہے کہ مکہ مدینہ کی حاضری اور پیہم حاضری بھی بعض پتھروں کو موم نہیں کرتی اور عمر بھر آرزو کی دھیمی آنچ میں سلگتے، کروڑوں ایسے ہیں جن کی آنکھیں مکہ مدینہ کو ترستی رہتی ہیں لیکن خانہ کعبہ اُن کے دل میں بسا ہوتا ہے۔ وہ میزاب رحمت کے عین نیچے بارش انوار میں جل تھل ہوتے رہتے ہیں۔ ملتزم سے لپٹ کر زاری کرتے ہیں۔ حطیم میں نوافل ادا کرتے ہیں۔ زمزم کے آبخورے بھر بھر کے پیتے ہیں اور حاضری کے بغیر ہی حضوری کی لذتوں سے سرشار رہتے ہیں۔ اور کروڑوں ایسے بھی ہیں جو حرمین شریفین کی جلوہ گاہوں میں کئی کئی راتیں گزارتے ہیں، نمازیں پڑھتے، زاری کرتے، سلام و درود پیش کرتے ہیں لیکن غیر حاضروں میں شمار ہوتے اور محروموں میں گنے جاتے ہیں۔ عقل بہانہ ساز کے پاس کوئی پیمانہ ہے ہی نہیں کہ کون بارگاہ ناز کے کتنا قریب اور کون کتنا دُور ہے۔ خرد کی نارسائی کے سارے فتوے ناقص ہی رہتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں روضۂ رسول ﷺ پر آخری سلام پیش کرنے والے ہر عقیدت مند کی دعاؤں میں ایک دعا یہ ہوتی ہے کہ اُسے پھر سے حاضری نصیب ہو۔ میں نے بھی یہ عرضی گزاری تھی اور باب جبریل سے آتی خنک ہوا کا ایک جھونکا میرا ماتھا چومتا ہوا گزر گیا تھا۔ آج خانہ کعبہ کے عین سامنے نماز فجر ادا کرنے کے بعد میں نے رب کعبہ کے حضور بھی یہی درخواست پیش کی۔ نہیں معلوم کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ میں دیر تک بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ کل بھی سحر کی انہی مشکبو ساعتوں میں فجر کی اذان گونجے گی۔ حرم اِسی طرح دُور ونزدیک سے آئے بندگانِ خدا سے چھلک رہا ہوگا۔ جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں کل کوئی اور پاکستانی، ایرانی، افغانی، سوڈانی، یمنی، مصری یا عراقی بیٹھا ہوگا۔ جہاں ابھی ابھی میری جبین نے زمین حرم کو بوسہ دیا تھا، وہاں کل کسی اور کی جبین سجدہ ریز ہو گی۔ اِسی طرح ابابیلوں جیسے ننھے پرندے خانہ خدا کے آس پاس اُوپر نیچے آتے چہچہا رہے ہوں گے۔ امام کعبہ کی پُرسوز قرأت اِسی طرح دلوں میں گداز پیدا کر رہی ہو گی۔ اور میں یہاں نہیں ہوں گا۔ بچھڑنے کے احساس نے مجھے آزردہ سا کر دیا۔ لیکن حرمین شریفین کی کہانی کچھ ایسی ہی ہے۔ کارواں آتے، پل دو پل رُکتے، پھر اپنی منزلوں کو نکل جاتے ہیں۔ اس بابے جیسے کتنے ہوں گے جو برسوں قبل اپنے گھر سے نکلا، کیسے کیسے پاپڑ بیلتا یہاں پہنچا اور پھر یہیں کا ہو کے رہ گیا۔ ہر رشتہ و پیوند سے بے نیاز وہ حرم کے کسی گوشے میں پڑا رہتا ہے۔ یہی اُس کی کل کائنات ہے۔ خواہشوں اور تمناؤں کے آزار سے آزاد یہ بوڑھا اپنی سلطنت کا بادشاہ ہے جو سب سے بڑے شہنشاہ کی چوکھٹ پر پڑا رہتا ہے۔

ابھی کچھ دیر بعد میں اپنی قیام گاہ سے نکلوں گا۔ خانہ کعبہ کا الوداعی طواف کروں گا۔ ملتزم کے عین سامنے سے گزرتے ہوئے ایک عرضی چھوڑ جاؤں گا۔ سرشام جدہ اور پھر پاکستان۔ جس وقت یہ کالم آپ کی نظروں کے سامنے ہوگا، میں انشاء اللہ پاکستان پہنچ چکا ہوں گا۔ پندرہ اخباروں کا ایک پلندہ میرے

پلنگ پر دھرا ہو گا۔ سیاست، بیانات، دھمکیاں، پارلیمنٹ، عدالت، لوڈ شیڈنگ، مظاہرے، مہنگائی، بے روزگاری، ٹی وی شوز......

؎ پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

لیکن پاکستان میرا وطن ہے۔ میری پناہ گاہ ہے۔ میری پہچان، میرا تشخص ہے۔ اس کی بنیادوں میں شہیدوں کا لہو ہے۔ اس کی تخلیق اس دل کش نعرے کی مرہون منت ہے جس کی گونج پانچ وقت حرمین شریفین میں سنائی دیتی ہے۔ دو ہفتے مسلسل میں پاکستان سے دُور تھا لیکن وہ میرے ساتھ ساتھ رہا۔ دعا کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جب وہ میرے دست طلب میں نہ ہو۔ وہ جیسا بھی ہے میرا ہے۔ میں اس کا مقروض ہوں۔

[30-04-2010]

# در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم است

شاید نامرادی کی گھاٹیوں میں بھٹکتے یہ سیاہ بخت اور تیرہ باطن لوگ نہیں جانتے کہ ہر مسلمان کے دل و دماغ میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ و مقام کیا ہے؟...... یا شاید وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور اسی آگہی کی بنیاد پر آئے دن ایسی مکروہ سازشوں کے جال بنتے رہتے ہیں تا کہ مسلمانوں کے لہو میں بارود بویا جائے، اُنہیں اس ہستی کے حوالے سے مشتعل کیا جائے جس سے محبت و عقیدت کو وہ اپنی جان، اپنے مال اور اپنی اولاد سے کہیں زیادہ گراں قیمت اثاثہ خیال کرتے ہیں۔ فتنے اُٹھانے، نہایت ہُنر کاری کے ساتھ چنگاریوں کو ہوا دینے، خاص طور پر مسلم نوجوانوں کے دل و دماغ میں تلاطم بپا کرنے، نفرتوں کے الاؤ بھڑکانے اور ماحول کو آتش ناک بنا کر اپنی خون خواری کے جواز تلاش کرنے والے یہ لوگ انتہائی مذموم اور مکروہ اہداف کے لیے توہین رسالت کو ایک حربے کے طور پر استعمال کرتے اور ایک بڑا تماشا لگانے سے پہلے مرضی کا ماحول بناتے ہیں۔

لیکن شاید وہ اس ازلی و ابدی حقیقت سے نا آشنا ہیں کہ راہ گم کردہ اور سوختہ بخت لوگ چودہ صدیوں سے ایسے متعفن حربوں میں ملوث رہے ہیں۔ وہ آسمان کی طرف منہ کر کے تھوکتے اور خود اپنا چہرہ غلیظ کرتے رہے۔ اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آب و تاب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ دہر میں اُس کا اُجالا بکھرتا جا رہا ہے۔ عشق کی لو تیز تر ہو رہی ہے۔ عقیدت کی سرمستیاں بڑھ رہی ہیں۔ مدینہ کی کشش فزوں ہو رہی ہے۔ سبز گنبد کی آغوش اُفق تا اُفق پھیلتی جا رہی ہے۔ اسلام دنیا میں انتہائی سرعت سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔ اور مغرب کی تمام تر مکروہات کا واحد نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسلام سے وابستگی بڑھ رہی ہے۔ اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت کا رنگ گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔

کسی ''فیس بک'' پر میرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاکہ کشی کا موضوع بنانے والی عورت، جو کوئی بھی ہے، اس لائق نہیں کہ میں نوک قلم پر اُس کا نام لاؤں۔ اُس نے اس حیا باختہ مہم کا اعلان کیا۔ ردّ عمل دیکھ کر وہ پسپا ہو گئی۔ لیکن اہل اسلام سے بُغض رکھنے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے مسلمانوں کے نازک ترین جذبات پر ضرب لگانے والوں کی کمی نہیں۔ اُنہیں اپنے ذہن و فکر کی غلاظتوں کے لیے ایک کوڑا دان چاہیے۔ اس ناپاک مہم پر ردّ عمل فطری تھا۔ سب سے زیادہ توانا آواز پاکستان میں اُٹھی۔ نوجوانوں نے پُر جوش مہم چلائی۔ رائے عامہ کو بیدار کیا۔ میڈیا کو توجہ دلائی۔ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور گستاخی کو بھی مالی مفادات اور بین الاقوامی تعلقات کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُس

وقت روبہ عمل آئے جب لاہور ہائی کورٹ نے ایک حکم جاری کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مذکورہ فیس بک اور ویب سائٹ اب بھی بلیک بیری فونز پر دستیاب ہے۔ اس کا کوئی سدباب ممکن نہیں؟ جامؔی نے کہا تھا

نسخہ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

( آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب دوجہاں کا دیباچہ ہیں۔ آقا صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ساری دنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کا درجہ رکھتی ہے۔) اور مشرق و مغرب کی درس گاہوں سے سیراب ہونے والے عظیم عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، علامہ اقبال کا کلام کیا گداز پیدا کر دیتا ہے۔ فلسفے کی گتھیاں سلجھانے اور بڑے بڑے علمی مسائل کی گرہ کشائی کرنے والا شاعر جب سرزمین حجاز کی طرف جا نکلتا اور شہر جاناں کا رُخ کرتا ہے تو اُس پر کیسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

در دلِ مسلم مقام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ست
آبروئے ما زنامِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ست
بوریا ممنون خوابِ راحتش
تاج کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
در نگاہِ او یکے بالا و پَست
باغلامِ خویش بَر یک خواں نشست
روزِ محشر اعتبار ماست اُو
درجہاں ہم پردہ دار ماست اُو
ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چوں نگاہِ نور چشمیم و یکیم
من چہ گو ہم از تو لائش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست
خاکِ یثرب ازدو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبرست

(مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام مسلمان کے دل میں ہے۔ ہماری عزت و آبرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راحت و آرام کے لیے ایک خستہ حال بوریے پہ احسان فرماتے تھے اور کسریٰ (شہنشاہ ایران) کا تاج آپ کی اُمت کے پاؤں تلے رُلتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا میں خلوت گزینی اختیار کی اور پھر ایک ملت، ایک آئین اور ایک حکومت تخلیق فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں نہ کوئی بالا تھا نہ پست۔ سب ایک تھے۔ اور وہ اپنے غلام کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی دسترخوان پہ کھانا کھاتے تھے۔ قیامت کے دن ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شفاعت پہ اعتبار ہوگا اور اس جہاں میں بھی ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور ہم وطن کی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ جس طرح دو الگ الگ آنکھوں کا نور ایک ہی ہوتا ہے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت و عقیدت کے بارے میں کیا عرض کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ ہیں جس کے فراق میں سوکھی ہوئی لکڑی کا تنا بھی گریہ و زاری کرنے لگا تھا۔ میرے لیے یثرب کی خاک دونوں جہانوں سے بہتر ہے۔ آہ! کیا دل و نگاہ کو ٹھنڈک دینے والا شہر ہے کہ جہاں میرا محبوب محوِ خواب ہے......)

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارا رشتہ کیا نزاکتیں رکھتا ہے؟ اقبال ہی نے رب العالمین کے حضور عرضی گزاری تھی۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پنہاں بگیر

(اے ربّ ذو الجلال! تیری ذات اقدس دونوں جہانوں سے غنی ہے اور میں ایک فقیر خستہ جاں ہوں۔ حشر کے دن تو میری گزارشات کو پذیرائی بخشتے ہوئے میری معافی قبول فرما لینا۔ اگر میرے نامۂ اعمال کو دیکھنا لازم ہی ٹھہرے، تو مجھ پہ اتنا کرم کرنا کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر سے چھپائے رکھنا۔)

اقبال کے یہ دو جاودانی اشعار، اُن کی کسی کتاب میں ہیں نہ کلیات میں۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جو میں کسی دن بیان کروں گا لیکن اس عرضی کی کتنی ہی تفسیریں لکھی جائیں، تشنگی باقی رہے گی۔ یہی ہے مسلمان کے قلب و نظر میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام۔ شاید مغرب کے یہ بدخو اور بدسرشت لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں اور یا پھر وہ آگاہ ہیں اور جان بوجھ کر تہذیبوں کے تصادم کی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی اسلحہ سازی کی صنعت جوان رہے اور مسلمانوں پہ پیہم ضربیں لگاتے رہنے کے جواز فراہم ہوتے رہیں۔

شاید وقت آگیا ہے کہ انفرادی کوششوں اور جزوی احتجاجی مظاہروں سے آگے نکل کر ایک جامع حکمت عملی تیار کی جائے۔ اس موضوع پر اسلامی کانفرنس کو متحرک کیا جائے۔ آخر وہ کس مرض کی دوا ہے؟ تمام اسلامی ممالک جمع ہوں۔ ایک جامع قرارداد اور مربوط لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ اقوام متحدہ کو بتایا جائے کہ اگر وہ واقعی امن عالم سے دلچسپی رکھتی ہے تو بارود پاشی کرنے والے عناصر کو لگام ڈالنے کا اہتمام کرے۔ اظہار رائے کی آزادی کا مطلب کسی کو گالی دینے اور اُس کے جذبات بھڑکانے کی کھلی چھٹی دینا نہیں۔ امریکہ سمیت ایک دنیا ہماری پشت پر انتہا پسندی کے تازیانے برسا رہی ہے۔ ہمارے دینی مدارس کو دہشت گردی کے سرچشمے قرار دیا جارہا ہے لیکن کوئی بتائے کہ مغرب کے اس رویے کو کیا نام دیا جائے جو آئے روز، دانستہ طور پر مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے کوئی نہ کوئی مکروہ سرکس لگاتا رہتا ہے؟ مسلم ممالک کو مشترکہ حکمت عملی اپناتے ہوئے اس نکتے پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ایسے مکروہات میں ملوث ممالک کے معاشی مفادات پر کس طرح ضرب لگائی جاسکتی ہے۔

ایک بات سختی کے ساتھ پلے باندھ لینی چاہیے کہ ہم کسی طور سازشوں کے اُس جال میں نہ آئیں جو ہمیں مشتعل کر کے اپنے مفادات کی بھٹی کا ایندھن بنانا چاہتے ہیں۔

[21-05-2010]

# از نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پنہاں بگیر!

دو چار دن قبل میں نے علامہ اقبال کی ایک سدا بہار رُباعی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دو اشعار علامہ کی کسی کتاب یا کلیات میں موجود نہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ بوئے گل کی طرح دل و دماغ کو معطر بنیر کر دینے اور رُوح میں گیلی لکڑی جیسی سلگاہٹ پیدا کر دینے والے ان دو اشعار کی مشکبو کہانی کسی دن سناؤں گا۔

ایک صدی سے زائد کا عرصہ ہوا۔ ڈیرہ غازی خان کے ترین قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک پٹھان، اللہ داد خان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اُس کا نام محمد رمضان رکھا گیا۔ رمضان ہونہار طالب علم نکلا۔ بی اے کے بعد بی ٹی کا امتحان پاس کیا اور بطور انگلش ٹیچر، سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ طبیعت میں فقیرانہ استغنا بھی تھا اور صوفیانہ بے نیازی بھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سرکار انگلیسیہ کا ملازم ہونے کے باوجود کبھی دیسی لباس ترک نہ کیا۔ چہرہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سجا تھا۔ ہمیشہ ہاتھ میں ایک موٹی سوٹی اور کندھے پر بڑا سا تولیہ ڈالے رکھتے۔ فارسی اور اُردو کے شعر کہتے۔ علامہ اقبال کے عشاق میں سے تھے۔ اُن کے کئی اشعار پہ تضمین کہی جو علامہ نے بہت پسند کی۔ مولانا فیض محمد شاہ جمالی کے مرید اور حضرت خواجہ نظام الدین تونسوی کے حلقہ نشین تھے۔ ایک سیاسی خاندان کے نوجوان، عطا محمد جسکانی سے گہرے لگاؤ کے باعث عطائی تخلص اختیار کیا اور محمد رمضان عطائی کہلانے لگے۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب عطائی ڈیرہ غازی خان کے گورنمنٹ سکول میں تعینات تھے۔ اُنہی دنوں اُن کے قریبی شناسا مولانا محمد ابراہیم ناگی بھی ڈیرہ غازی خان کے سب جج تھے۔ ابراہیم ناگی ایک درویش منش اور صاحب علم شخصیت تھے۔ آپ انیس ناگی کے والد اور معروف صحافی واصف ناگی کے دادا تھے۔ علامہ اقبال سے گہری محبت رمضان عطائی اور ابراہیم ناگی کے درمیان دوستانہ قربت کی قدر مشترک تھی۔ مولانا ابراہیم کو علامہ اقبال سے ملاقاتوں کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

ایک دن مولانا ابراہیم لاہور گئے۔ علامہ سے ملاقات ہوئی۔ واپس آئے تو سر شام معمول کی محفل جمی۔ علامہ اقبال سے ملاقات کا ذکر چلا تو عطائی کا جنوں سلگنے لگا۔ مولانا نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر عطائی کو دکھایا۔ اور کہنے لگے۔ لو عطائی! علامہ صاحب کی تازہ رُباعی سنو۔ پھر وہ ایک عجب پُر کیف انداز میں پڑھنے لگے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر

مولانا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے لیکن محمد رمضان عطائی کی کیفیت روتے روتے دگرگوں ہوگئی۔ اِسی عالم وجد میں فرش پر گرے۔ چوٹ آئی اور بے ہوش ہو گئے۔ رُباعی اُن کے دل پر نقش ہو کے رہ گئی۔ اُٹھتے بیٹھتے گنگناتے اور روتے رہتے۔ اُنہی دنوں حج پر گئے۔ خود اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ جب حجاج اوراد و وظائف میں مصروف ہوتے تو وہ زاروقطار روتے اور علامہ کی رُباعی پڑھتے رہتے۔

حج سے واپسی پر عطائی کے دل میں ایک عجیب آرزو کی کونپل پھوٹی۔ ''کاش یہ رُباعی میری ہوتی یا مجھے مل جاتی۔'' یہ خیال آتے ہی علامہ اقبال کے نام ایک خط لکھا...... '' آپ سر ہیں۔ فقیر بے سر۔ آپ اقبال ہیں۔ فقیر مجسم ادبار۔ لیکن طبع کسی صورت کم نہیں پائی۔'' انہوں نے علامہ کے اشعار کی تضمین اور اپنے چیدہ چیدہ فارسی اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا''...... فقیر کی تمنا ہے کہ فقیر کا تمام دیوان لے لیں اور یہ رُباعی مجھے عطا فرمادیں۔'' کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اُنہیں علامہ کی طرف سے ایک مختصر سا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا:۔

''جناب محمد رمضان صاحب عطائی

سینئر انگلش ماسٹر۔ گورنمنٹ ہائی سکول۔ ڈیرہ غازی خان

لاہور: 19 فروری 1937ء

جناب من! میں ایک مدت سے صاحبِ فراش ہوں۔ خط و کتابت سے معذور ہوں۔ باقی، شعر کسی کی ملکیت نہیں ۔ آپ بلا تکلف وہ رُباعی، جو آپ کو پسند آگئی ہے، اپنے نام سے مشہور کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

فقط

محمد اقبال۔ لاہور''

علامہ کی یہ عطا، عطائی کے لیے توشۂ دو جہاں بن گئی۔ علامہ نے یہ رُباعی اپنے نئی کتاب ''ارمغانِ حجاز'' کے لیے منتخب کر رکھی تھی۔ عطائی کی نذر کر دینے کے بعد انھوں نے اسے کتاب سے خارج کر کے، تقریباً اِسی مفہوم کی حامل ایک نئی رُباعی کہی جو ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہے۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکُن رُسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ مَن زچشمِ او نہاں گیر

(اے میرے رب! جب (روزِ قیامت) یہ جہانِ پیرا اپنے انجام کو پہنچ جائے اور ہر پوشیدہ تقدیر ظاہر ہو جائے تو اُس دن مجھے میرے آقا و مولا ﷺ کے حضور رُسوا نہ کرنا اور میرا نامۂ اعمال آپ ﷺ کی نگاہوں سے چھپا رکھنا۔)

ایم اے فارسی کا امتحان دینے لاہور گئے تو عطائی شکریہ ادا کرنے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہمراہ جانے والے چودھری فضل داد نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''بوڑھا طوطا ایم اے فارسی کا امتحان دینے آیا ہے۔'' علامہ ایک کھری جھلنگا چارپائی پر احرام نما سفید چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ بولے۔ ''عاشق کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔'' رُباعی کا ذکر چل نکلا۔ عطائی نے جذب و کیف سے پڑھنا شروع کیا۔ ''تو غنی از ہر دو عالم......'' علامہ کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ اتنا روئے کہ سفید چادر کے پلو بھیگ گئے۔ اس کے بعد بھی عطائی کی علامہ سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات علامہ کے انتقال سے کوئی چار ماہ قبل دسمبر 1937ء میں ہوئی۔ انہوں نے علامہ سے کہا۔ ''سنا ہے جناب کو دربارِ نبوی ﷺ سے بلاوا آیا ہے۔'' علامہ آبدیدہ ہو گئے...... آواز بھرا گئی۔ بولے...... ''ہاں! بے شک لیکن جانا نہ جانا یکساں ہے۔ آنکھوں میں موتیا اُتر آیا ہے۔ یار کے دیدار کا لطف دیدۂ طلب گار کے بغیر کہاں؟'' عطائی نے کہا...... ''جانا ہو تو دربارِ نبوی ﷺ میں وہ رُباعی ضرور پیش فرمائیے گا جواب میری ہے۔'' علامہ زار و قطار رونے لگے۔ سنبھلے تو کہا ...... ''عطائی! اس رُباعی کو بہت پڑھا کرو۔ ممکن ہے خداوند کریم مجھے اس کے طفیل بخش دے۔''

21 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال انتقال فرما گئے۔ عرصہ بعد شاہی مسجد کے احاطے میں اُن کے مزار کی تعمیر شروع ہوئی تو ہر ہفتے اور اتوار کو ایک مجذوب سا شخص لاٹھی تھامے مسجد کی سیڑھیوں پہ آبیٹھتا اور شام تک موجود رہتا۔ وہ زیرِ تعمیر مزار پہ نظریں گاڑے ٹک ٹک دیکھتا رہتا۔ کبھی یکا یک زاری شروع کر دیتا، کبھی طواف کے انداز میں مزار کے چکر کاٹنے لگتا۔ اُس کا نام محمد رمضان عطائی تھا۔

مولانا محمد ابراہیم ناگی کبھی کبھی کہا کرتے۔ ''ظالم عطائی! کان کنی تو میں نے کی اور گوہر تو اُڑا لے گیا۔ بخدا! اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ حضرت غریب نواز (علامہ اقبال) اتنی فیاضی کریں گے تو میں اپنی تمام جائیداد دے کر یہ رُباعی حاصل کر لیتا اور مرتے وقت اپنی پیشانی پر لکھوا جاتا۔''

محمد رمضان عطائی سینئر انگلش ٹیچر 1968ء میں اس جہاں فانی سے رُخصت ہو گئے۔ انہوں نے اپنی وصیت میں لکھا۔ ''میرے مرنے پر اگر کوئی وارث موجود ہو تو رُباعی مذکور میرے ماتھے پہ لکھ دینا اور میرے چہرے کو سیاہ کر دینا۔'' مجھے معلوم نہیں پس مرگ اُن کے کسی وارث نے اس عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پہ وہ رُباعی لکھی یا نہیں لیکن ڈیرہ غازی خان کے قدیم قبرستان، ''ملا قائد شاہ'' میں کوئی بیالیس برس پرانی ایک قبر کے سرہانے نصب لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پنہاں بگیر

[24-05-2010]

# اظہارِ تشکر

یہ کالم اظہارِ تشکر اوراعتراف سپاس کے لیے ہے ورنہ ایک قرض کی نادہندگی کا احساس مجھے دیر تک ستاتا رہتا۔ ''از نگاہ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر'' کے عنوان سے لکھے گئے کالم کی پذیرائی میرے وہم وگماں سے ماوراء تھی۔ میں جانتا ہوں مگر یہ میرے قلم یا کالم کا نہیں، جذب وعشق سے لبریز اُن کلمات کا اعجاز ہے جو شعر کا جامہ رنگیں پہن کر اپنے عہد کے عظیم ترین شاعر کی زبان پر آئے اور لوحِ کون ومکاں پہ ثبت ہوگئے۔ ''اے میرے رب! میرا نامۂ اعمال دیکھنا ہی چاہے تو مصطفیٰ ﷺ کی نگاہوں سے چھپا کے دیکھنا'' یہ التجا عشق رسول ﷺ کی تمازتوں سے فروزاں دل میں ہی جنم لے سکتی ہے یا اسے علامہ ہی کے الفاظ میں ''کسی درماندہ راہرو کی صدائے دردناک'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مجھے ایک مدت سے اس بات کا علم تو تھا کہ علامہ نے یہ شہرہ آفاق رُباعی، محمد رمضان عطائی نامی کسی مردِ طرح دار کو بخش دی لیکن تفصیلات اور جزئیات سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ ارادہ تھا کہ میں پورا کھوج لگا کر رنگ ونور سے معمور یہ کہانی کسی دن اپنے قارئین کو سناؤں گا۔ اس ارادے کا تذکرہ میں نے 21 مئی کے کالم ''دردل مسلم مقام مصطفیٰ ﷺ است'' میں کیا۔ شاید اس ارادے کا اظہار ایسے مستجاب لمحے میں ہوا جب کوئی آرزو چپکے سے دعا کا جامہ پہنتی اور عرش کی بلندیوں کو پرواز کر جاتی ہے۔ صبح ہی صبح برادرم افتخار عارف کا فون آیا۔ انہوں نے ''علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خان'' نامی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اس میں خاصی تفصیلات موجود ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے کتاب خانے سے تلاش کر کے ایک آدھ دن میں یہ کتاب مجھے بھیج دیں گے۔

میرے دل کی خلش اور جستجو کی تپش بڑھ گئی۔ جہانگیر بکس کے ناظم فواز نیاز کو فون کیا۔ اُن کے اسٹاف نے لاہور کی چھوٹی بڑی کئی دکانیں چھان ماریں اور ناکام رہے۔ دوپہر کو، ایک طویل عرصے کے بعد مجھے جنگ کے کالم نگار اور اپنے دیرینہ دوست جبار مرزا کا فون آیا۔ میرے کالم کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ دل کش انکشاف کیا کہ ''علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خان'' کا ایک نسخہ اُن کے پاس موجود ہے۔ میں نے پوچھا ''کہاں سے ملا؟'' کہنے لگے۔ ''افتخار عارف صاحب سے لایا تھا۔ اب وہ صبح سے واپسی کا پُرزور تقاضا کر رہے ہیں لیکن میں انہیں کتاب لوٹانے سے پہلے اس کی فوٹو کاپی کرا کے آپ کو بھی دوں گا۔'' یہ سب کچھ اپنے آپ ہی ہو رہا تھا۔ مردِ قلندر کے معجزاتی کلام کا روحانی تصرف میری راہیں آسان بنا رہا تھا۔

شام کو جبار مرزا خود آئے اور کتاب کی ایک خوبصورت عکسی کاپی گھر چھوڑ گئے۔ 314 صفحات پر

مشتمل اس کتاب کے مصنف، مرتب یا خالق، جناب ہاشم شیر خان ہیں۔ کتاب پہلی بار 2001ء میں بیکن ہاؤس، گلگشت، ملتان نے شائع کی جواب بڑی حد تک نایاب ہے۔ پہلے باب میں علامہ کے وہ پچیس خطوط شامل ہیں جو انہوں نے ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھنے والی مختلف شخصیات کو لکھے۔ ایک باب اُن شخصیات کے تذکرے پر مشتمل ہے جنہیں علامہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ تیسرا باب، جسے رُوحِ کتاب کہنا چاہیے، محمد رمضان عطائی اور علامہ اقبال کی شہرہ آفاق رُباعی پر مشتمل ہے۔ اس میں عطائی کی وہ ڈائری بھی شامل ہے جس میں مرحوم نے علامہ سے ہونے والی تین ملاقاتوں اور حاضری کی واردات قلبی کا تذکرہ کیا ہے۔ میں نے اب تک اس رُباعی کے تیسرے مصرع کو ''گرتو می بینی حسابم ناگزیر'' پڑھا اور لکھا لیکن رمضان عطائی نے، علامہ کے خط کی خالی جگہ پر اپنے قلم سے جو رُباعی رقم کی اور جس طرح اس کا حوالہ اپنی تحریروں میں دیا، اس میں یہ مصرع ''ور حسابم راتو بینی ناگزیر'' ہی لکھا۔ اقبالیات کے محققین کو رہنمائی کرنی چاہیے۔

علی الصباح پہلا فون سابق صدر جناب محمد رفیق تارڑ کا آیا۔ کسی تمہید و تفصیل کے بغیر کہنے لگے۔ ''مجھے بے حد رنج ہو رہا ہے۔ 1968ء میں، میں ڈیرہ غازی خان میں تعینات تھا۔ عطائی سے شناسائی ہوتی تو اُن کی نماز جنازہ میں ہی شریک ہو جاتا۔'' عطاء الحق قاسمی نے محبت آمیز تحسین کے ساتھ عشق اقبال کا ایک واقعہ سنایا۔ کراچی سے اکرم کمبوہ کا فون اور پھر ایک تفصیلی فیکس۔ یہ خط بذات خود ایک کالم ہے لیکن کسی آئندہ نشست میں۔ تارڑ صاحب کے توسط سے میری ڈیرہ غازی خان کے سینئر ایڈووکیٹ شیخ سردار عالم صاحب سے بات ہوئی۔ اُن کی عنایت سے ہاشم شیر خان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہاشم خان صاحب وکالت کے پیشے سے منسلک ہیں اور بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ رمضان عطائی کے تین صاحبزادے تھے۔ تینوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ عطائی کے پوتے البتہ ہیں۔ حامد میر نے علامہ کی رُباعی سے اپنے والد مرحوم کے والہانہ تعلق کی کہانی سنائی۔ جن دنوں میں ایوان صدر میں تھا، یہ رُباعی ایک فریم میں جڑی میرے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی۔ حامد میر ایک دو بار میرے دفتر میں آئے اور عجب نگاہوں سے رُباعی کو دیکھتے اور پڑھتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے رُباعی ایک کاتب سے لکھوا کر خوبصورت فریم کے ساتھ حامد کو پیش کی تھی۔ گوجرانوالہ سے برادرم ذوالفقار چیمہ کا فون آیا کہ عشق رسول ﷺ اُن کے خاندان کا اثاثہ ہے۔

یہ کالم اظہارِ تشکر اور اعتراف سپاس کے لیے ہے۔ برادرم افتخار عارف کی دلچسپی اور جبار مرزا کی فوری عملی مدد کا شکریہ۔ جناب رفیق تارڑ کا شکریہ کہ انہوں نے شیخ سردار عالم اور ہاشم شیر خان تک رابطے کی راہ فراہم کی۔ میرے کالم کے مواد کا بڑا ماخذ جناب ہاشم شیر خان کی کتاب تھی۔ وہ اجازت دیں تو میں خود اس کتاب کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ شائع کرانے کا اہتمام کروں۔ یہ اس قابل ہے کہ اقبال کے

زیادہ سے زیادہ شیدائیوں کو اس تک رسائی ہو۔ میں فطرتاً سفر سے کتراتا ہوں لیکن اکثر و بیشتر سفر میں رہتا ہوں۔ سفر گریزی کے باوجود، سفر کے تصور تک کو پگھلا دینے والی اس شدید گرمی میں میرا جی چاہتا ہے کہ ڈیرہ غازی خان جاؤں۔ ہاشم شیر خان اور عطائی کے پوتوں سے ملوں۔ کسی دن چلچلاتی دھوپ میں بغیر چھتری لیے، ڈیرہ غازی خان کے قدیم قبرستان، ملا قائد شاہ کی طرف نکل جاؤں اور ایک پرانی سی قبر کے سرہانے نصب تعویذ پر نظریں جمائے اللہ کے حضور دعا کروں۔

تو غنی ازہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پنہاں بگیر

(اے رب ذوالجلال! تو دونوں جہانوں سے غنی ہے۔ روز قیامت میرے نامۂ اعمال سے درگزر کرتے ہوئے میری التجا قبول فرما اور اگر میرا نامۂ اعمال دیکھنا ناگزیر ہی ٹھہرے تو اتنا کرم کرنا میرے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا۔)

اور پھر کسی گوشے میں بیٹھ کر اُس عاشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کروں جس نے اپنی شاعری کے حوالے سے دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا تھا:

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بہ حرفم غیر قرآں مضمر است
تنگ کن رخت حیات اندر برم
اہل ملت را نگہدار از شرم
روز محشر خوار و رُسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

(اے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم! اگر میرے دل کا آئینہ بے جوہر ہے، اُجلا اور شفاف نہیں، اور اگر میرے کلام میں قرآنی فکر کے علاوہ کچھ اور چھپا ہوا ہے تو میرا جامہ زندگی میرے جسم پر تنگ کر دیجئے اور ملت اسلامیہ کے افراد کو میرے شر سے محفوظ کر لیجئے۔ اے میرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اگر ایسا ہو تو قیامت کے دن مجھے ذلیل و رُسوا کر دیجئے اور سزا کے طور پر مجھے اپنے پائے مبارک کو بوسہ دینے سے محروم فرما دیجئے۔)

جہانِ شعر و سخن میں ہے کوئی دوسرا جسے اپنے معجزہ فن پہ ایسا اعتماد ہو؟

[26-05-2010]

# عامر...... جوامر ہو گیا......!

سفید ریش مردِ بزرگ کے چہرے پر گردِ ملال کے بجائے دائم رہنے والا سکون تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سلگتی راکھ کے اندر سے روشنی کے دھارے پھوٹ رہے تھے۔ اُس کے ہونٹ خاموش تھے لیکن دل کے دُور اندر تک اُتر جانے والی مشکبو سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ کسی زاویے سے بھی اندوہ کی گرفت میں نہیں لگتا تھا۔ اُسے دیکھ کر گمان نہ گزرتا تھا کہ اُس کا واحد بیٹا، تین بہنوں کا اکلوتا بھائی، بھری جوانی میں ہمیشہ کے لیے اُس سے بچھڑ گیا ہے اور اُس کی میّت سات سمندر پار برلن کے کسی سردخانے میں پڑی وطن آنے کا انتظار کر رہی ہے۔ جواں مرگ بیٹوں کے کڑیل درختوں جیسے جری باپ بھی، دیمک زدہ شہتیر کی طرح ٹوٹ گرتے ہیں لیکن کیسا باپ تھا کہ شجر بہار کی طرح لودے رہا تھا۔

28 سالہ نوجوان، عامر عبدالرحمٰن چیمہ کے بارے میں جرمنی سے خبر آئی کہ اُس نے برلن جیل کی کوٹھڑی میں خودکشی کر لی۔ کوئی جرمن حکام کی یہ بات ماننے پر تیار نہیں۔ وہ بھی جو اس خوبصورت اور خوب سیرت نوجوان کو جانتے ہیں اور وہ بھی جنہوں نے اس کی کہانی سن رکھی ہے۔ وہ دینی مزاج کے گھرانے کا فرزند تھا۔ نماز، روزہ، تلاوت، تسبیح، اوراد، وظائف، دعاؤں اور مناجات سے معمور ماحول میں پرورش پانے والے اس نوجوان کے رگ وپے میں دینی حمیت بھی تھی، عشق کی آتش خاموش بھی، عزم اور پیکار کی چنگاریاں بھی لیکن وہ ہارنے والا نہ تھا۔ خودکشی کا راستہ صرف ہار جانے والوں کا راستہ ہوتا ہے۔

اُس نے 4 دسمبر 1977ء کو حافظ آباد میں آنکھ کھولی۔ شریف النفس اور نیک نام باپ، پروفیسر محمد نذیر چیمہ نے دو بیٹیوں کے بعد پیدا ہونے والے بیٹے کا نام عامر عبدالرحمٰن رکھا۔ عامر نے گورنمنٹ جامعہ ہائی سکول راولپنڈی سے میٹرک کیا۔ 1994ء میں اُس نے فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی سے پری انجینئرنگ میں ایف ایس سی کا امتحان 80 فیصد کے لگ بھگ نمبر حاصل کر کے پاس کیا۔ نیشنل کالج آف ٹیکسٹائل انجینئرنگ فیصل آباد سے بی ایس سی کرنے کے بعد عامر نومبر 2004ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلا گیا جہاں اس نے ''منشن گلیڈ باخ'' کی یونیورسٹی آف اپلائیڈ سائنسز کے شعبہ ٹیکسٹائل اینڈ کلودنگ مینجمنٹ میں داخلہ لے لیا۔ چوتھا سمسٹر شروع ہونے سے قبل فروری کے وسط میں یونیورسٹی میں کوئی ایک ماہ کی چھٹیاں ہو گئیں۔ وہ چھٹیاں گزارنے برلن چلا گیا جہاں اُس کی ماموں زاد بہن اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ قیام پذیر تھی۔ 11 مارچ کو یونیورسٹی کھل گئی لیکن عامر واپس نہ پہنچا۔ مارچ کے آخری ہفتے میں پروفیسر نذیر نے برلن اپنے عزیزوں سے بات کی لیکن عامر کا نام آتے ہی فون

بند ہو گیا۔ 8 مارچ کو عامر نے آخری بار فون کر کے اپنے خالہ زاد بھائی کو شادی کی مبارک باد پیش کی تھی۔ ٹھیک ایک ماہ بعد 8 اپریل کو برلن کے عزیزوں نے خبر دی کہ عامر 20 مارچ کو گرفتار ہو گیا تھا اور وہ برلن پولیس کے زیر تفتیش ہے۔ اُس پر الزام ہے کہ اُس نے رسول کریم ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کرنے والے ایک اخبار کے ایڈیٹر پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ پولیس نے عامر کی ماموں زاد بہن کے گھر اور اُس کی یونیورسٹی اقامت گاہ پر چھاپہ مارنے کے لیے 23 مارچ کو عدالت سے اجازت چاہنے کے لیے جو ''ضمنی'' پیش کی، اس میں کہا گیا کہ ''عامر نذیر نے ایک روزنامے ''DIE WELT'' کے دفتر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ سکیورٹی گارڈ نے روکا تو اُس نے شکاری چاقو نکال لیا اور بم چلانے کی دھمکی دی تاکہ وہ بیورو چیف کے دفتر میں داخل ہو سکے۔ بعد کی خبروں میں بتایا گیا کہ عامر نے توہین رسالت ﷺ کے مرتکب اخبار کے ایڈیٹر پر حملہ کیا جس سے ایڈیٹر کو گہرے زخم آئے۔ اِسی دوران گارڈ نے عامر پر قابو پا لیا۔

پروفیسر نذیر نے اپنے طور پر حکام اور سیاست دانوں سے رابطے شروع کر دیئے۔ قومی اسمبلی کے رُکن ڈاکٹر فرید پراچہ نے برلن میں پاکستانی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری خالد عثمان قیصر سے فون پر بات کی تو تصدیق ہو گئی کہ عامر برلن پولیس کی گرفت میں ہے اور اس پر توہین رسالت ﷺ کے مرتکب اخبار کے ایڈیٹر پر حملہ کرنے کا الزام ہے۔ اس کے بعد پروفیسر نذیر چیمہ اور خالد عثمان قیصر رابطے میں رہے۔ گمان یہی تھا کہ عامر کو ڈی پورٹ کر دیا جائے گا لیکن کسی طرح کی پیش رفت نہ ہوئی۔ چالیس دن سے زائد کا وقت گزر جانے کے بعد بھی پولیس چالان عدالت میں پیش نہ کر سکی اور نہ مقدمے کی کارروائی شروع ہو سکی۔

2 مئی کو وکیل کے ذریعے عزیزوں نے عامر کو کپڑے، ٹوتھ پیسٹ اور کچھ دیگر اشیاء بھجوائیں۔ 4 مئی کو انہیں پولیس کی طرف سے اطلاع ملی کہ عامر نے خودکشی کر لی ہے۔ ماموں زاد بہن نے برلن سے حافظ آباد میں عامر کی بہن صائمہ کو خبر دی۔ پھر یہ خبر راولپنڈی کی اس غریب و سادہ سی بستی میں پہنچی جہاں عامر کے والدین اور سب سے چھوٹی بہن مقیم ہے۔ بوڑھی ماں اور تین بہنوں کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ دُنیا بدل چکی ہے اور رُوٹھ جانے والے روز و شب اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ایک بھرا پُرا خاندان کھنڈر سا ہو کے رہ گیا ہے۔

جمعہ کی شام میں نوید ہاشمی کے ہمراہ پروفیسر نذیر چیمہ کے گھر پہنچا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ گھر کی ساری نزدیکی گلیوں میں یہ گھر شہید کے گھر کے طور پر مشہور ہو گیا ہے۔ برآمدہ اور کمرے لوگوں سے بھرے تھے جن میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔ پروفیسر نذیر چیمہ میرے پہلو میں بیٹھ گئے لیکن مجھے کلام کا یارا نہ تھا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟

میں اس سوچ میں گم تھا کہ آخر ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ سولہ کروڑ انسانوں کے ایک ایٹمی ملک پر کس نے منتر پھونک دیا ہے کہ اس کے حکمرانوں نے قومی حمیت کو جنس بازار بنا دیا ہے؟ اس کا ایک شہری 20 مارچ کو گرفتار ہوا اور 4 مئی کو پولیس تشدد کے سبب شہید ہو گیا؟ حکومت پاکستان کامل ڈیڑھ ماہ تک کیا کرتی رہی؟ اس پہ لازم آتا ہے کہ وہ 44 دنوں کی پوری رُوداد قوم کے سامنے رکھے اور بتائے کہ اس نے ایک پاکستانی کو جرمنوں کے تشدد سے بچانے کے لیے کیا کیا؟ پاکستانی سفارت خانہ باخبر ہو چکا تھا تو حکومت پوری طرح کیوں متحرک نہ ہوئی؟ ایک ڈینئیل پرل کسی کے ہاتھوں مارا گیا تو ہم نے کیسے کیسے نوحے نہ پڑھے؟ کیسے کیسے بین نہ کیے؟ امریکہ میں پاکستانی نسلی تشدد کا شکار ہو گئے ہم چپ رہے، یونان میں پاکستانیوں کو قطار میں کھڑا کر کے چھلنی کر دیا گیا اور ہم خاموش رہے، قندھار میں 18 پاکستانیوں کو بھون دیا گیا اور ہمارے لب سلے رہے، امریکہ پاکستان میں آ کر ہزاروں پاکستانیوں کے پرخچے اُڑا گیا اور ہماری قوت گویائی مفلوج رہی۔ برازیل کا ایک شہری برطانوی پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہوا تو وہاں کی حکومت نے تاجِ برطانیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ وزیر خارجہ کو ڈالروں کی بوری بھر کے جانا پڑا اور پوری قوم سے معافی مانگنا پڑی۔ پاکستانی ماؤں کی کوکھ سے جنم لینے والے بیٹوں کا لہو اتنا ارزاں کیوں ہو گیا ہے؟

پروفیسر نذیر نے دبے لفظوں میں کہا ''یہاں کسی گورے کے کتے کو کانٹا بھی چبھ جائے تو کمیشن بیٹھ جاتے ہیں اور معافیاں شروع ہو جاتیں، مجھے رنج یہ ہے کہ ہمارا فارن آفس بھی خودکشی کی تھیوری میں شریک ہو گیا ہے۔ ان لوگوں سے میں کیا توقع رکھ سکتا ہوں۔''

اگر عامر نے کچھ نہیں کیا اور وہ برلن پولیس کے تشدد کا لقمہ بن گیا تو بھی وہ معصوم اور شہید ہے اور اگر اُس نے وہ کچھ کیا جو برلن پولیس بتا رہی ہے تو......!

یہ وہ مقام ہے جہاں جنید و بایزید بھی اپنی سانسوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ سو میرا قلم اس جوان رعنا کے درجات بلند کی رفعتوں کے تذکرے سے قاصر ہے۔ 9 مئی کو جب اسؒ کا تابوت راولپنڈی کے ائیر پورٹ پر اُترے گا تو مجھے معلوم نہیں کہ کون اُس کا استقبال کرے گا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اُس کی نرم و لطیف رُوح آسمانوں کے زینے طے کرتی سب سے متبرک منطقوں میں پہنچے گی، جانے جنت کے کون کون سے جھروکوں سے کون کون سی ہستیاں اُسے خوش آمدید کہیں گی اور جانے کن کن دریچوں سے سدا بہار گلابوں کی شبنمی پتیاں نچھاور ہو رہی ہوں گی۔

[07-05-2006]

---

# قوم اپنے بیٹے کی منتظر ہے!

ہمیں کسی تحقیقی رپورٹ کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنے بیٹے کا جسد خاکی چاہیے کہ ہم اسے اعزاز کے ساتھ وطن کی مٹی کے سپرد کرسکیں۔ ہم یہ بھی نہ کر پائے تو روزِ محشر حضور ختمی مرتبت ﷺ کو کیا جواب دیں گے؟

حکومت پاکستان کو اب خبر ہوئی ہے کہ عامر عبدالرحمٰن چیمہ نامی ایک نوجوان برلن کی ایک جیل میں جان سے گزر گیا ہے۔ ایک دورُکنی ٹیم اس کی موت کے اسباب کا جائزہ لینے برلن پہنچ گئی ہے۔ جب یہ ٹیم، مقامی پولیس سے مل کر تحقیقات کا آغاز کرے گی، عامر کی شہادت کو ایک عشرہ گزر چکا ہو گا۔ جرمن پولیس کبھی نہیں چاہے گی کہ اس کے بہیمانہ تشدد کا کوئی ادنیٰ سا ثبوت بھی باقی رہے۔ یوں بھی پاکستان ان دنوں پت جھڑ کی جس رُت کا شکار ہے اور قومی آزادی وخود مختاری جس جاں کنی سے دوچار ہے، کسی پاکستانی کو یہ توقع نہیں کہ ہماری ٹیم آزادانہ تحقیقات کے بعد ہر آلائش سے پاک بے لاگ رپورٹ مرتب کر سکے گی۔ یہ بات یقینی دکھائی دے رہی ہے کہ ہماری دورُکنی ٹیم، جرمن پولیس کی مرتب کردہ رپورٹ کی تصدیق مزید کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے گی کہ عامر چیمہ شہید نے واقعی خودکشی کی ہے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ 20 مارچ سے 2 مئی تک حکومت پاکستان نے عامر کے معاملے سے آگاہی، اس کے مقدمے کی پیروی، جیل میں اُس سے روا رکھے جانے والے سلوک اور اُس کی رہائی کے حوالے سے کیا کیا؟ اُسے ڈیڑھ ماہ کا ''روزنامچہ'' قوم کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ بتانا چاہیے کہ برلن میں پاکستانی سفارت خانے کے کون کون سے اہلکاروں نے حکومتِ جرمنی کے کن کن افسران بالا سے رابطے کیے؟ کس کس سے کتنی ملاقاتیں ہوئیں؟ کتنے خطوط ارسال کیے گئے؟ اسلام آباد نے کتنی سرگرمی دکھائی؟ وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے اپنے جرمن ہم منصب یا دوسرے ذمہ داروں سے کتنی بار رابطہ کیا؟ دفتر خارجہ نے کس گرم جوشی کا مظاہرہ کیا؟ اگر 20 مارچ سے 2 مئی تک حکومتِ پاکستان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہی اور اس نے معاملے کی سنگینی کا احساس نہ کیا یا اس خیال سے خاموش ہوگئی کہ کسی ''دہشت گرد'' کے بارے میں زیادہ حساس ہونے کی ضرورت نہیں تو اسے نرم سے نرم الفاظ میں مجرمانہ غفلت ہی کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے شاہان والا تبار کے نزدیک عامر نے کسی ''گھناؤنے جرم'' کا ارتکاب کیا ہو لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان کا شہری تھا۔ اپنے وطن کی مٹی پر اس کے کچھ حقوق ہیں۔ حکومت پاکستان کی آئینی، قانونی اور اخلاقی ذمہ داری تھی کہ وہ اُس کا تحفظ کرتی۔ اُس کے معاملے میں دلچسپی لیتی، اُسے واپس لانے

کی کوشش کرتی اور اس امر کو یقینی بناتی کہ اُس پر تشدد نہ ہو۔ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ سفارت خانوں نے اپنے کسی شہری پر الزام عائد ہونے کی صورت میں اُسے تحویل میں لے لیا اور مقامی حکام سے کہا کہ وہ سفارت خانے آ کر تحقیقات کریں۔ حکومت کے اس طرز تغافل، اس اندازِ بے نیازی اور بے حسی کی حدوں کو، چھوتی ہوئی اس بے اعتنائی کو کیا نام دیا جائے؟

بے چارگی کی اس روش نے ملک کے وقار اور حاکمیت اعلیٰ کو کڑی دھوپ میں پڑی برف کی سل بنا کے رکھ دیا ہے۔ سمندر پار پاکستانیوں کا اعتماد بُری طرح مجروح ہوا ہے۔ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو یہ زبردست گلہ ہے کہ صدر مشرف اور جارج بش کی ذاتی دوستی اُن کے کسی کام نہیں آئی۔ انہیں ناگفتہ بہ حالات کا سامنا ہے۔ ذرا ذرا سی فنی غلطی پر پاکستانی ڈی پورٹ ہو رہے ہیں۔ انہیں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر طیاروں میں لادا جاتا ہے۔ امریکہ جانے والے پاکستانیوں کو سب سے زیادہ توہین آمیز سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ بے چارگی اب ایسی پستیوں کو چھونے لگی ہے کہ جنہیں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

عالم یہ ہے کہ ہر ستم گر کی وکالت بھی ہم نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ باجوڑ پر امریکہ نے حملہ کیا تو ہمیں احتجاج کا حوصلہ نہ ہوا۔ اُلٹا ہم نے خود یہ کہنا شروع کر دیا کہ ''باجوڑ میں غیر ملکی موجود تھے۔'' گویا امریکہ حملہ کرنے میں حق بجانب تھا۔ لندن میں بم دھماکے ہوئے تو الزامات کے پایہ تصدیق تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم اقراری مجرم بن گئے اور دینی مدارس پر تازیانے برسانے لگے۔ ابھی کل کی بات ہے، تمام اخبارات، تمام خبر رساں ایجنسیوں، تمام عینی شاہدوں حتیٰ کہ مقامی انتظامیہ نے بھی تصدیق کی ہے کہ پہاڑوں سے کرومائٹ چنتے فاقہ مستوں پر امریکی گن شپ ہیلی کاپٹرز نے بمباری کی جس سے تین افراد جاں بحق اور متعدد زخمی ہو گئے۔ لیکن آئی ایس پی آر کے ترجمان نے اس امریکی بیان کی تصدیق کر دی کہ ساری کارروائی افغان علاقے میں ہوئی۔ بھارت نے افغانستان میں دہشت گردوں کی درجنوں تربیت گاہیں قائم کر لی ہیں جو وزیرستان سے بلوچستان اور گلگت سے کراچی تک آگ کے شعلوں کو ہوا دے رہی ہیں اور ہم قتل و غارت گری کی ہر واردات ''اسلامی انتہا پسندوں'' کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ کسی کو کچھ پرواہ نہیں کہ کتنے پاکستانی دنیا کے کون کون سے عقوبت خانے میں گل سڑ رہے ہیں۔ گوانتاناموکے پنجروں میں پڑے تین درجن کے لگ بھگ بے گناہ پاکستانیوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ حامد کرزئی کو صدر بنانے کے لیے ووٹوں سے صندوق بھر بھر کر بھیجتے وقت بھی ہم نے یہ گزارش نہ کی کہ ہمارے قیدی چھوڑ دو۔ 1993ء میں اریٹیریا جانے والی تبلیغی جماعت کے 16 ارکان تیرہ برس سے لاپتہ ہیں اور کسی کو اُن کی تلاش سے کوئی دلچسپی نہیں۔

عامر چیمہ شہید کی پاک باز روح جانے کن مشکبو محفلوں کی رونق بن چکی ہے اُس کے ایک اُستاد بزرگ نے دو دن قبل عامر کے والد کو جو خواب سنایا میں پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اُس کے گھر کو جانے والی

گلیاں گلاب کی خوشبو سے مہک رہی ہیں اور اُس کے گھر کے سامنے گل دستوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ اب وہ صرف پروفیسر نذیر چیمہ کا نہیں، پورے پاکستان کا فرزند ہے۔ وہ ہم سب کا بیٹا ہے اور ہمیں اُس کی میت چاہیے۔ ہمیں کسی تحقیق، کسی تفتیش، کسی رپورٹ، کسی اشک شوئی اور کسی دم دلاسے کی ضرورت نہیں۔ اگر حکومت پاکستان میں ذرا سا بھی دم خم باقی ہے تو وہ ''تحقیقات'' کے خرخشوں کے بجائے جرمن حکومت سے کہے کہ بلا تاخیر شہید کی میت ہمارے حوالے کی جائے۔

پاکستان کے لوگ اپنے شہید بیٹے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اُن کے صبر کا امتحان نہ لیا جائے۔ شہید نے اپنے خط میں اس آخری خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ ''میرا جنازہ بڑا ہو۔'' جنت کے جھروکوں سے جھانکتی اُس کی رُوح دیکھ رہی ہے کہ اہل وطن اُس کی خواہش کیوں کر پوری کرتے ہیں؟

[11-05-2006]

# دیکھو تو کون آیا ہے......؟

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اُس کا تابوت کس ہوائی اڈے پر اُترا؟ اُس کی میت کو کس نے کندھا دیا؟ اُس کی قبر کہاں کھدی؟ اُس کی نماز جنازہ کہاں پڑھی گئی؟ اس میں کتنے لوگ شریک ہوئے؟ اُس کی تجہیز و تکفین میں کن عالی مرتبت ہستیوں نے شرکت کی؟ یہ سب کچھ ہم دنیا داروں کے لیے ہے۔ وہ جو پیچھے رہ گئے، وہ جنہیں دل بہلاوؤں کی حاجت رہتی ہے۔ عامر تو نورانی پروں والے فرشتوں کے جلو میں ہفت افلاک سے بہت آگے نکل گیا۔ اسے ان باتوں سے کیا غرض؟

لیکن جو کچھ ہوا، وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شہید کے والدین اور اُس کی بہنوں کو اتنا حق ضرور ملنا چاہیے تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی میت اپنی مرضی کے شہر میں وصول کر سکیں، اپنی خواہش کے مطابق اُس کی نماز جنازہ ادا کر سکیں، اپنی آرزو کے مطابق اُس کی تدفین کر سکیں۔ انہیں پکڑ جکڑ کر مجبور نہیں کر دینا چاہیے تھا کہ وہ حکومتی مصلحتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ دو دن قبل اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت جناب طارق عظیم عامر شہید کے گھر تشریف لے گئے۔ انہوں نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے دو ٹوک اعلان کیا کہ عامر کی تجہیز و تکفین اُس کے والدین کی مرضی و منشا کے مطابق ہو گی۔ اُن کا یہ اعلان جلی سرخیوں کے ساتھ پاکستان بھر کے اخبارات کی زینت بنا لیکن جمعہ کی شام مقامی انتظامیہ اور پولیس نے پروفیسر نذیر چیمہ کے گھر کے آس پاس ڈیرے ڈال دیئے۔ دل گرفتہ اور نڈھال باپ کے اعصاب پر ضربیں لگائی جانے لگیں۔ خوفناک مناظر کی تصویر کشی ہونے لگی۔ ''یہاں توڑ پھوڑ ہو گئی تو کون ذمہ دار ہو گا؟ بم دھماکہ ہو گیا تو بے گناہوں کا لہو کس کی گردن پر ہو گا؟'' پروفیسر چیمہ کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اُس میں کسی سے جرح کرنے، بحث میں اُلجھنے کا یارا نہ تھا۔ گھر کی خواتین کو خبر ہوئی تو ایک کہرام مچ گیا۔ عامر کی زندگی کے کتنے ہی شب و روز راولپنڈی میں گزرے۔ وہ یہیں جوان ہوا، یہیں تعلیم حاصل کی، یہاں کی ہواؤں میں سانس لیتا، یہاں کی گلیوں میں چلتا اور یہاں کی محفلوں میں لو دیتا رہا۔ وہ آخری بار اسی بستی سے زندگی کے آخری سفر کو نکلا اور امر ہو گیا۔ اس حرماں نصیب بستی کی گلیوں، گھروں، دیواروں اور چھتوں کو عامر کے تابوت کے آخری دیدار سے محروم کر دینا دل چھلنی کر دینے والی حرکت تھی۔ اس حرکت کا کوئی جواز نہ تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے عامر کا گھر اور گردو پیش کی گلیاں دُور و نزدیک سے آئے لوگوں سے بھری رہتی تھیں۔ امن و امان کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ حکومت کے خلاف کوئی نعرہ نہ لگا۔ شیخ رشید احمد، طارق عظیم، مولانا فضل الرحمٰن اور قاضی حسین کو یکساں فراخ قلبی سے خوش آمدید کہا گیا۔ گہرے اضطراب

اور شدید غم کے باوجود عامر کے اہل خانہ نے حکومت کی کوتاہیوں کو ہدف تنقید نہ بنایا۔ میت راولپنڈی آجاتی اور لاکھوں لوگ بھی اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو جاتے تو بھی کوئی افتاد نہ ٹوٹتی۔ راولپنڈی کے درودیوار، یہاں کی خاک اور یہاں کے لوگوں سے اُن کا حق چھین لیا گیا۔ یہ ہر اعتبار سے ایک ناروا، ایک دل آزار اور ایک ناپسندیدہ اقدام تھا۔ وہ جو شہید کی میت اور اُس کے چاہنے والوں کی خواہشات کے درمیان دیوار بنے جب اُن کی وردیاں اُتر جائیں گی، جب ان کے کروفر کا سورج غروب ہو جائے گا اور جب انہیں اپنی قبریں قریب آتی دکھائی دینے لگیں گی تو 13 مئی 2006ء کے دن کا دہکتا سورج ہر آن اُن کے سروں پر آگ برساتا رہے گا۔

عامر عبدالرحمٰن شہید، اسلامی جمہوریہ پاکستان نامی ریاست کے اس سلوک کا مستحق نہ تھا۔ اگر وابستگان دربار میں اُس کے تابوت کو کندھا دینے کا حوصلہ نہ تھا، اگر اُن کی روشن خیالی انہیں اُس کے جنازے میں شرکت کی اجازت دینے سے گریزاں تھی، اگر وہ اس کی قبر پر پھول چڑھانے کو ''اعتدال پسندی'' کے تقاضوں کے منافی خیال کرتے تھے، اگر شہنشاہ عالم پناہ کے خوف سے شہید کے لیے تعزیتی پیغام جاری کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا تو بھی وہ اُس کی میت کی آمد اور تجہیز و تکفین کے معاملات کلی طور پر شہید کے والدین اور راولپنڈی کے عوام پر چھوڑ سکتے تھے۔ انہیں مطلوبہ ضمانتیں بھی فراہم کی جا سکتی تھیں۔ شہید کی میت کے تقدس کا پاس ہر ایک کو تھا اور کوئی نہ تھا جو اس موقع پر حکومت کے خلاف غم وغصہ کے لیے استعمال کرتا۔ البتہ اب پاکستان کے طول وعرض سے کسی کے ہاتھ ارباب اختیار کو دعاؤں کے لیے نہیں اُٹھیں گے اور بہت سی پھیلی جھولیاں ان نوکر پیشہ لوگوں کے لیے نہ جانے کیا کیا کچھ مانگ رہی ہوں گی۔

جمعہ کی صبح میں لاہور جانے کے لیے اسلام آباد ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ میرا فون بجا، اُس کی آواز رندھی ہوئی تھی اور اُس کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بولی ''میں عامر چیمہ کی بہن بول رہی ہوں، دیکھئے ہمارے گھر پولیس آ بیٹھی ہے۔ ہمارے والد صاحب کو پریشان کیا جا رہا ہے۔ ہمیں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمارے بھائی کی میت یہاں نہ آنے پائے۔ دیکھیں ہم پچھلے دس دنوں سے اُس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ہم اُسے پنڈی کے قبرستان میں دفنانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو خدا کا ڈر نہیں......'' میں جو کچھ کر سکتا تھا کیا۔ لاہور پہنچ کر بھی رابطے میں رہا لیکن کوئی بڑا لیڈر عامر کے والدین کی مدد کو نہ پہنچا، نہ کوئی رُکن قومی اسمبلی نہ وارثانِ منبر ومحراب، نہ صاحبان جبہ و دستار اور پھر شام گہری ہوتے ہی حرماں نصیب خاندان نے ریاستی رعونت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

ماں چیختی رہ گئی، بہنیں بلکتی رہ گئیں، باپ منت سماجت کرتا رہ گیا لیکن ریاست کو خطرہ تھا۔ سو اُس کی میت لاہور پہنچا دی گئی۔ ائیر پورٹ جانے والے راستوں کی کڑی نگرانی کی گئی۔ میت کو ہیلی کاپٹر میں ڈال کر شہید کے آبائی گاؤں سارو کی پہنچا دیا گیا۔ نماز جنازہ کے وقت کے بارے میں زبردست کنفیوژن پھیلا

دیا گیا۔ اخبارات، ٹی وی چینلز، اشتہارات، ذاتی رابطے سب الگ الگ کہانی سنا رہے تھے۔ والدین نے آخری خواہش کے طور پر چاہا کہ نماز جنازہ چار بجے شام ادا کی جائے لیکن اہل سرکار کو یہ بھی قبول نہ تھا۔ بھری دوپہر کے وقت اُس کی نماز جنازہ پڑھا دی گئی لیکن اُس وقت اور اُس حال میں بھی انسانوں کے ایک سمندر نے اسے الوداع کہا۔ سمندر کی لہریں ساروکی جانے والے راستوں پر رات گئے تک متلاطم دریاؤں کا منظر پیش کرتی رہیں۔

غازی علم الدین شہید کو جب 31 نومبر 1929ء کو پھانسی دی گئی تو انگریز سامراج کے کارندوں نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ انہیں بھی ڈر تھا کہ شہید کے ورثا اور عوام کی مرضی کے مطابق تجہیز و تکفین ہوئی تو قیامت آ جائے گی۔ عوام تڑپتے رہ گئے اور شہید کو میانوالی جیل کے احاطے میں قبر کھود کر دفن کر دیا گیا۔ اس پر عوام سراپا احتجاج ہو گئے اور ملک بھر میں مظاہرے پھوٹ پڑے۔ تب علامہ اقبال کی سربراہی میں اکابرین کا ایک وفد گورنر سے ملا۔ تیرھویں دن میت کو میانوالی جیل کے احاطے سے نکال کر لاہور لایا گیا جہاں ان کی تدفین ہوئی۔ لیکن آج تو کوئی علامہ اقبال بھی نہیں۔ ہوتا بھی تو وہ آج کے سامراج کو کیسے سمجھاتا؟

عامر شہید کے نیک دل اور پاک باز استاد کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور وہ تھم تھم کر رُک رُک کر پروفیسر نذیر چیمہ کو اپنا خواب سنا رہے تھے۔ ''میں نے خواب میں ایک بڑا ہی مقدس اور پاکیزہ اجتماع دیکھا۔ ہر سو نور کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ صحابہ کرامؓ تشریف فرما ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضورﷺ بھی قریب ہی ہیں۔ لیکن آپﷺ کا رُخ انور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر حضورﷺ کی مشکبو آواز سنائی دی، 'عامر آ رہا ہے۔' صحابہ کبارؓ کھڑے ہو گئے اور ایک خاص سمت دیکھنے لگے۔ پھر رحمت دو عالمﷺ نے بلند آواز میں پکارا 'حسنؓ حسینؓ دیکھو کون آیا ہے۔' میں اُسے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں اس کا خیال رکھنا۔''

تم اس کا تابوت ساروکی لے جاؤ یا اس سے بھی دُور کی کسی بستی پہنچا دو، اس کے جسد خاکی کو کسی شاداب زمین کے حوالے کر دو یا چولستان کے ریگ زاروں کی سلگتی ریت کے سپرد کر دو، اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا اُسے تو سرکار دو جہاںﷺ نے جوانان جنت کے سرداروں کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن تمہارا نام اُن میں لکھ دیا گیا جو خسارے میں رہتے ہیں اور میرا دل تو اس خسارے کا تصور کرتے ہوئے بھی لرز جاتا ہے۔

[14-05-2006]

---

# امانت بلا رہی ہے!

عامر شہید کی دعائے قُل میں شرکت کے لیے سارو کی جاتے ہوئے میں عجیب و غریب سی سوچوں میں کھویا رہا۔ زندگی کتنی کشش رکھتی ہے۔ انسان اس کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتا، کیسے کیسے جتن کرتا، کن کن امتحانوں سے دوچار ہوتا، کیسی کیسی فصیلوں پر کمندیں ڈالنے کی کوشش کرتا اور کن کن سنگلاخ چٹانوں سے جوئے شیر بہالانے کی سبیلیں تراشتا ہے۔ ہر آن اُس کے سر پر ایک دُھن سی سوار رہتی ہے۔ کوئی مجھ سے آگے نہ نکل جائے، کوئی مجھ پہ بازی نہ لے جائے، کسی کا قد مجھ سے بالا نہ ہو جائے، کوئی مجھ سے زیادہ نامور نہ ہونے پائے۔ اُونچی مسند اور بلند منصب پانے کے لیے ہم کیسی کیسی معرکہ آرائیاں کرتے، کیسے کیسے ارفع نظریات کی بولی لگاتے، کیسے کیسے اُصولوں کو منڈی کا مال بناتے، کیسی کیسی اخلاقی اقدار کو کوڑیوں کے مول لٹاتے اور کیسے کیسے سنگِ آستاں کو اپنی سجدہ گاہ بناتے ہیں۔ اختیار اور اقتدار پر قابض رہنے کے لیے ذہن و فکر کی کیسی کیسی توانائیوں کو مہمیز کرتے، کیسے کیسے جادوگروں کو جاگیریں عطا کرتے اور کیسے کیسے بازی گروں کے کرتبوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کوئی اچھی سی نوکری، کوئی بڑا سا گھر، ایک نئی نویلی گاڑی، آسائشیں، آرائشیں، اسباب، اثاثے، جائیدادیں، پلاٹ، پلازے، کارخانے، فیکٹریاں، کاروبار، نگر نگر کے تفریحی دورے، دولت، شہرت، نام، مقام، کیسے کیسے سراب ہیں کہ ہم مسلسل ان کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ نیلے آسمانوں کے اُوپر عرشِ معلیٰ پر بیٹھی ہستی ہماری اس سیماب پائی اور اضطراب پہ مسکراتی رہتی ہے۔ پھر اچانک ایک نامطلوب گھڑی سر پر آن کھڑی ہوتی ہے۔ کہیں دُور رُخصتی کا ناقوس بجتا ہے۔ جاہ و جلال، کروفر، تخت و تاج، خدام ادب، نیزہ بردار، چوب دار، شاہی طبیب سب ہار جاتے ہیں۔ رگوں میں رواں لہو سرد پڑنے لگتا ہے، زمانے بھر کو اپنی مٹھی میں لینے والی اُنگلیاں بے جان سی ہونے لگتی ہیں، نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں اور پھر سارا تماشا ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی تاجدار زمانہ ہو، شہنشاہ عالم ہو، فاتح جہاں ہو، فقیر راہ نشیں ہو، مفسر ہو، فقیہہ، محدث اور قطب زماں ہو سب کو ایک نہ ایک دن رخت سفر باندھنا پڑتا ہے اور جب بنجارہ لاد چلتا ہے تو سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن عامر شہید چیمہ جیسی موت کتنوں کو نصیب ہوتی ہے؟ سارو کی سے ذرا پہلے میں جسٹس (ر) افتخار چیمہ کے گھر گیا جہاں سابق صدر رفیق تارڑ بھی تشریف فرما تھے۔ شہید کے جنازے کا منظر موضوع گفتگو تھا۔ اتنا بڑا اجتماع سارو کی کی فضاؤں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لوگ ننگے پاؤں دہکتی زمین پر دوڑے چلے آرہے تھے۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی لیکن عشق کی سرمستیوں نے

انہیں اپنے آپ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ گر رہے تھے، بے ہوش ہو رہے تھے، پسینے میں شرابور تھے، پیاس سے اُن کے ہونٹ چٹخنے لگے تھے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کے نمائندے جنوں کی کرشمہ سامانیاں دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے کہ یہ لوگ کس سیارے کی مخلوق ہیں۔ بی بی سی کا نمائندہ بار بار منرل واٹر کی بوتل سے منہ لگا رہا تھا۔ بار بار پسینے سے تر چہرہ پونچھ رہا تھا۔ اُس نے مائیک جسٹس (ر) افتخار چیمہ کے سامنے کیا تو وہ بولے ''تم لوگ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تمہارے پاس یہ تصور ہی نہیں کہ مسلمان رسول اکرم ﷺ سے کیسی محبت کرتے ہیں۔ ہمارے لیے اپنی جانیں، اپنے مال، اپنی اولادیں ناموس رسالت ﷺ کے سامنے ہیچ ہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ عامر چیمہ سے لوگوں کی اس بے پایاں محبت کی وجہ کیا ہے۔'' بے شک انہیں اندازہ نہیں لیکن کیا انہیں اندازہ ہے جنہوں نے شہید کی میت کی بے حرمتی کی، اُس کے والدین کی خواہشات کی نفی کی اور اُس کی بہنوں کی آرزوؤں کا خون کیا؟ پورے خاندان کو یرغمالیوں کے انداز میں سارو کی پہنچایا گیا اور جبراً نماز جنازہ پڑھانے پر مجبور کر دیا گیا؟

دعائے قل سے فراغت اور پروفیسر نذیر چیمہ سے مل کر میں نے رُخصت چاہی لیکن شہید کے قریبی اعزہ مجھے گھر لے گئے۔ شہید کی ماں، شہید کی بہنیں، برلن میں شہید کی میزبان ماموں زاد بہنیں، گھر کی دوسری خواتین اور قریبی اعزہ میرے پاس آ بیٹھے۔ عامر کی مشکبو باتیں ہونے لگیں۔ ماں نے کہا ''وہ بہت ہی نیک بچہ تھا۔ جب کبھی بھی توہین رسالت ﷺ کے بارے میں کوئی خبر چھپتی، وہ بہت بے کل ہو جایا کرتا تھا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ وہ اکثر غازی علم دین شہید کا ذکر کیا کرتا تھا جیسے وہ اُس کی پسندیدہ شخصیت ہو۔ پچھلے رمضان میں وہ آیا تو سترھویں اٹھارھویں روزے والے دن ہی واپس جرمنی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میں نے کہا ''بیٹا عید تو کر کے جاؤ۔'' وہ کہنے لگا کہ ''میری حاضریاں کم ہو جائیں گی اور امی! آپ کی اصل عید تو اُس دن ہو گی نا جس دن میں اپنی تعلیم مکمل کر کے اور ڈگری لے کے واپس آؤں گا۔'' مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اتنی بڑی عید بن کر آئے گا۔

برلن میں اُس کی میزبان ماموں زاد نے بتایا ''ہمیں بالکل بھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ اس طرح کا کوئی پروگرام بنا رہا ہے۔ ہاں اُس میں ہم نے بعض تبدیلیاں نوٹ کی تھیں۔ نماز وہ پہلے بھی پڑھتا تھا لیکن اتنے اہتمام سے نہیں۔ بعض اوقات چھوٹ بھی جاتی تھی لیکن اس مرتبہ وہ نماز کی سخت پابندی کر رہا تھا۔ اتنی کہ کھانا لگا ہوتا تو وہ کہتا۔ باجی نماز کا وقت ہو گیا ہے پہلے نماز پڑھ لوں۔ جمعہ کے روز علاقے کے مسلمانوں نے گستاخی کرنے والے اخبار کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا لیکن عامر اس میں شریک نہیں ہوا۔ وہ مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے چلا گیا اور کافی وقت لائبریری میں گزارا۔ شام کو وہ میرے شوہر سے بڑے تجسس کے ساتھ پوچھتا رہا۔ 'مظاہرہ کیسا تھا، کتنے لوگ تھے، اس کا کوئی اثر ہو گا'۔ میں میاں سے کہتی تھی کہ 'عامر کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے لیکن ہمیں کوئی وہم و گمان تک نہ تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے'؟'' عامر کی بہنیں شدید

اضطراب اور غصے میں تھیں۔ انہیں حکومت سے اس رویے کی توقع نہ تھی ''ہمیں قیدیوں کی طرح یہاں لا پھینکا گیا۔ کچھ بھی ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہونے دیا گیا۔ ہم سے بھی اور پورے پاکستان کے لوگوں سے بھی دھوکا کیا گیا۔''

والدہ نے بتایا ''عامر کا خط ملنے کے بعد ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس کی وصیت کے مطابق ہم اُسے راولپنڈی کے بڑے قبرستان میں دفنائیں گے لیکن حکومت نے ایسا نہ ہونے دیا۔ ہم نے عامر کو امانتاً یہاں دفن کیا ہے۔ قوم کو چاہیے کہ وہ میت کو راولپنڈی لے جانے میں ہماری مدد کرے۔''

مرد شریف پروفیسر نذیر چیمہ نے بھی کہا کہ ''میت کو امانتاً یہاں دفن کیا گیا ہے۔'' غازی علم الدین شہید کی کہانی اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ تب علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے قومی عمائدین کے ساتھ مل کر ایک کردار ادا کیا تھا۔ آج سیاست کی دکان چمکانے اور قبر کی مجاوری کرنے والے بڑھ چڑھ کر کرتب دکھا رہے ہیں لیکن شہید کی وصیت اور اُس کے والدین کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی ٹھوس اور سنجیدہ کوشش نہیں ہو رہی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شہید کے والدین سے مشاورت کے ساتھ بلا تاخیر ایک قومی کمیٹی تشکیل دی جائے جو حکومت پنجاب کے عمائدین اور ضروری ہو تو صدر مشرف سے مل کر میت کو راولپنڈی لانے کی کوشش کرے۔ اگر ایسی کمیٹی دس دن پہلے بن جاتی تو عامر کے لواحقین یکہ و تنہا نہ ہوتے اور نہ حکومت من مانی کر سکتی۔

میں نے پروفیسر نذیر، عامر کی والدہ، عامر کی بہنوں اور عامر کے قریبی عزیزوں کو دل گرفتہ پایا کہ بعض مذہبی گروہ عامر کی میت کو یرغمال بنانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لے رہے ہیں۔ انہیں دُکھ تھا کہ پوری پاکستانی قوم کے دلوں میں دھڑکنے والے شہید کو گروہی اور مسلکی رنگ میں رنگ کر محدود اور متنازع بنایا جا رہا ہے۔ مجوزہ کمیٹی اس معاملے کو بھی اپنی تحویل میں لے کر غمزدہ خاندان کو گھیراؤ کی کیفیت سے نکال سکتی ہے۔

ساروکی سے واپس آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیسے کیسے نام آور دنیا سے جاتے ہیں تو ایک آنکھ بھی نم نہیں ہوتی اور کیسے کیسے گم نام، اپنی آخری ہچکی کے ساتھ ہی کبھی نہ غروب ہونے والا آفتاب جہاں تاب بن جاتے اور کروڑوں انسانوں کے دلوں میں خوشبو کی طرح رچ بس جاتے ہیں۔ کیا یہ اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز ہے؟

[16-05-2006]

---

# انتہا پسندی اور روشن خیالی

رمضان المبارک کا اپنا مزاج، اپنا رنگ اور اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ اندر باہر کی دنیا میں اُجالے سے بکھرنے لگتے ہیں، فکر و خیال کے دریچوں میں اُترتی خنک چاندنی عجب لہک مہک سی پیدا کر دیتی ہے۔ گداز دنوں اور لطیف راتوں کی آسودگی بخش ساعتوں میں زندگی کی وہ حقیقتیں آشکار ہونے لگتی ہیں جو ٹیلی ویژن چینلوں، سیمیناروں، مذاکروں، خطبوں، تقریروں، مباحثوں اور مناظروں کی چکا چوند میں حیادار خاتون کی طرح اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے رکھتی ہیں۔

ہم ایسے نانہجار دور میں جی رہے ہیں کہ خیر و شر اور خوب و ناخوب کا امتیاز مٹتا جا رہا ہے۔ ہر صبح امریکہ یا مغرب کا کوئی دل دادہ ہمیں روشن خیالی کی ٹکٹکی پر کس کر انتہا پسندی کے تازیانے برسانے لگتا ہے۔ اس حقیقت ازلی و ابدی کے پرچم بردار نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں کہ مسلمان تو روز اوّل سے روشنی کا پیمبر ہے اور وہ ایک ایسے دین کا پیروکار ہے جو دلوں پہ تنے جالے اُتارتا، ذہنوں پہ لگا زنگ کھرچتا، رُوح کی تمام تر کدورتوں کو مصفّٰی پانیوں سے دھوتا اور باطن کو ساری آلائشوں سے پاک کر کے یوں پاکیزہ و منزہ کر دیتا ہے کہ اس کے اندر انتہا پسندی جیسی کوئی آلودگی سما ہی نہیں سکتی۔

کل یوم فتح مکہ تھا اور سیرت نبوی ﷺ کی ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے فتح مکہ کا باب فضیلت میرے زیر مطالعہ رہا۔ کاش میرے پاس حرف و بیاں کا وہ قرینہ ہوتا کہ میں اپنے قلب و ذہن کی کیفیت بیان کر پاتا۔ کاش کوئی ایسا سائنسی آلہ ایجاد ہو گیا ہوتا کہ میں چودہ صدیاں پیچھے چلا جاتا اور شہنشاہ عالم پناہ کو اپنے قبیلے سمیت بتا سکتا کہ آؤ تمہیں ''انتہا پسندی'' کے کچھ مناظر دکھاؤں۔

دس ہزار مجاہدین پر مشتمل لشکر اسلامی مکہ معظّمہ سے کچھ دُور پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور شدید سردیوں کی رُت۔ حضور ﷺ نے حکم جاری کیا کہ لشکر کے سپاہی بکھر جائیں اور رات کے وقت اجتماعی الاؤ کے بجائے ہر مجاہد اپنے لیے الگ الگ آگ روشن کرے۔ ابوسفیان اور چند سرکردہ قریش جائزہ لینے پہنچے تو ہیبت زدہ رہ گئے۔ حضرت عباسؓ نے جو دو چار دن پہلے ایمان لائے تھے ابوسفیان کی گفتگو سنی تو پہچان لیا۔ اُسے نیک و بد سمجھایا اور اپنے ساتھ خچر پر بٹھا کر حضور ﷺ کے خیمے میں لے آئے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی غضبناک حالت میں پہنچ گئے اور کہا ''یہ دشمنِ اسلام آج میرے قابو میں آیا ہے۔ مجھے اس کے قتل کی اجازت دی جائے۔'' حضور ﷺ نے ملائمت سے فرمایا ''کیوں ابوسفیان تمہیں اب بھی یقین نہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟'' ابوسفیان بولا ''کوئی اور خدا ہوتا تو یقیناً آج

میری مدد کو آتا"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تمہیں اس بات میں کوئی شک ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟" ابوسفیان نے کہا "مجھے اس میں قدرے شک ہے۔" حضرت عباسؓ نے اُسے اسلام قبول کرنے کی باضابطہ دعوت دی اور ابوسفیان نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ قریش اور مسلمانوں کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں میں سے شاید ہی کسی کو گمان ہو کہ ابوسفیان کو بھی معافی مل سکتی ہے۔

20 رمضان کو صبح دم اسلامی لشکر نے مکہ معظّمہ کی طرف مارچ کیا۔ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق حضرت عباسؓ ابوسفیان کو ایک ٹیلے تک لے گئے جہاں سے مختلف دستے شہر میں داخل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ حکمت یہ تھی کہ ابوسفیان قریش مکہ کو بتا سکے کہ اب اُن کے لیے ارادہ مزاحمت لا حاصل ہے۔ حضرت سعد بن عبادہؓ کا دستہ گزرا تو انہوں نے بآواز بلند کہا "آج گھمسان کے معرکے کا دن ہے۔" حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو اس نعرۂ پیکار کو ناپسند فرمایا۔ دستے کی سرداری کا پرچم حضرت سعد بن عبادہؓ سے لے کر اُن کے بیٹے قیس بن سعدؓ کے سپرد کر دیا اور کہا "آج تو کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔" آپ ﷺ کی اُونٹنی شہر میں داخل ہوئی تو فاتح کا سر عجز کے باعث جھکا ہوا تھا، پیشانی اُونٹنی کے کجاوے کو چھو رہی تھی اور زبان پر سورۃ فتح کی آیات مبارکہ جاری تھیں۔

حضرت بلالؓ کو حکم ہوا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیں...... اور پھر مکہ کی گھاٹیاں سرمدی نور میں نہائی ہوئی ایک گونج سے چھلکنے لگیں۔ چند نوجوان ایک طرف کھڑے تھے جو اس نئی پیش رفت سے خوش نہ تھے۔ اُن میں سے ایک نقل اور تمسخر کے انداز میں حضرت بلالؓ کے کلمہ ہائے اذان دہرا رہا تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی حضور ﷺ نے حکم دیا۔ "ان نوجوانوں کو پیش کیا جائے۔" خوف زدہ نوجوان لائے گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا "یہ کون نقل اُتار رہا تھا؟" سب نے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ حضور ﷺ نے اُسے روک کر باقی کو جانے کی اجازت دے دی۔ نوجوان تھر تھر کانپنے لگا۔ آپ ﷺ نے اُسے پاس بلایا اور فرمایا: اذان کہو، نوجوان کو جو کلمات یاد تھے، ڈرتے ڈرتے ادا کیے۔

آپ ﷺ نے دست شفقت نوجوان کی پسینے سے تر پیشانی پر رکھا۔ پھر اُس کے سینے پر ناف تک دست مبارک پھیرتے ہوئے دُعا فرمائی "اللہ تجھے برکت سے نوازے۔" پھر آپ ﷺ نے اسے ایک تھیلی دی جس میں کچھ درہم تھے۔ نوجوان نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ ابومحذورہؓ نامی نوجوان کی آواز نہایت سریلی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا "ابومحذورہؓ آئندہ تم مکہ میں اذان دیا کرو گے۔" اور محذورہؓ مرتے دم تک یہ سعادت سمیٹتا رہا۔

دس ہزار مجاہدین کا لشکر اسلامی جب نبی رحمت ﷺ کی سالاری میں سوئے مکہ روانہ ہوا تو عرج اور طلاب کے درمیان ایک مقام پر حضور ﷺ نے دیکھا کہ ایک کتیا اپنے پلّوں کو لیے بیٹھی ہے۔ آپ ﷺ

نے حضرت جمیل بن سراقہؓ کو بلایا اور کہا ''تم یہاں ان ماں بچوں کے پاس کھڑے ہو جاؤ اور خیال رکھو کہ لشکر کی کوئی سواری اور بار برداری کا کوئی جانور غلطی سے انہیں روند نہ ڈالے۔''

اور وہ جن کی تاریخ ظلم و شقاوت میں لتھڑی ہوئی ہے، جن کے بموں اور میزائلوں کی ہلاکت آفرینی کروڑوں بے گناہوں کا لہو پی چکی ہے، جن کے نزدیک انسان کی قیمت حشرات الارض جتنی بھی نہیں اور جو تین سالوں کے دوران 6 لاکھ 55 ہزار عراقیوں کا لہو پی چکے ہیں ہمیں درسِ روشن خیالی اور پیام انسانیت دے رہے ہیں۔ اس کے حاشیہ بردار ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ انتہا پسندی ترک کر دو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے علماء، ہمارے دانشور، ہمارے اہل قلم، ہمارے صحافی اور ہمارے صاحبانِ علم بھی خوف زدہ اور مرعوب ہیں۔ شاید وہ بھی یہ باور کرنے لگے ہیں کہ مغرب روشنی کا سرچشمہ ہے اور انتہا پسندی و دہشت گردی کی تاریکیاں گنبدوں اور میناروں والی بستیوں سے پھوٹتی ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اسلام اور مغرب کی تاریخ کو ساتھ ساتھ رکھ کر جھوٹ کے مبلغین سے پوچھا جائے کہ تم کس منہ سے اپنے آپ کو روشن خیال اور انسان دوست قرار دیتے اور ہمیں انتہا پسندی و دہشت گردی کا طعنہ دیتے ہو؟

نبی رحمت ﷺ نے قریش سے پوچھا ''جانتے ہو میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟''

لرزہ براندام سرداران قریش نے کہا ''تُو شریف بھائی ہے اور ایک شریف بھائی کا بیٹا ہے''
حضور ﷺ نے فرمایا ''تم پر آج کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

یہ دعوتِ اسلام کے ابتدائی دنوں کا ذکر ہے جب ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔ ایک دن حضور ﷺ کا جی چاہا کہ خانہ کعبہ کے اندر جا کر رب کعبہ سے دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ کعبہ کے چابی بردار عثمان بن طلحہ کے پاس گئے اور تھوڑی دیر کے لیے کعبہ کی چابی مانگی۔ عثمان نے نخوت بھرے انداز میں انکار کر دیا۔ حضور ﷺ نے بڑے ملائم انداز میں کہا ''عثمان! ایک دن آئے گا کہ یہ چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور میں جسے چاہوں گا عطا کر دوں گا۔'' عثمان نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا ''شاید یہ وہ دن ہوگا جب قریش کے سارے افراد مر چکے ہوں گے۔'' حضور ﷺ گویا ہوئے ''نہیں عثمان! وہ تو قریش کی سچی عزت کا دن ہوگا۔''

اور یہ قریش کی سچی عزت کا دن تھا۔ مجمع حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور حضور ﷺ کی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں پھر آپ ﷺ نے پوچھا ''عثمان بن طلحہ کہاں ہے؟'' خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتے ایک بوڑھے کو پیش کیا گیا۔ اُس کا چہرہ فق تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''عثمان وہ دن یاد ہے؟'' عثمان بن طلحہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ بولا ''ایک ایک بات یاد ہے۔'' خانہ کعبہ کی چابیاں حضور ﷺ کے ہاتھ میں تھیں۔ حضرت علیؓ سمیت معتبر صحابہؓ ان چابیوں کا تقاضا کر چکے تھے۔ حضور ﷺ نے عثمان کو قریب بلایا، چابیاں اس کے داہنے ہاتھ پر رکھیں اور فرمایا ''جاؤ! یہ چابیاں ہمیشہ تمہارے پاس رہیں گی۔'' یہ اعزازِ بلند آج بھی

عثمان بن طلحہ کی اولاد کے پاس ہے۔

اور رعونت، نخوت، تکبر، خوں آشامی، غارت گری، درندگی اور سفا کی کے سفیر کہتے ہیں ''ہم روشن خیال ہیں اور تم انتہا پسند ہو۔''

[17-10-2006]

# اور اب کعبہ کی بیٹیاں!

مسجد سیّدنا امیر حمزہؓ گرا دی گئی۔ اس سے منسلک مدرسہ بھی منہدم ہوگیا۔ درجنوں اور مساجد اگلے چند دنوں میں گرائی جانے والی ہیں۔ روشن خیالی کی سیاہ گنبدوں اور میناروں سے کھیل رہی ہے اور کعبہ کی بیٹیاں گم صم کھڑی ہیں کہ نہ جانے اُن پہ کیا گزرنے والی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان پر یہ کیسا وقت آن پڑا ہے کہ کعبہ کی بیٹی کو مسمار کرنا پنواڑی کے کھوکھے کو گرانے سے بھی زیادہ آسان ہوگیا ہے؟

تسلیم کہ نائن الیون کے بعد دنیا تبدیل ہوگئی ہے۔ لیکن کیا یہ دنیا صرف ہمارے لیے ہی تبدیل ہوئی ہے؟ بجا کہ امریکہ اپنے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہونے والوں کو بم مار مار کر پتھر کے زمانے میں دھکیل دیتا ہے لیکن کیا اُس نے یہ قوت و صلاحیت ہمارے لیے حاصل کی ہے؟ دنیا بھر کے دوسو ممالک میں سے کسی ایک کا نام لیجئے جو امریکہ کے خوف یا اُس کی خوشنودی کے لیے اپنی عبادت گاہیں ادھیڑ رہا ہو، اپنی مذہبی و تہذیبی علامتوں پہ کدالیں چلا رہا ہو اور اپنے مذہبی پیشواؤں کی پگڑیاں اُچھال رہا ہو؟

اگر امریکہ نامی عفریت سارے عالم کے لیے خطرہ ہے تو پھر صرف ہم پر ہی کیوں کپکپی طاری ہے؟ صرف ہمارے ہی ہاتھ پاؤں کیوں پھولے ہوئے ہیں؟ نام نہاد روشن خیالی کی بجلیاں صرف ہمارے کھیتوں، کھلیانوں کو ہی کیوں راکھ کر رہی ہیں؟ تھوڑی دیر کے لیے بھول جایئے کہ امریکی کروسیڈ کا دست و بازو بننے سے ہمیں کیسے کیسے چرکے لگے۔ ہماری خارجہ پالیسی پر کیا بیتی؟ قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشنز سے کس طرح کے مسائل جنم لے رہے ہیں؟ مغربی سرحد پر اَسی ہزار فوج کی تعیناتی سے کس طرح کی پیچیدگیاں جنم لے رہی ہیں؟ ڈمہ ڈولہ، باجوڑ اور رمہ زولہ جیسے واقعات محبّ وطن قبائلیوں کے قلب و ذہن پر کتنے گہرے زخم لگا رہے ہیں؟ افغانستان میں دفاعی گہرائی کی حکمت عملی پر کیا گزر رہی ہے؟ ایک دوست ملک دیکھتے ہی دیکھتے کس طرح نرغۂ دشمناں میں چلا گیا ہے؟ قومی اعزاز و افتخار کی تابندہ علامت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو کس طرح ایٹمی سمگلروں کا سرغنہ بنا دیا گیا ہے؟ کل تک ہم جس بھارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے تھے، آج کس طرح اُسے اپنے اعصاب پر سوار کرلیا ہے؟ کس طرح کشمیر کاز کو سی بی ایم ز کے کوڑا دان میں پھینک دیا گیا ہے؟ ملکی آزادی و خودمختاری کیسی جنس بے مایہ بنا دی گئی ہے؟ ہماری حاکمیت اعلیٰ پر کیسی کیسی ضربیں لگ رہی ہیں اور سرزمین پاک کو کس طرح کے وحشی ڈھور ڈنگروں کی چراگاہ بنا دیا گیا ہے؟

بھول جایئے یہ سب کچھ اور صرف ایک نکتے پر غور کیجئے کہ ہم اسلام کی درخشاں علامتوں، مدرسہ و

مسجد کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں؟ سوا چودہ سو سال سے مسجدوں کو آباد رکھنے اور قرآن و سنت کی تعلیم دینے والے علماء کے ساتھ کیا رویہ اپنا رکھا ہے؟ دینی مدارس کو کس طرح نشانے پہ دھر لیا ہے؟ اُن کی رگِ جاں دبوچنے کے لیے اُن کی مالی اعانت کتنی مشکل بنا دی ہے؟ انہیں کیسی کیسی قدغنوں اور پابندیوں میں جکڑا جا رہا ہے؟ اُن کے نصاب میں کیسی جدت طرازیوں کی پیوند کاریاں کی جا رہی ہیں؟ انہیں کس طرح سب سے نامطلوب ٹھکانے بنا دیا گیا ہے؟

پہلے جمعۃ المبارک کی تقاریر کے لیے لاؤڈ سپیکر کا استعمال ممنوع قرار پایا۔ اب خطبات کی ضابطہ بندی کے منصوبے بن رہے ہیں۔ انتظامیہ علماء کو طلب کر کے حکم صادر کر رہی ہے کہ وہ مخالفانہ تقریروں سے باز آ جائیں۔ احتجاجی مظاہروں میں جانا اور تقریریں کرنا چھوڑ دیں۔ تمام مساجد و مدارس کو ''اوقاف'' کے نظم میں لانے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مسجد کی رُوحِ متحرکہ ضبط کر کے اُسے دوسرے مذاہب کی سی رسمی عبادت گاہ بنا دیا جائے۔ اذانیں گونجتی رہیں لیکن رُوحِ بلالیؓ جنم نہ لینے پائے۔ نمازیں پڑھی جاتی رہیں لیکن جبینیں اُس سجدے سے عاری رہیں جو ہزار سجدے سے نجات دلا دیتا ہے۔ قرآن پاک کی آیاتِ مقدسہ کی تلاوت ہو بھی تو اُن کی تشریح و تفسیر نہ ہونے پائے؟ اور اب تو سیل بلا یہاں تک آن پہنچا ہے کہ مسجد و مدرسہ کو راکھ کر کے روشن خیالی کی چشم غزالیں کا کاجل بنایا جانے لگا ہے۔ آخر مساجد اور دینی مدارس ہی عتاب کا نشانہ کیوں ہیں؟ کیا بھانت بھانت کے سفارت خانوں کے قائم کردہ سکولوں اور مختلف بین الاقوامی یونیورسٹیوں سے ملحق تعلیمی اداروں کے بارے میں کسی کو خبر ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ کوئی جانتا ہے کہ اُن کے نصاب کا نقشہ کیا ہے اور اُن کی کتابیں کس طرح کی خرافات سے بھری ہیں؟ کسی کو اندازہ ہے کہ حیا باختہ این جی اوز پاکستان میں کس کلچر کے بیج بو رہی ہیں؟ کسی کو پرواہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کس طرح کی فحاشی و عریانی کو فروغ دے رہے ہیں؟

پورا پاکستان تجاوزات سے اٹا پڑا ہے۔ کوئی شہر، کوئی قصبہ، کوئی بازار، کوئی محلّہ، کوئی گلی غیر قانونی تعمیرات سے خالی نہیں۔ ریلوے کی 80 فیصد سے زائد زمین قبضہ گروپوں کے تسلّط میں ہے اور وہاں باقاعدہ کالونیاں، کلب اور دفاتر تعمیر ہو گئے ہیں۔ اسلام آباد جیسے شہر کے ماسٹر پلان کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ ہر سیکٹر کے گرین ایریاز میں سرکاری ڈھانچے کھڑے ہیں۔ تمام رہائشی علاقے کمرشل مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، ملک بھر کے بااثر لوگوں نے قواعد و ضوابط کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے کئی کئی منزلہ پلازے کھڑے کر لیے ہیں۔ یہ سب کچھ متعلقہ حکومتی اداروں کی ملی بھگت سے ہو رہا ہے۔ جن کے چھوٹے چھوٹے اہلکار کروڑ پتی بن گئے ہیں لیکن سرکار کو ان میں سے کسی کی فکر نہیں۔ اس کی ساری توجہ مساجد اور مدارس پر مرکوز ہے جنہیں ''تجاوزات'' قرار دے کر زمین بوس کرنا بالاترین ترجیح بن گئی ہے۔

اسلام آباد کی انتظامیہ نے مسجدیں گرانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ جامع مسجد ضیاء الحق، جامع مسجد

شکرال، جامع مسجد منگرال ٹاؤن، جامع مسجد راول چوک، مسجد شہدا، جامع مسجد مدنی، جامعہ حفصہؓ اور جامعہ فریدیہ کو گرانے کے لیے نوٹس جاری کر دیئے گئے ہیں۔ یہ تمام مساجد اور مدارس سال ہا سال سے قائم ہیں۔ اسلام آباد کی لال مسجد ایک مدت سے روشن خیالی کے دل کا کانٹا بنی ہوئی ہے۔ اس کے خطیب مولانا عبدالعزیز اور اُن کے برادر اصغر مولانا عبدالرشید غازی، ''قبیلۂ دہشت گرداں'' میں شمار ہوتے ہیں۔ جامعہ حفصہؓ کی زمین مدرسے کی خرید کردہ ہے جہاں گزشتہ پندرہ سال سے تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ آج کل یہاں تین ہزار طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ جامعہ فریدیہ گزشتہ 38 برس سے اِسی جگہ قائم ہے جس میں چار ہزار طلبا پڑھ رہے ہیں۔ لیکن مولانا عبداللہ شہید کے فرزندوں کی حق گوئی و بے باکی اُن کا ناقابل معافی گناہ بن گئی ہے۔

راولپنڈی اسلام آباد کے تین سو علماء نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ روشن خیالی کے لشکر کا مقابلہ کریں گے۔ قاری سعید الرحمٰن، قاضی عبدالرشید، مولانا عبدالمالک اور مولانا ظہور احمد علوی نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بدھ کو ایک بڑے مظاہرے کا اعلان کیا ہے۔ کیا وہ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا ہے جب یہ طے پائے گا کہ پاکستان کو کس طرح کا ملک بننا ہے؟

میں تو اس سوچ میں غلطاں ہوں کہ کیا نائن الیون کے بعد صرف اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دنیا بدلی ہے؟ کیا امریکہ سے ڈرنے اور روشن خیالی کو ''تقاضائے ایمان'' بنا لینے کے معنی یہ ہیں کہ مولوی کو تہمت، مجاہد کو دشنام اور دین محمدﷺ کے پرچم برداروں کو الزام بنا دیا جائے؟ کیا یہ غارت گر لشکر اب گنبدوں اور محرابوں کے بھی درپے ہو جائیں گے؟ کیا اب کعبہ کی بیٹیوں کا وجود بھی ناقابل برداشت ہو چلا ہے؟

[21-01-2007]

# مسجد و مدرسہ کو میدان جنگ نہ بنائیں!

آگ بھڑکانے کے لیے ایک چنگاری ہی کافی ہوتی ہے لیکن الاؤ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے منوں ٹنوں پانی بھی ناکافی ٹھہرتا ہے۔ فراست کا یہ نکتہ ایک عام آدمی بھی بھلا دے تو وہ عمر بھر پلکوں سے کانٹے چنتا رہتا ہے لیکن جب ریاستوں کے پاسبان اور حکومتوں کے نگہبان بھی حکمت، تدبر، مصلحت، تحمل، برداشت اور افہام و تفہیم کو بالائے طاق رکھ کر طاقت کو ہی ہر جادونگری کا دروازہ کھولنے والا اسم اعظم سمجھنے لگیں تو قومی معاملات و مسائل میں ایسی پکی گرہیں پڑ جاتی ہیں جو دانتوں سے بھی نہیں کھلتیں۔ پاکستان تو حکمت و دانش سے محرومی اور بے مہار قوت آزمائی کی بہت بھاری قیمت ادا کر چکا ہے۔ حیرت ہے کہ تصادم، محاذ آرائی اور پیکار کا چلن آج بھی جاری ہے۔ ریاستی قوت کو اب بھی سب سے کارگر اور نتیجہ خیز ہتھیار خیال کیا جاتا ہے۔ معاملات چھوٹے ہوں یا بڑے تدبیر کی سوئی کے ذریعے بخیہ گری کرنے کے بجائے ''یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک'' کو حکمت اولیٰ سمجھ لیا گیا ہے۔

اسلام آباد کی مساجد اور مدارس کو منہدم کرنے کا معاملہ بھی اسی بے حکمتی نے بُری طرح اُلجھا دیا ہے۔ احکامات جاری کرنے والے اداروں اور افسران کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ نائن الیون کے بعد سے امریکی کروسیڈ کی اطاعت نے کس طرح کی فضا بنا رکھی ہے؟ روشن خیالی کی ترویج لوگوں کے رُوح و قلب پر کس نوع کے چرکے لگا رہی ہے؟ دینی و تہذیبی اقدار کے خلاف حکومتی اقدامات نے حساسیت کا درجۂ حرارت کس قدر بڑھا دیا ہے اور دینی مدارس کے خلاف انضباطی کارروائیاں کسی طرح کی بدگمانیوں کو ہوا دے رہی ہیں؟ ان حالات میں ایسی مساجد اور ایسے مدارس کو منہدم کرنے کی مہم جو برس ہا برس سے قائم ہیں اور جن کی وجہ سے کبھی سکیورٹی کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ قطعی طور پر ناقابل فہم ہے۔ انہیں ''تجاوزات'' یا ''ناجائز'' تعمیرات، قرار دے کر مسمار کرنا بھی قرین انصاف نہیں کیوں کہ پورا ملک ایسے تجاوزات اور ایسی تعمیرات سے بھرا پڑا ہے۔ حکومتی اداروں اور ذمہ داروں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ مسجدیں گرانے اور مدارس کو نوٹس جاری کرنے کا ردِّعمل کیا ہوگا اور عوام الناس اس مہم کو کس تناظر میں دیکھیں گے۔ اگر کوئی اقدام ناگزیر محسوس کیا جا رہا تھا تو بھی دانش کا تقاضا یہی تھا کہ تمام متعلقین کو اعتماد میں لیا جاتا۔ علمائے کرام سے بات کی جاتی۔ اپنے مؤقف کی صداقت کو منوایا جاتا۔ متبادل تجاویز دی جاتیں۔ علماء کے نقطۂ نظر کو تحمل سے سنا جاتا۔ افہام و تفہیم کا ایسا ماحول بنایا جاتا جہاں بات سننے، اس پر غور کرنے اور اپنے مؤقف میں ترمیم کرنے کی گنجائشیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں نہ کیا گیا اور یک طرفہ طاقت

آزمائی کو ہی کیوں کارگر نسخہ جانا گیا، اس کی حکمت شاید اہل حکومت کے پاس ہو لیکن ملک کا کوئی سنجیدہ طبقہ اس مشق کی تائید نہیں کر سکتا۔

مسجد امیر حمزہؓ کے انہدام کے بعد علمائے کرام نے شدید ردِّعمل کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی لال مسجد سے منسلک طالبات کے مدرسہ، جامعہ حفصہؓ اور جامعہ فریدیہ کو گرانے کے لیے بھی نوٹس جاری کر دیئے گئے۔ طالبات نے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہوئے قریبی چلڈرن لائبریری پر قبضہ کر لیا۔ اُن کا مطالبہ ہے کہ منہدم شدہ مساجد تعمیر کی جائیں، انہدام کے نوٹس واپس لیے جائیں اور یہ مہم ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے۔ اُن کے مطالبات میں کئی اور نکات بھی شامل ہیں لیکن عمومی قیاس یہی ہے کہ فوری نوعیت کے مطالبات نے ہی انہیں اس اقدام پر مجبور کیا ہے۔ اُدھر انتظامیہ نے زبردست خوف و ہراس کی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اور یوں لگ رہا ہے جیسے اسلام آباد کے عین قلب میں ایک اور ''کولہو'' آپریشن کروٹیں لے رہا ہے۔

اس کشیدہ بلکہ آتشیں ماحول میں علمائے کرام اور وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ کے درمیان ملاقات ایک اچھی پیش رفت ہے۔ علماء کے وفد نے وفاق المدارس کے صدر اور معروف عالم دین قاری سعید الرحمٰن کی قیادت میں وزیر داخلہ کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ اس وفد میں وفاق المدارس کے جنرل سیکرٹری مولانا قاضی عبدالرشید، مولانا نذیر فاروقی، مولانا ظہور علوی اور مولانا محمد شریف ہزاروی کے علاوہ کئی دیگر علمائے کرام بھی شامل تھے۔ وزیر داخلہ کی معاونت چیف کمشنر اسلام آباد خالد پرویز، آئی جی اسلام آباد چودھری افتخار اور ڈپٹی کمشنر اسلام آباد چودھری محمد علی نے کی۔ ملاقات کے بعد ڈپٹی کمشنر نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ جامع مسجد امیر حمزہؓ کا تشخص برقرار رکھا جائے گا اور حکومت مسجد کی تعمیر نو کے لیے متبادل جگہ فراہم کرے گی۔ وزیر داخلہ نے کہا کہ شہر کا امن و امان بحال رکھا جائے گا اور تمام معاملات افہام و تفہیم کے جذبے کے ساتھ حل کر لیے جائیں گے۔

یہ ملاقات یقیناً حتمی نہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں معاملہ خاصا پیچیدہ ہے اور شاید وفاقی وزیر داخلہ بھی اس کی گتھیاں سلجھانے پر قادر نہیں۔ تاہم وہ چاہیں تو مثبت اور تعمیری کردار ضرور ادا کر سکتے ہیں۔ اور اُس قوت آزمائی کا رُخ موڑ سکتے ہیں جو لال مسجد کے حوالے سے بے حد حساس ہے اور کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں۔ لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز اور اُن کے برادر صغیر مولانا عبدالرشید غازی کو بعض حلقے ''مردان نا مطلوب'' قرار دے چکے ہیں۔ لال مسجد اور اُس سے ملحقہ ادارے اسی لیے مرکز عتاب بنے ہوئے ہیں کہ مولانا عبداللہ شہید کے بیٹے سر بلند زندگی اور آبرو مند موت پر تلے بیٹھے ہیں۔ انہیں اپنے حق پر ہونے کا یقین ہے اور وہ بال برابر رعایت کو بھی پسپائی اور سپر اندازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق وہ علماء کے مفاہمانہ کردار کے بارے میں بھی یکسو نہیں۔ اُن کا جذبہ قابل قدر

ہے۔ یہ جنوں عام ہوتا تو ہمیں ان نامہرباں رُتوں سے سابقہ ہی نہ پڑتا۔ مدرسہ حفصہؓ کی طالبات کے دلوں میں موجزن جذبہ ایمان وحمیت نے بجھی راکھ میں بھی چنگاریاں سی بھر دی ہیں اور مجھے علامہ اقبال کی ایک نظم والی فاطمہ بنت عبداللہ یاد آگئی ہے جو جنگ طرابلس کے زخمی مجاہدوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوگئی تھی اور جسے علامہ نے ''آبروئے اُمت مرحوم'' قرار دیا تھا۔

لیکن آج میں لال مسجد کے عالی مرتبت خطیب مولانا عبدالعزیز اور اُن کے برادر اصغر مولانا عبدالرشید غازی سے دردمندانہ سی اپیل کر رہا ہوں کہ وہ معاملہ ملک کے جید علمائے کرام کے حوالے کر دیں اور انہیں کوئی راستہ نکالنے کی اجازت دے دیں۔ میں جامعہ حفصہؓ کی اپنی بیٹیوں سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اپنا احتجاج بھرپور طریقے سے رجسٹر کرانے کے بعد وہ اپنے ان بزرگوں پر اعتماد کریں جو سرگرم ہو چکے ہیں اور مفاہمت کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ عفت مآب بیٹیوں کا یہ احتجاج تاریخ کا حصہ بن چکا ہے جسے برسوں یاد رکھا جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ حکومتی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاستی جبر اور قوت آزمائی کے لیے مسجد و مدرسہ کا میدان نہ چنے۔ وطن عزیز انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہمارے دشمن تاک لگائے بیٹھے ہیں کہ گوناگوں مسائل میں سلگتا پاکستان کسی نئی طبقاتی خانہ جنگی میں اُلجھ جائے۔ حکومت اور مسجد و مکتب کا تصادم تو ایسی آگ بڑھا دے گا جو سمندروں سے بھی نہ بجھے گی اور یہ الاؤ، بس ایک چنگاری کا منتظر ہے۔

علماء اور اہل سرکار کے درمیان رابطوں اور مذاکرات کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے کہ تصادم سے گریز ہی قوم و ملک کے مفاد میں ہے۔

[02-02-2007]

---

# احتیاط لازم ہے

کیا ہمارا معاشرہ بانجھ ہوتا جا رہا ہے؟ ادارے تو بننے ہی نہ پائے، آئین ہمیشہ جانکنی کے عالم میں رہا، قانون زور آوروں کے گھر کی لونڈی اور انصاف دست درازوں کے ہاتھ کی چھڑی بن کے رہ گیا۔ ایسے میں سوسائٹی کے وہ طبقے بھی غیر فعال ہو کر رہ گئے جو اشتعال کم کرنے، معاملات کو خوش اُسلوبی سے سلجھانے اور جذبات کو نقطہ اُبال تک لے جانے سے روک سکتے تھے۔ نفرت، دُوری اور بیگانگی کی لکیریں گہری ہوتی چلی گئیں۔ تفریق مٹانے والے معتبر لوگ آہستہ آہستہ غیر مؤثر ہوتے چلے گئے اور چنگاریوں کو الاؤ بننے سے پہلے بجھا دینے والی ہوائیں جانے کن جزیروں کو نکل گئیں۔

جامعہ حفصہؓ کا معاملہ اِسی لیے اُلجھتا چلا گیا کہ حکومت کو اپنی زور آوری پہ ناز ہے اور تناؤ کم کرنے والے معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ پا رہے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے ایک سنجیدہ کوشش کی لیکن شاید علمائے کرام کے پاس زیادہ وقت نہ تھا کہ وہ اسلام آباد بیٹھ جاتے اور اُس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک معاملہ سلجھ نہ جاتا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان کی قیادت میں بارہ رُکنی بھاری بھرکم وفد نے 3 فروری کو وفاقی وزیر داخلہ آفتاب احمد خان شیر پاؤ سے ملاقات کی۔ وفد میں قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا حسن جان، مولانا انوارالحق، مولانا ڈاکٹر محمد عادل خان، مولانا قاری سعید الرحمٰن، مولانا قاضی عبدالرشید، مولانا عزیز الرحمٰن، مولانا امداد اللہ، مولانا ظہور احمد علوی، مولانا نذیر فاروقی، مولانا عبدالمجید ہزاروی اور مولانا حبیب الرحمٰن شامل تھے۔ ملاقات میں وفاقی سیکرٹری داخلہ کمال شاہ، آئی جی اسلام آباد، چیف کمشنر اسلام آباد اور ڈپٹی کمشنر اسلام آباد نے بھی شرکت کی۔ یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ جید علمائے کرام کی طرف سے معاملے کو سلجھانے کی سنجیدہ کاوش اور حکومت کے ذمہ داروں کی طرف سے مذاکرات پر آمادگی نے یہ امکان پیدا کر دیا تھا کہ طالبات چلڈرن لائبریری کا قبضہ چھوڑ دیں گی اور حکومت مساجد و مدارس کے خلاف آپریشن کا باب بند کر دے گی۔ تحریری معاہدے میں طے پا گیا کہ شہید کردہ مسجد امیر حمزہؓ کو اُس کی موجودہ جگہ دوبارہ تعمیر کر دیا جائے گا۔ یہ بھی قرار پایا کہ آئندہ مساجد و مدارس کے معاملات کے لیے علمائے کرام، انتظامیہ اور سی ڈی اے کے ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو ان معاملات کو باہمی مشاورت اور اتفاق رائے سے حل کرے گی۔ معاملہ یہیں تک محدود رہتا تو اچھا تھا لیکن نہ معلوم کیوں ان معتبر شخصیات اور نہایت ہی قابل قدر علمائے کرام نے جامعہ کی طالبات کی سرزنش بھی ضروری خیال کی۔ انہوں نے معاہدے کا اختتام اس پیراگراف پر کیا۔ ''جامعہ حفصہؓ اسلام آباد کی

طالبات نے احتجاج کے طور پر لائبریری پر جو قبضہ کیا ہے ہم اسے غلط سمجھتے ہیں۔ احتجاج کا یہ طریقہ ہماری رائے میں شرعاً بھی ناجائز ہے۔ لہٰذا ہم اس کی مذمت کرتے ہیں اور عزیز طالبات کو مخلصانہ طور پر کہتے ہیں کہ وہ لائبریری کو فی الفور خالی کر دیں اور یکسوئی سے اپنی تعلیم میں مشغول رہیں۔ ان طالبات کے سربراہوں سے بھی ہم اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنی بچیوں کو ان کے اس طرزِ عمل سے سختی کے ساتھ روکیں۔''

جب مقصد اولیٰ کسی اُلجھے ہوئے معاملے کو سلجھانا ہو تو قضیئے کے کسی ایک فریق کے بارے میں اس طرح کا لب ولہجہ قرین انصاف نہیں۔ اگر علمائے کرام کے نزدیک لائبریری پر طالبات کے قبضے کی شرعی حیثیت کے بارے میں فتویٰ جاری کرنا اور اس سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر اس کارروائی کی مذمت کرنا ضروری تھا تو انہیں مسجدیں شہید کرنے کے بارے میں شرعی فتویٰ جاری کرنا چاہیے تھا اور مساجد و مدارس کے خلاف شروع کی گئی ناروا حکومتی مہم کی بھی مذمت کرنی چاہیے تھی۔ صرف طالبات کی کارروائی کو خلاف شریعت اور قابل مذمت قرار دے کر انہوں نے رُوحِ مصالحت کو مجروح کیا ہے۔ حکومتی اہلکاروں نے معاہدے کے اِسی حصے کو زیادہ اُچھالا اور اسی کو بنیاد بنا کر وہ طاقت آزمائی کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

گزشتہ روز مجھے جناب اعجاز الحق کا فون آیا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں اُن کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی بعض اہم حکومتی عہدے داروں کے ایما پر مصالحانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ نہ جانے کس گوشے سے انہیں میرے بارے میں کہا گیا کہ اُن کو بھی شریک کریں۔ اعجاز الحق نے اُس روز طالبات سے ہونے والی مفصل ملاقات کی رُوداد سنائی جس کا ماحصل یہ تھا کہ وہ اعجاز صاحب کی طرف سے کوئی تحریری ضمانت چاہتی ہیں۔ اس ضمن میں کوہاٹ سے مسلم لیگ (ن) کے سابق رُکن قومی اسمبلی جناب ابراہیم پراچہ بھی نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ ذرا دیر بعد دس بارہ نامور علمائے کرام بھی تشریف لے آئے۔ طالبات کے مطالبات کی روشنی میں اس خط کا مسودہ تیار کیا گیا جو جناب اعجاز الحق نے انہیں پہنچانا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد جناب اعجاز الحق اور علمائے کرام کے اصرار پر مجھے بھی اُس وفد میں شامل کر لیا گیا۔ میں اپنے اندر اتنی سکت اور صلاحیت نہیں پاتا کہ ایسے اہم حساس معاملے میں کوئی کردار ادا کر سکوں۔ جناب اعجاز الحق کو ٹال دینا مشکل نہ تھا لیکن علمائے کرام کے حکم کے سامنے بے بس تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد طالبات کی ایکشن کمیٹی سے بات ہوئی۔ وہ ہر نوع کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھیں۔ جناب اعجاز الحق کے خط پر بھی انہوں نے تحفظات کا اظہار کیا۔ جناب جاوید ابراہیم پراچہ، علمائے کرام اور اعجاز الحق نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ تصادم اور محاذ آرائی سے معاملات بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ طالبات کی خواہش پر میں نے مختصراً عرض کیا کہ اُن کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے دینی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجاہدانہ عزم کے ساتھ اپنے مطالبات متعلقہ حلقوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ یہ اُن کی بڑی کامیابی ہے کہ حکومت مذاکرات پہ آمادہ ہوگئی ہے اور اُس نے وفاق المدارس العربیہ کے ذمہ

دوران کے ساتھ یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ مسجد حمزہؓ دوبارہ تعمیر کی جائے گی اور آئندہ کسی بھی مسجد یا مدرسہ کے بارے میں کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے علمائے کرام اور انتظامیہ کے عہدے داروں پر مشتمل کمیٹی کو اعتماد میں لیا جائے گا۔ جناب اعجاز الحق نے بھی اپنے خط میں اس ضمانت کی تجدید کی ہے۔ ان حالات میں حکمت و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ طالبات ملک کے جید علمائے کرام اور حکومتی ذمہ داروں کی واضح یقین دہانی کے بعد چلڈرن لائبریری کا قبضہ چھوڑ دیں۔ اگر حکومت معاہدے کا احترام نہیں کرتی اور کسی تازہ مہم جوئی پر تل جاتی ہے تو جذبہ ایمانی اور شوق شہادت کی نمو کے مواقع بھی مل جائیں گے۔ لیکن فی الوقت مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ قوت آزمائی کا ہر جواز ختم کر دیا جائے۔

مجھے خوشی ہے کہ طالبات نے توجہ سے ساری باتیں سنیں۔ آج شام میں لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز اور اُن کے برادر اصغر مولانا عبدالرشید غازی سے ملنے جارہا ہوں۔ میں اُن سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ حرارت ایمانی کے ساتھ ساتھ وہ مومنانہ فراست وحکمت کے دریچے بھی وا رکھیں اور تصادم کو ٹال دیں۔ اور اس مرحلے پر ارباب حکومت سے بھی درخواست ہے کہ وہ مساجد اور مدارس کو ریاستی قوت آزمائی کا ہدف نہ بنائیں۔ امریکی کروسیڈ کی حمایت کو اس درجے تک نہ لے جائیں کہ گلی گلی آتش کدے دہک اُٹھیں۔ کعبہ کی بیٹیوں اور قوم کی بیٹیوں سے پنجہ آزمائی حکومت کو بہت مہنگی پڑے گی۔ اُسے اندازہ نہیں کہ اُس کی ذراسی بے احتیاطی سے کیسی قیامت بھڑک سکتی ہے۔

[08-02-2007]

---

# چنگاری کو بھڑک اُٹھنے سے بچائیں!

جامعہ حفصہؓ کا معاملہ ابھی تک نہیں سلجھ سکا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی چنگاری کس وقت بارود کے ڈھیر کو بھک سے اُڑ دے۔ کسی کو اندازہ نہیں کہ خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو کیا کیا کچھ اس کی لپیٹ میں آجائے گا اور یہ آگ کب تک بھڑکتی یا سلگتی رہے گی۔ حکومت صورت حال کو مجموعی تناظر میں دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ اُس کے حکمت کاروں کو اندازہ نہیں کہ نائن الیون کے بعد سے امریکی کروسیڈ کا دست و بازو بن جانے کی بے حکمت پالیسی نے اہل پاکستان کے دل و دماغ میں کس طرح کی چنگاریاں بو رکھی ہیں۔ معاملہ شہید ہو جانے والی مسجد سیدنا امیر حمزہؓ کا ہے نہ جامعہ حفصہؓ کا، لال مسجد کا ہے نہ جامعہ فریدیہ کا۔ قصہ اُس آب و ہوا کا ہے جو سات سمندر پار کے منطقوں سے آ رہی ہے۔ چھ برس سے دینی مدارس پہ جو کچھ گزر رہی ہے، اُس کے احوال باخبر لوگ ہی جانتے ہیں۔ اب تو مدارس کو مالی امداد دینے والے مخیر" حضرات بھی صف دشمناں میں شمار ہونے لگے ہیں اور انہیں 'القاعدہ' کے تعلق داروں میں گنا جانے لگا ہے۔ مٹی کے دیے، مسلسل تند و تیز آندھیوں کی زد میں ہیں۔ اب تک پندرہ ہزار کے لگ بھگ دینی مدارس کے بیس لاکھ سے زائد طلبا میں سے کوئی ایک بھی ''دہشت گرد'' نہیں پکڑا گیا۔ گرفت میں آنے والے کسی نام نہاد ''دہشت گرد'' کا رشتہ کسی دینی مدرسے کے ساتھ تلاش نہیں کیا جا سکا۔ لیکن حکومت انہیں غیر ہی سمجھتی ہے۔ صدر مشرف بر سبیل تذکرہ انہیں دُنیا کی سب سے بڑی این جی او ضرور کہتے ہیں لیکن ناز نخرے صرف اُنہی این جی اوز کے اُٹھائے جا رہے ہیں جو مغرب کے سرچشموں سے کسب فیض کرتی ہیں اور ''روشن خیالی'' کے فروغ کو دستور العمل بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے ہٹ کر ایک اور المیہ یہ ہے کہ مسلمہ دینی، تہذیبی اور نظریاتی اقدار و روایات کو بھی نیزے کی نوک پر رکھ لیا گیا ہے اور بسنتوں، میراتھن ریسوں اور رقص و سرور کی محفلوں والے حیا باختہ کلچر کو سرکاری پرستی میں فروغ بخشا جا رہا ہے۔

ان حالات میں اسلام آباد کی مساجد اور مدارس کے خلاف کارروائی نے لوگوں کو بجا طور پر تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ مسجد حمزہؓ کا انہدام اور درجنوں دیگر مدارس اور مساجد کو نوٹس کوئی عام سی بات نہ تھی جسے سرسری طور پر نظر انداز کر دیا جاتا۔ لال مسجد تو ایک عرصے سے کھٹک رہی تھی کہ اس کے خطیب مولانا عبدالعزیز کا لب و لہجہ عالی مقام ساعتوں پہ گراں گزرتا تھا۔ برادر اصغر، مولانا عبدالرشید غازی بھی ایک مدت سے نشانے پہ ہیں۔ دونوں بھائیوں پر متعدد مقدمے قائم ہیں۔ ان کے دو مدارس، جامعہ حفصہؓ اور جامعہ فریدیہ کو گرائے جانے کے نوٹس بھی یہی پس منظر رکھتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی تعمیر میں قواعد و ضوابط کی

خلاف ورزی ہوئی ہو، ممکن ہے انہوں نے اپنی حدود سے تجاوز بھی کیا ہو، لیکن یہ آج نہیں ہوا۔ دونوں جامعات نائن الیون کے بہت پہلے سے قائم ہیں اور یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ اسلام آباد میں ایسی درجنوں تعمیرات موجود ہیں جو سی ڈی اے کے قواعد کی نفی کرتے ہوئے بنائی گئی ہیں۔ تجاوزات سے تو پورا ملک بھرا پڑا ہے۔ ایسے میں قانون کا تازیانہ صرف جامعہ حفصہؓ، جامعہ فریدیہ یا چند دیگر مساجد و مدارس پہ برسانا صریح زیادتی ہے۔

چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہؓ کی طالبات کا قبضہ یہی پس منظر رکھتا ہے۔ یہ ایک نوع کا احتجاج ہے۔ بچیاں مطالبہ کر رہی ہیں کہ گرائی گئی مساجد دوبارہ تعمیر کی جائیں، مدارس اور مساجد کو جاری کیے گئے تمام نوٹس واپس لیے جائیں اور ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کسی جز وقتی یا ہنگامی نسخے کے ذریعے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے قومی سطح پر ایک جامع، ہمہ گیر اور مؤثر تحریک کی ضرورت ہے۔ تاہم دیگر مطالبات تسلیم کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہیے۔ وفاق المدارس کے ساتھ مذاکرات کے دوران طے پانے والے معاہدے میں حکومت نے مسجد امیر حمزہؓ اُسی مقام پر تعمیر کرنے کی ہامی بھر لی تھی اور یہ بھی ضمانت دے دی گئی تھی کہ آئندہ مساجد اور مدارس کے بارے میں ہر اقدام، علماء اور سرکاری عہدے داروں پر مشتمل ایک کمیٹی کے متفقہ فیصلے سے ہوگا۔ یہ معاہدہ غالباً جلدی میں تحریر ہوا۔ دو سادہ کاغذات پر شکستہ خط میں لکھے گئے اس مسودے کی کوئی معتبر اور موقر حیثیت نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ جن دو سرکاری عہدے داروں کے دستخط ثبت ہیں، اُن کے نام اور عہدے تک درج نہیں کیے گئے۔ اس کا ایک سقم یہ بھی ہے کہ حکومتی اقدام پر تشویش تک ظاہر نہیں کی گئی جب کہ طالبات کے اقدام کو غیر شرعی اور قابل مذمت قرار دیا گیا ہے۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے سے متعلق رہا ہوں۔ برادرم حامد میر بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید سے تفصیلی ملاقات کے دوران میں اُن کا مؤقف سن چکا ہوں اور اپنا نقطۂ نظر پیش کر چکا ہوں۔ آج بھی جناب اعجاز الحق اور علماء کا ایک وفد میرے ہاں آئے۔ سب کو تشویش ہے کہ صورت حال بگڑ نہ جائے۔ میرے ذاتی خیال میں معاملے کو سلجھانے کے لیے بالاترین سرکاری سطح پر کچھ اقدامات ناگزیر ہیں تاکہ لیپا پوتی کے بجائے قضیئے کا مستقل حل تلاش کر لیا جائے۔

1- حکومت یہ اعلان کر دے کہ اب تک تعمیر ہو جانے والی مساجد اور مدارس کو سند جواز دے دی جائے گی۔ یہ ایک لحاظ سے "عام معافی" کا اعلان ہوگا۔ تاہم منتظمین پر واضح کر دیا جائے کہ اب وہ سختی کے ساتھ اپنی حدوں کے اندر رہیں۔

2- اگر کوئی مسجد یا مدرسہ، سڑک کی توسیع وغیرہ کی زد میں آ رہا ہے تو علماء اور انتظامیہ کی کمیٹی کے ذریعے اس کا حل نکالا جائے۔

3- آئندہ کے لیے واضح کر دیا جائے کہ کسی بھی مسجد یا مدرسہ کی تعمیر کے لیے شہری حکومت کے قواعد و ضوابط کی پابندی کی جائے گی اور تمام اسلامی ممالک میں رائج دستور کے تحت اُس کے نقشے کی منظوری لی جائے گی۔

4- کسی بھی مسجد یا مدرسہ کے خلاف کسی بھی نوع کی کارروائی سے قبل علماء و انتظامیہ کی مجوزہ کمیٹی کو شریک مشورہ کیا جائے گا اور کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

ان حکومتی یقین دہانیوں کے ساتھ ہی لال مسجد کے زعما بھی حالات کو معمول پر لانے کے لیے طالبات سے چلڈرن لائبریری خالی کرنے کے لیے کہیں اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ہر مکتب فکر کے علماء کے تعاون سے ایک ایسی بھرپور تحریک کی صورت گری کریں جو واقعی اس ملک کی تقدیر بدل دے۔

میں یہ کالم لکھ رہا ہوں اور کراچی سے آئے ہوئے اکابر علماء لال مسجد میں مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی سے مصروف مذاکرات ہیں۔ ان میں مولانا سلیم اللہ خان، جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر اور دارالعلوم اکوڑہ خٹک کے شیخ الحدیث ڈاکٹر شیر علی شاہ جیسے زعما شامل ہیں۔ اعجاز الحق، اتوار ہونے کے باوجود اپنے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ وفاق المدارس کے کئی دیگر علماء بھی آس پاس موجود ہیں۔ اللہ کرے معاملات خوش اُسلوبی سے طے پا جائیں۔ میں ایک بار پھر مولانا عبدالعزیز سے دست بستہ اپیل کرتا ہوں کہ حکومت نرمی کا مظاہرہ کرے تو وہ بھی مثبت جواب دیں۔ رہی طاقت آزمائی تو حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے نتائج کتنے ہولناک ہوں گے۔ اسلام آباد کے عین قلب میں خون خرابہ ہوا تو بڑے بڑے قصر و ایوان ہل جائیں گے۔ سو علماء کے مذاکرات کا نتیجہ کچھ بھی نکلے، طاقت آزمائی سے بہر حال گریز کیا جانا چاہیے۔ چلڈرن لائبریری کچھ دن اور بھی بند رہی تو کوئی قیامت نہیں آئے گی۔

[11-02-2007]

# یہ عہد خون رنگ!

ہر عہد کسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس عہد کو صرف ''عہد خون رنگ'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ خون ہی خون۔ شمال کے پہاڑوں سے جنوب کے کوہساروں تک لہو ہی لہو۔ اگر کوئی گنتی شمار کرنے والا ہو تو بتائے کہ 12 اکتوبر 99ء سے لے کر اب تک کتنے پاکستانیوں کی لاشیں گر چکی ہیں؟ میرے سامنے اعداد و شمار نہیں لیکن میں ایک لمحے کے تذبذب کے بغیر پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جتنے انسان اس عہد خون رنگ میں قتل ہوئے اتنے انسانوں کا لہو کسی بھی حکمران کے دور میں نہیں بہا۔ پہاڑ، گھاٹیاں، وادیاں، صحرا، میدان، گلی کوچے، بازار سب لہو میں نہائے ہوئے۔ وانا اور باجوڑ کی غریب و پسماندہ بستیوں سے کراچی اور اسلام آباد جیسے آسودہ حال شہروں تک لاشیں ہی لاشیں۔ وجوہات، اسباب اور محرکات کو ایک طرف رکھیے، افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس خوں خوار عہد میں انسانی جان کی کوئی قیمت ہی نہیں رہی۔ شاید ہی کوئی طبقہ ہو جس کا لہو رزق خاک نہیں ہوا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، علماء، مجاہدین، طلبا، وکلا، فوجی، عام شہری، تاجر، صحافی، جس طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھیں لاشیں بکھری پڑی ہیں اور خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔

لاشیں اُس وقت گرتی ہیں جب ریاستوں کے نظم و نسق، دستوری تحمل اور جمہوری تدبر کے ہاتھوں سے نکل کر طاقت کی زبان بولنے والوں کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں۔ ایسا جابر بندوبست سامراجی فکر رکھتا ہے اور وہ عوام کو ''رعایا'' قرار دیتا ہے۔ جس پر حکمرانوں کی اطاعت واجب ہوتی ہے۔ طاقت کے عناصر ترکیبی میں ایک خاص نوع کی رعونت بھی ہوتی ہے۔ یہ رعونت کسی کو سر اُٹھا کے چلنے اور توانا لہجے میں بات کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ گزشتہ ساڑھے سات برس میں طاقت کی اس غیر جمہوری اور فتنہ پرور نفسیات کے لاتعداد مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں۔ قبائلی علاقوں کے آپریشن سے نواب اکبر بگتی کے قتل اور کراچی کی خونریزی سے اسلام آباد کی لال مسجد تک اِسی فکر بیمار کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ بوجوہ صدر پرویز مشرف کی سربراہی میں قائم بندوبست افہام و تفہیم، مذاکرات، صلح جوئی اور معاملات کو جمہوری انداز میں سلجھانے کی روایت قائم نہیں کر سکا۔ صدر اپنے مزاج، تربیت اور افتادِ طبع کی بنا پر قوت آزمائی کو ایک مؤثر اور کارگر حربہ خیال کرتے ہیں۔ جب بلوچستان کے معاملے کو سلجھانے کے لیے چودھری شجاعت حسین اور مشاہد حسین سید، بلوچستان کمیٹی کے پلیٹ فارم سے سنجیدہ کوشش کر رہے تھے تو جناب صدر نے بیان جاری کیا کہ ''ہم اُن کو اس طرح ماریں گے کہ انہیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ یہ کہاں سے ہٹ ہوئے۔'' پیہم کوششوں کے باوجود بلوچستان کمیٹی کی سفارشات بروئے کار نہ آسکیں اور پھر وہی ہوا جو طاقت کی

اندھی کارفرمائی سے ہوا کرتا ہے۔

جامعہ حفصہؓ اور لال مسجد کا معاملہ کئی ماہ سے اُلجھا ہوا ہے۔ اس اُلجھاؤ کی ساری ذمہ داری کسی ایک فریق پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ مولانا عبدالرشید غازی اور مولانا عبدالعزیز نے بھی نرمی اور لچک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے علمائے کرام اور اپنے کئی دوسرے بہی خواہوں کی تجاویز اور مشوروں کو بھی اہمیت نہ دی۔ لیکن معاملے کو سلجھانے کے لیے ایک مؤثر حکمت علمی نہ بنانا اور اس واقعے کو بین الاقوامی اہداف کے تناظر میں اس طرح اُچھالنا کہ مغرب کے دل میں صدر پرویز مشرف کے لیے ہمدردی پیدا ہو اور دینی مدرسے کا تشخص منفی انداز میں اُبھرے، کسی سوچی سمجھی سکیم کا حصہ لگتا ہے۔ صورت حال پر گہری نگاہ رکھنے والے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے مذاکرات کی کوئی مربوط اور باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔ کبھی وفاقی وزیر مذہبی اُمور محمد اعجاز الحق اپنے طور پر علمائے کرام کے وفود کے ہمراہ کوشاں رہے۔ انہوں نے ایک مفاہمتی دستاویز تیار کر لی تو وفاقی کابینہ ہی کے کچھ وزراء نے شدید ردّعمل کا اظہار کیا اور صدر پرویز مشرف سے شکایت کی کہ اعجاز الحق اپنے طور پر لال مسجد والوں کو خواہ مخواہ رعایتیں دے رہا ہے۔ اعجاز الحق کو پیشیاں بھگتنا پڑیں اور وضاحتیں پیش کرنا پڑیں۔ چودھری شجاعت حسین اپنے طور پر کوشاں ہوئے۔ انہوں نے بھی ایک مفاہمتی دستاویز تیار کر لی لیکن سی ڈی اے نے اُسے سبوتاژ کر دیا۔ اِسی طرح سرکار کی طرف سے کئی بے ڈھب اور بے ربط انفرادی کوششیں ہوئیں لیکن حکومت کوئی جامع حکمت علمی نہ بنا سکی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حکومت نے بامعنی اور نتیجہ خیز مذاکرات کی کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی۔ لال مسجد کے خطیب حضرات کا یہی تاثر رہا کہ مذاکرات اُنہی سے کامیاب ہو سکتے ہیں جو قوت نافذہ بھی رکھتے ہوں۔ اِسی حکومتی روش کے باعث یہ عوامی تاثر بھی گہرا ہوا کہ حکومت اس معاملے کو حل کرنے کے بجائے اس کا تسلسل چاہتی ہے تاکہ وہ بدستور مغرب کی آنکھوں کا نور بنی رہے اور امریکہ کو یہ پیغام ملتا رہے کہ ''طالبنائزیشن'' عین قلب اسلام آباد تک آن پہنچی ہے جس کے ازالہ اور تدارک کے لیے صدر مشرف کا بدستور اقتدار میں رہنا بے حد ضروری ہے۔

وجوہات کچھ بھی ہوں۔ یہ حکومت کی نااہلی ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے مسئلے کو سلجھا نہ سکی اور سلگتی چنگاریوں پر مسلسل تیل چھڑکتی رہی۔ درجن بھر افراد کا جان بحق اور سینکڑوں کا زخمی ہونا اُسی بے ہنری اور بے تدبیری کا نتیجہ ہے۔ جو ہر معاملے کو طاقت کے زور پر حل کرنا چاہتی ہے۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد جب صدر مشرف بنگلہ دیش گئے تو انہوں نے وہاں کے ''شہدائے آزادی'' (سابقہ مکتی باہنی) کی قبروں پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہوئے یادگاری کتاب میں لکھا۔ ''مفاہمت کا حوصلہ طاقت آزمائی سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔'' افسوس کہ وہ اپنے اس اُصول کو اپنے انداز حکمرانی کا جزو نہ بنا سکے۔ انہوں نے ہر کہیں، ہر طبقے سے محاذ آرائی اور تصادم کی راہ اختیار کی اور جہاں ضروری سمجھا، طاقت کا بے محابہ استعمال کیا۔ معاملات کو

بگاڑ کی آخری حد تک لے جانا اور پھر اپنے ''اسٹائل'' کے مطابق اسے حل کرنا اُن کے طرزِ حکمرانی کا خاصہ بن گیا ہے۔ لوگ یہ سوال بھی اُٹھا رہے ہیں کہ لال مسجد کا یہ خون رنگ کھیل عین اُس دن کیوں کھیلا گیا جب قافلے اے پی سی میں شرکت کے لیے لندن آ رہے تھے؟ کیا اس سے طوفان ٹل جائے گا؟ کیا نوجوانوں کے خونِ گرم کے دھبے، اس بندوبست کی تقویت کا سبب بنیں گے؟ کیا اس صورت حال کی آڑ میں اگر مولانا فضل الرحمٰن لندن نہ آ سکے تو حکومت اور اس کے خیرخواہوں کی قوت میں اضافہ ہو جائے گا؟

میں لندن میں بیٹھا پاکستانی چینلز کے ذریعے سب کچھ براہ راست دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ابھی یہ ''عہدِ خوں رنگ'' کتنے اور انسانوں کا لہو پئے گا؟ سوا نیزے پہ کھڑے اس قیامت مزاج سورج کو غروب ہونے میں کتنے زمانے لگیں گے؟ امن، مفاہمت، خیر سگالی اور مصالحت کی خوبو رکھنے والی صبحِ جمہوریت کتنی اور لاشیں گرنے کے بعد طلوع ہوگی؟

[05-07-2007]

# یہ لشکرِ بے اماں!

تازہ لہو کے تازہ جام پینے کے بعد ''عہد خوں رنگ'' کا چہرہ کچھ اور نکھر آیا ہے۔ جوانانِ قوم کے خون گرم کی حدت سے اس کے رخسار تمتمانے لگے ہیں۔ بلاشبہ یہ تاریخ ساز کامیابی ہے۔ لال قلعہ تو نا آسودہ خواہشوں کی دُھند میں کھو گیا لیکن لال مسجد کے میناروں پر کامرانی کے پرچم لہرا دیئے گئے۔ لاریب یہ ایک ''تاریخ ساز فتح'' ہے۔ کوئی بھی سپاہ اس پر ناز کر سکتی ہے۔ یہاں ایک سو سال تک سات سمندر پار سے آئے سامراج کی حکمرانی رہی لیکن وہ بھی اپنے غلاموں پر ایسی عظیم فتح نہ پا سکا۔ شاید دنیا کی تاریخ میں ایسی کامرانی کی کوئی نظیر نہ ملے۔ شاید ہی کسی ریاست نے کسی تعلیمی ادارے کو اس انداز سے فتح کیا ہو۔ شاید ہی کسی حکومت نے کسی درس گاہ پر حملہ کر کے اتنے لوگوں کا خون بہایا ہو۔

میں منگل کے دن، پاکستانی وقت کے مطابق کوئی سات بجے شام یوسٹن کے ریلوے سٹیشن سے مانچسٹر جانے والی ٹرین پر سوار ہوا۔ بہ مشکل اپنی نشست سنبھالی تھی کہ لندن سے ایک دوست نے اطلاع دی۔ ''مولانا عبدالرشید غازی شہید ہو گئے ہیں۔'' ایک تیز دھار خنجر میرے دل میں دُور تک اُتر گیا۔ ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اسلام آباد سے کسی نے خبر کی تصدیق کی۔ میرے اعصاب میری گرفت میں نہ رہے۔ سر آپ ہی آپ نشست کی پشت سے جا لگا۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے ضبط کی تمام تر قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر قابو رکھا لیکن اندر ہی اندر ایسا ساون برسا کہ میری رُوح تک جل تھل ہو گئی۔ تیز رفتار ٹرین فراٹے بھر رہی تھی۔ میں ٹیک لگائے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا۔ بادلوں سے ڈھکا آسمان، سرسبز میدان، ہرے بھرے کھیت، شاداب چراگاہیں، آزادانہ گھومتے مال مویشی، کسانوں کے روایتی گھر۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور جامعہ حفصہؓ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں عبدالرشید غازی میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بڑی محبت سے چائے بنا رہا تھا۔ اصرار کے ساتھ مجھے بسکٹ پیش کر رہا تھا۔ مولانا عبدالعزیز مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھا رہے تھے۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے غازی سے کہا...... ''آپ بھی تو کچھ بولیں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے ادب واحترام کے گندھے لہجے میں کہا تھا۔ ''دو بڑوں کے سامنے میں کیا بولوں؟''

---

مجھے دُکھ ہوا کہ میری بات نہیں مانی گئی۔ پھر میں اس قضیئے سے الگ ہو گیا۔ میں نے اس پر بہت کچھ لکھنے سے بھی گریز کیا۔ میرے دل کے کسی دُور دراز گوشے میں یہ خدشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ کوئی انہونی ان بھائیوں کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ میں نے ملاقات والے چھوٹے سے کمرے میں خون

شہداء کی خوشبو جیسی مہک بھی محسوس کی تھی۔ شاید عبدالرشید غازی کا خیال ہو کہ اسلام آباد کا شہر خوش جمال باجوڑ اور ڈمہ ڈولہ جیسی بے آب و رنگ بستیوں سے بہت مختلف ہے۔ یہاں دارالحکومت کے عین قلب شہر میں خون کی ہولی کھیلنا آسان نہیں ہوگا۔ شاید وہ بھول گیا تھا کہ سفا کی، تہذیب کے کسی قرینے کو نہیں مانتی، رعونت اپنے ضابطے خود بناتی ہے، طاقت کا نشہ، آئین و قانون کے تقاضوں سے ماوراء ہوتا ہے۔ درندگی، اخلاقیات کا کوئی پیمانہ نہیں رکھتی اور فتح و کامرانی کا جنوں، انسانیت کے آداب سے بیگانہ ہوتا ہے۔ خناس، احساس سے عاری ہوتا ہے۔ مولانا عبدالعزیز کی گرفتاری کے بعد انہیں ایک بار پھر برقعہ پہنا کر پی ٹی وی نے جو ڈرامہ تخلیق کیا، اس کے تصور سے بھی گھن آتی ہے۔ اس ڈرامے کا ہدایت کار جو بھی تھا، کم از کم یہ واضح ہو گیا کہ حکمران، حکمت سے عاری ہی نہیں، ایک عالم دین کو تضحیک و توہین کا نشانہ بنا کر لطف اُٹھا رہے ہیں۔

مجھے تھوڑی دیر پہلے مولانا فضل الرحمٰن خلیل کا فون آیا۔ عبدالرشید غازی کی خواہش پر انہیں شریک مذاکرات کیا گیا تھا۔ وہ گھنٹوں معاملہ سلجھانے کے لیے کوشاں رہے۔ فضل الرحمٰن خلیل نے بتایا۔ ''منگل کو عبدالرشید غازی سے میری آخری بات ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے..... 'اس وقت میری والدہ کا سر میری گود میں رکھا ہے۔ وہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے آخری ہچکیاں لے رہی ہیں۔ اُن کی رُوح پرواز کرنے کو ہے۔ مجھے بھی شہادت صاف دکھائی دے رہی۔ میری وصیت ہے کہ مجھے میرے شہید والد کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ میری والدہ.....' پھر غازی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی اور فون بند ہو گیا۔'' شہید شوہر کی شہید اہلیہ نے چند لمحوں بعد شہید ہونے والے بیٹے کے زانو پر سر رکھے رکھے آخری ہچکی لی۔ معلوم نہیں غازی کا سینہ کس وقت چھلنی ہوا۔ معلوم نہیں آخری ہچکی لیتے ہوئے اُس کا سر کس کے زانو پر دھرا تھا۔

مولانا فضل الرحمٰن خلیل مجھ سے کہہ رہے تھے۔ ''اعجاز الحق تمہارا دوست ہے۔ خدا کے لیے اُسے کہو کہ غازی کی میت ہمارے حوالے کر دیں۔ یہ لوگ اُسے زبردستی روجھان مزاری لے جانا چاہتے ہیں۔ اُس کی بیوی، اُس کی بہنیں دہائی دے رہی ہیں۔ شہید کی آخری وصیت تو پوری ہونے دیں۔'' میں نے اعجاز الحق کے تمام معلوم نمبروں پر رابطے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بات ہو بھی جاتی تو وہ کیا کر لیتا؟ یہاں تو 342 ارکان کی پارلیمنٹ اور اَسی وزراء کی جہازی کابینہ ہوتے ہوئے بھی فیصلے فرد واحد کے کنج لب سے پھوٹ رہے ہیں۔

---

سرینڈر پوائنٹ بنانے، ہتھیار ڈلوانے، ہاتھ اُٹھا کر مارچ کرانے کی خواہش بیمار آسودہ ہو گئی۔ بے چہرہ بندوبست کے سیاہ کارناموں کی کتاب سیاہ میں سب سے شرمناک باب کا اضافہ ہو گیا۔ فتح مندی کا جنوں بھر نہ جاتا تو اس قتل عام کو روکا جا سکتا تھا۔ پرلے درجے کی بے حکمتی اور خودسری معاملات کو ایسے موڑ پر لے آئی جہاں تناؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ صدر مشرف اور اُن کے رُفقاء ابتدا ہی سے لال مسجد والوں

کو نمونہ عبرت بنانے پر بضد تھے۔ کابینہ کے دو وزراء اُن کی خوشنودی کے لیے ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ جس کسی نے صلح صفائی کی بات کی اُسے نکو بنا دیا گیا۔ سلجھاؤ کی کوششوں کو مخلصانہ ریاستی سرپرستی حاصل ہی نہ ہو سکی۔ صدر بلوچستان کے سیلاب زدگان کو تسلی دینے گئے اور کمانڈو کی وردی پہن کر اعلان کیا۔ ''یہ مارے جائیں گے...... یہ مارے جائیں گے۔'' انہوں نے ایسا ہی ایک اعلان نواب اکبر بگٹی کے بارے میں کیا تھا۔ ''یہ لوگ اس طرح مارے جائیں گے کہ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ کس شے نے ہٹ کیا۔'' پھر بگٹی پہاڑ کے ایک غار میں بھسم ہو گیا۔ چودھری شجاعت نہ بگٹی کو بچا سکے نہ غازی کو۔ کوئی نواب ہو کہ مولوی، غار نشین ہو کہ حجرہ نشین، رعونت کی طاقت آزمائی کسی کو معاف نہیں کرتی۔ یہ وہی حکمت عملی ہے جسے ٹکا خان نے مشرقی پاکستان میں آزمایا تھا۔ جو اندھی، گونگی اور بہری قوتیں اپنی رعایا سے روا رکھتی ہیں۔

کہا گیا۔ ''غازی آئین اور قانون کا مجرم تھا، اُسے کس طرح راستہ دیتے؟'' کون سا آئین اور کیسا قانون؟ جہاں آئین کے سب سے جابر اور کڑے ضابطے کو روندنے والے ریاست کے سب سے بڑے منصب کے حق دار ٹھہریں، وہاں بھی کوئی آئین، کوئی قانون ہوتا ہے؟ اور پھر مولانا فضل الرحمٰن خلیل اور علماء کی مساعی سے جب ایک مفاہمت طے پا گئی تھی، وزراء کی مذاکراتی ٹیم اور وزیر اعظم نے اس کی توثیق کر دی تھی تو صدر نے اسے کیوں ویٹو کر دیا؟ مجھے فضل الرحمٰن خلیل صاحب ہی نے بتایا کہ سب کچھ طے پا گیا تھا...... لیکن پنڈی کیمپ آفس جانے والوں نے تین گھنٹے لگا دیئے اور پھر واپس آئے تو اُن کی جیبیں بارود سے بھری تھیں۔ ضیاء الحق کے دور میں الذوالفقار نے پاکستانی طیارہ اغواء کر کے کابل پہنچا دیا۔ اغواء کاروں نے ایک سابق فوجی افسر کو قتل بھی کر دیا۔ انہوں نے سو کے لگ بھگ دہشت گردوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا جو قتل و غارت گری اور غداری جیسے سنگین مقدمات میں ملوث تھے۔ ضیاء الحق نے مسافروں کی جانیں بچانے کے لیے اُن سب کو رہا کر کے ہائی جیکرز کے مطالبے کے مطابق دمشق پہنچا دیا۔ بھارت کا طیارہ اغوا کر کے قندھار پہنچا دیا گیا۔ ہائی جیکرز نے بھارتی جیلوں میں بند کچھ ایسے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جو بھارت کے مطابق سنگین جرائم میں ملوث تھے۔ آخر ہمارے حکمران سینکڑوں افراد کی جانیں بچانے کے لیے عبدالرشید غازی کو محفوظ راستہ دینے پر کیوں آمادہ نہ تھے؟

اس خونخواری و خونریزی سے گریز ممکن تھا۔ بجا کہ ریاست نے اپنی رٹ قائم کر لی۔ درست کہ عبدالرشید غازی کے بعد پاکستان زیادہ محفوظ و مامون ہو گیا۔ برحق کہ فوج نے اپنی طاقت کو لوہا منوا لیا۔ لیکن کیا ''روشن خیالی'' اِسی کا نام ہے؟ کیا مہذب ریاستیں یہی کچھ کیا کرتی ہیں؟ اگر امریکہ کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ ''دہشت گردی'' کا خاتمہ صرف میری قوت بازو ہی سے ممکن ہے اور اس قوت بازو کا انحصار میری وردی پر ہے تو یہ پیغام صاف اور بلند آہنگ میں پہنچ گیا۔ اس کی تصدیق بھی ہو گئی اور تائید بھی۔ داد

بھی مل گئی۔ لیکن جابروں کے قبیلے میں کوئی ہے جو بتا سکے کہ اس سے پاکستان کے سینے پر کتنا گہرا گھاؤ آیا ہے؟ کسی کو خبر ہے کہ جب بوڑھی ماؤں کی لاشیں اپنے بیٹوں کی گود میں گرتی ہیں تو اللہ کا عرش بھی لرز جاتا ہے۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ بپھری ہوئی رعونت اور اندھی طاقت آزمائی، نفرتوں کو ہوا دیتی اور ہر موج خوں وطن کی سرزمین میں ایک گہری دراڑ ڈال جاتی ہے؟

کسی دشمن سرزمین پر فاتحانہ آپریشن کے سے انداز میں لشکر کشی کی فنی جزئیات پر روشنی ڈالنے کے باوجود کوئی ترجمان یہ بتانے پر تیار نہیں کہ جامعہ حفصہؓ اور لال مسجد کے صحن، برآمدوں، کمروں، راہ داریوں میں کتنی لاشیں بکھری پڑی ہیں؟ ان میں کتنے بچے ہیں اور کتنی خواتین؟ سب کے ماتھوں پر ''دہشت گردوں'' کے لیبل سجا دیئے گئے ہیں؟ کوئی نہیں جانتا کہ کس کا خون کس کے خون میں تحلیل ہو گیا؟ کوئی نہیں جانتا کہ مقتولین کے ماں باپ، بھائی بہن کہاں ہیں اور کس کرب کی آگ میں جل رہے ہیں؟ کوئی نہیں جانتا کہ آپریشن ''سائلنس'' کی کوکھ سے کتنی قباحتیں جنم لیں گی؟ بس اتنی خبر ہے کہ وائٹ ہاؤس نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ عینی شاہد کی طرح تمام تر ذمہ داری مسجد انتظامیہ پر ڈال دی ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے قتل عام کی ستائش کی ہے اور لندن میں بیٹھے الطاف حسین نے اس کارنامے کو سراہا ہے۔ نائن الیون کا آسیب بھی کتنا بڑا ''دیوتا'' بن گیا ہے!

پانچ چھ دن قبل مجھے اسلام آباد سے بیگم کا فون آیا۔ وہ بتانے لگیں ''غازی صاحب کی بہن کا فون آیا ہے۔ وہ رو رہی تھی اور آپ کے بارے میں کہہ رہی تھی کہ اُن سے کہیں کچھ کریں۔'' میں اُس رات سو نہیں پایا تھا۔ میں پاکستان میں ہوتا بھی تو کیا کر لیتا؟ فتح و کامرانی کے پھریرے لہراتا لشکر بے اماں، کیڑے مکوڑوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے۔

شہید باپ اور شہید ماں کا شہید بیٹا، ہمارے لفظوں کی مینا کاری سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اللہ اُس کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ اُس کی خطائیں معاف کر دے۔ اُس کے درجات بلند کرے اور اُن سب کے بھی جو اس عہد خوں رنگ کی خوں آشامی کا لقمہ ہو گئے۔

مولانا فضل الرحمٰن خلیل شاید اب تک نہیں جان پائے کہ اُن کا سابقہ کن بے رحم موسموں سے آپڑا ہے۔ اپنی پسند کے نشانے تلاش کرنے، اپنی مرضی کے سینے چھلنی کرنے، اپنے دل پسند تابوتوں میں بند کرنے، اپنی پسند کی قبروں میں پھینکنے اور اپنی مرضی کے جنازے پڑھوانے والوں کے سینے میں دل نہیں ہوا کرتے!!

[12-07-2007]

---

# وہ قیامتیں جو گزر گئیں!

جناب صدر کی تقریر درد کا مداوا نہ کر سکی۔ مداوا تو خیر کیا کرنا تھا، وہ قوم کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم بھی نہ رکھ سکی۔ یہ گناہ کا ایسا عذر تھا جو گناہ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ سوال صرف ایک ہی ہے ''ایسی بھیانک خونریزی کیوں؟'' کوئی ایک بھی ایسی دلیل نہ دی جا سکی جس سے ثابت ہوتا کہ اس قدر خوں آشام آپریشن ضروری ہو گیا تھا۔ اگر مولانا عبدالرشید غازی اور مولانا عبدالعزیز پر عائد کیے جانے والے تمام الزامات سو فیصد درست مان لیے جائیں تو بھی سینکڑوں بچوں، عورتوں اور نوجوانوں کی ایسی بے رحمانہ ہلاکت کا جواز کیا تھا؟ یہ کمال درجے کی نااہلی اور بے حکمتی تھی جسے اندھی رعونت نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ کامل چھ ماہ تک جامعہ حفصہؓ اور لال مسجد کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کی آماج گاہ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ پاکستان میں اُبھرتی ہوئی طالبنائزیشن کے تصور کو ہوا دے کر موجودہ بندوبست کے تسلسل کا جواز پیدا کیا جائے۔ پھر آگ، بارود اور خون کا ایک شرمناک کھیل کھیلا گیا تاکہ امریکہ اور مغرب کو پیغام دیا جا سکے کہ ''دہشت گردی'' کے خلاف لڑنے کا عزم کتنا پختہ ہے؟ باور کرایا گیا کہ یہ سب کچھ ایک باوردی صدر کی وجہ سے ممکن ہوا ہے جسے کمزور کر دیا گیا تو ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ بھی کمزور پڑ جائے گی۔ سرکار دربار کے چوبدار جو جی چاہے کہتے رہیں، حقیقت اولیٰ یہی ہے کہ لال مسجد کا آپریشن، جنگ دہشت گردی سے جڑا تھا اور اسے امریکہ کے حضور اپنی شاندار کارکردگی و کارگزاری کے طور پر پیش کیا گیا۔ توقع کے عین مطابق ریاست اوہایو میں ایک تقریب کے دوران صدر بش نے کہا ''مشرف ان دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں ہمارا مضبوط اتحادی ہے۔ میں اُسے بہت پسند کرتا اور اُس کی کارکردگی کو سراہتا ہوں۔ امریکہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے ممالک میں بھی مشرف جیسے اتحادی تیار کرے۔''

صبح و شام آزادی صحافت کے ترانے گانے والوں نے آپریشن شروع ہوتے ہی میڈیا کو زنجیریں ڈال دیں۔ صحافیوں کو کوسوں دُور کر دیا گیا۔ حکم صادر ہوا کہ قریب آنے والے صحافی کو گولی مار دی جائے۔ براہ راست اور بے لاگ خبروں کے مکمل بلیک آؤٹ میں اس کارروائی کا آغاز ہوا جس پر دیر تک اسرار کی دُھند چھائی رہے گی اور کہانیاں بنتی رہیں گی۔ آپریشن مکمل ہو جانے کے چوتھے دن صحافیوں کو فوجی نگرانی میں جامعہ حفصہؓ اور لال مسجد کے محدود اور مخصوص علاقے دکھائے گئے۔ اب اس دورے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کی لاشیں ٹھکانے لگائی جا چکی تھیں۔ دیواروں اور فرش سے خون کے

دھبے تک مٹا دیئے گئے تھے۔ کوئی آثار باقی نہ تھے کہ کس جگہ کتنی لاشیں گریں؟ کتنے ''جنگجوؤں''، کتنی عورتوں اور کتنے بچوں نے کس جگہ کہاں کہاں تڑپ تڑپ کر جانیں دیں۔ اُن کی چیخیں، آہیں اور سسکیاں دم توڑ چکی تھیں۔ اب میڈیا کو کیا دکھانے لائے ہو؟ موت کی وحشت تو تمام ہو چکی، رقص بسمل کب کا تھم گیا، باقی کیا بچا ہے؟ بارود کی بو، لہو کی باس، جلے گوشت کی بساندھ، دھوئیں سے دھونسے ہوئے در و دیوار، جلے ہوئے دروازے، پگھلی ہوئی جستی الماریاں، مڑی تڑی سلاخیں، بکھرا ہو نیم سوختہ ساز و سامان، ادھڑے ہوئے دوپٹے، جلے ہوئے برقعے، دیواروں سے چپکے گوشت کے لوتھڑے، سوکھی روٹی کے ٹکڑے، بیگ، بستے، چوڑیاں، پرس، برتن، چادریں، بستر، کتابیں، کاپیاں، کھلونے، کپڑے اور بھنبھناتی مکھیاں......!!

اتنی بڑی لشکر کشی کا کوئی ایک بھی معقول جواز پیش نہیں کیا جا سکا۔ کہا گیا وہ ہزاروں میں تھے۔ وہ تربیت یافتہ جنگجو اور سخت جان دہشت گرد تھے۔ اُن کے پاس اسلحہ اور گولہ بارود کا بھاری ذخیرہ تھا۔ 50 کلاشنکوفیں، 25 پٹرولیم بم، 20 ہینڈ گرینیڈ، 6 ایم جی، 50 ہزار سے زائد گولیاں، راکٹ لانچر، راکٹ، فاسفورس بم، سٹین گنیں، بارودی سرنگیں، پی، جینز پسٹل، خودکش بیلٹس، ماسک، تیزاب کی بوتلیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ وہ قلعے کے اندر مورچہ بند تھے۔ وہ کھڑکیوں، روشن دانوں، دیواروں میں بنائے گئے روزنوں اور مسجد کے اُونچے میناروں سے گولیاں برسا رہے تھے۔ لیکن اپنی تمام تر عسکری مہارت، گوریلا جنگ کی تربیت اور فن جنگجوئی کے باوصف وہ صرف گیارہ سکیورٹی اہلکاروں کو نشانہ بنا سکے جو کھلی فضا میں پرندوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، ہے کوئی ماننے والی بات؟

کہانی اس قدر بودی اور سکرپٹ اتنا بے مغز ہے کہ اوسط درجے کا فلم ہدایت کار بھی اسے ایک معقول فلم کے لیے قبول نہیں کر سکتا۔ یہ ظلم تھا۔ اللہ کے غضب کو للکارنے والا برہنہ اور بے رحمانہ ظلم۔ اسے کسی بھی ریشمی غلاف میں لپیٹ کر ''کار خیر'' نہیں بنایا جا سکتا۔ تہذیب کا ادنیٰ قرینہ رکھنے والی ریاست بھی اپنے شہریوں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنے کا تصور نہیں کر سکتی۔ آپریشن کے بعد کا آپریشن اور بھی زیادہ شرمناک ہے۔ ابھی تک یہ نہیں بتایا جا رہا کہ کتنی جانیں اس قہر کا لقمہ بن گئیں؟ سبزی منڈی کے کولڈ سٹوروں میں کتنی لاشیں پڑی ہیں؟ جامعہ حفصہؓ میں آخر وقت تک سینکڑوں طالبات موجود تھیں۔ وہ کہاں گئیں؟ جناب صدر اپنی تقریر میں جاں بحق ہونے والوں کی تعداد 75 بتاتے ہیں۔ اسلام آباد کے ڈپٹی کمشنر نے ٹیلی ویژن پر بیان دیا کہ گیارہ سکیورٹی اہلکاروں سمیت یہ تعداد 102 ہے۔ وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ کہتے ہیں ''ابتدا میں یہاں ساڑھے چار ہزار طلبا و طالبات موجود تھے۔ آپریشن کے دوران 1300 نکل گئے۔'' اگر یہ درست ہے تو تین ہزار سے زائد باقی بچے اور بچیاں کہاں ہیں؟ وزراء کو کچھ پتا نہیں۔ آئی ایس پی آر کے ترجمان ابھی تک حتمی تعداد کی تلاش میں ہیں۔ یہ کون سی بستی ہے جہاں انسانی جان کی

قدر و قیمت برڈ فلو کا شکار ہونے والی مرغیوں سے بھی کم تر ہے؟ گم شدگان کے کم نصیب والدین اسلام آباد کے گلی کوچوں میں دہائی دے رہے ہیں۔ روشن خیال حاکموں میں سے کوئی نہیں جو انہیں تسلی دے سکے اور وہ یتیم بچے جانے کن قبروں کا رزق ہو گئے جنہیں تلاش کرنے والے برسوں قبل اس آزار سے آزاد ہو گئے۔

صحافیوں کو لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ میں قلعہ بندیوں کے کوئی آثار نہ ملے۔ نہ کوئی خندق، نہ سرنگ، نہ بھول بھلیاں، نہ چور دروازے، نہ پختہ بنکرز، نہ تہ در تہ مورچہ بندیاں، نہ عسکری تربیت کا کوئی ڈھانچہ، نہ تہ خانہ، نہ مربوط دفاعی نظام۔ سارا ''اسلحہ خانہ'' روایتی دینی مدارس جیسا تھا۔ قرآن مجید، درسی کتابوں اور کاپیوں کے جھلسے ہوئے اوراق۔ بات صرف اس قدر ہے کہ ایک خوں آشام آپریشن کی خونخواری کو چھپانے کے لیے طلبا و طالبات کو خوفناک دہشت گرد اور القاعدہ سے ناتا رکھنے والے جنگجو ثابت کیا جا رہا ہے۔

جھوٹ اور مبالغہ ایک حد تک قابل قبول اور گوارا ہوتے ہیں۔ عوام سرکاری کہانیوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ آپریشن ''سائلنس'' نے پوری قوم کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ انھیں بھی جو لال مسجد کو حق بجانب خیال کرتے تھے اور انہیں بھی جو اُن کے طرزِ عمل کے نقاد تھے۔ یہ اوّل و آخر تک ایک ناقص آپریشن تھا جس میں سینکڑوں افراد کی جانیں گئیں۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے ہائی جیکرز کو سزا دینے کے لیے پورے جہاز کو مسافروں سمیت بموں کا نشانہ بنایا جائے......! اور کبھی فرصت ملے تو سوچیے گا...... قہرشاہی کا نشانہ بننے وا۔۔! غازی خاندان کا قصور کیا تھا؟ اسلام آباد روانگی سے ایک دن قبل مانچسٹر کے ایک معروف ریستوران سے نکلتے ہوئے مجھے ایک پاکستانی ڈاکٹر مل گئے۔ ڈاکٹر حامد خان۔ ڈاکٹر صاحب برسوں سے وہاں مقیم ہیں۔ کہنے لگے ''عرفان صاحب! یہاں مانچسٹر میں جب بے حیا طوائفیں شرفا کے کسی محلے میں ڈیرے جما لیں تو پولیس کو اطلاع کی جاتی ہے۔ پولیس نہ آئے تو اہل محلّہ خود انہیں مار پیٹ کر وہاں سے نکال دیتے ہیں۔ بریڈفورڈ میں تو باقاعدہ فسادات پھوٹ پڑے تھے جب سول سوسائٹی نے خود جسم فروش عورتوں کے خلاف ایکشن لیا تھا اور یہاں اگر کوئی شخص، کیسا ہی جرم کر کے کسی چرچ، مسجد یا مندر میں پناہ لے لے تو اُس کے خلاف کارروائی نہیں کی جاتی۔ سری لنکا کا ایک باشندہ امیگریشن ضابطوں کی خلاف ورزی پر ڈی پورٹ کیا جا رہا تھا۔ وہ ایک چرچ میں جا گھسا اور مہینوں گھسا رہا۔ پولیس اُس چرچ میں داخل نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ چرچ والے خود معافی تلافی کے لیے سرگرم ہو گئے...... غازی عبدالرشید نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اُس کی خاطر سینکڑوں معصوم افراد کو قتل کر دیا گیا۔''

ایک سٹور کے کیش کاؤنٹر پر کھڑے سیاہ فام مسلم نوجوان نے پوچھا ''کہاں سے آئے ہو؟'' میں نے کہا ''پاکستان سے۔'' کام کرتے کرتے اُس کے ہاتھ یک لخت رُک گئے...... ''اوہو......! جہاں مسجد پر

حملہ کر کے عورتوں اور بچوں کو مار دیا گیا ہے......؟" میں نے جواب دیا "ہاں وہیں سے...... لیکن یہ سب کچھ ہم نے تمہارے اور امریکہ کے لیے کیا ہے۔" اُس کی آنکھیں غضب ناک ہو گئیں۔ "مت کہو ایسی بات۔ تمہیں پتا نہیں کہ مسجدوں پر گولی نہیں چلائی جاتی۔ ہمیں خوش کرنے کے لیے تم اپنے اللہ کو بھی بھول جاتے ہو؟"

جناب صدر کی تقریر کسی زخم پر پھاہا نہ رکھ سکی۔ اس لیے کہ انہیں اس قیامت کی حدت اور شدت کا اندازہ ہی نہیں جو پاکستان پر گزر گئی۔ جس نے سولہ کروڑ انسانوں کے سینے چھلنی کر دیئے اور جس کی تپش کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

[14-07-2007]

---

# لاشیں کہاں ہیں......؟

جامعہ حفصہؓ کی ایک بیٹی نے پرائیویٹ ٹی وی چینل کو بتایا کہ ''ہم 6 جولائی کو اُمِّ حسان کے حکم پر تقریباً تین سو طالبات کے ساتھ باہر آئیں تو جامعہ کے اندر مزید پندرہ سو طالبات موجود تھیں۔ اُس وقت تک ایک سو طالبات، 95 طلبا شہید ہو چکے تھے جن کی لاشیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ پہلا حملہ ہوا تو ہم قرآن مجید پڑھ رہی تھیں۔ اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہم قرآن مجید بند کر کے آئی تھیں یا رحل پر کھلا چھوڑ دیا تھا......'' پھر اسلام اور پاکستان کی اُس بیٹی کی آواز رندھ گئی۔ ''...... میں کیا بتاؤں سب کچھ بکھر گیا ہے۔ لقمہ ہاتھ میں اُٹھا کر بھول جاتی ہوں کہ اسے منہ میں ڈالنا ہے۔ ہمیں اپنی بیٹیاں کہنے والوں نے ہمارے خون کا گلدستہ بنا کر امریکہ کو پیش کیا ہے تاکہ وہ خوش ہو جائے اور آئندہ پانچ سال کی صدارت بخش دے......''

جب سے میں وطن لوٹا ہوں، ٹیلی فونوں کا تانتا بندھا ہے۔ اہل پاکستان کے دل شدت غم سے پھٹے جا رہے ہیں۔ ان کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے۔ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی انہیں یقین نہیں آ رہا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی اس نوع کی شرمناک خونریزی ہو سکتی ہے۔ انگریز سپاہ کے ہمراہ خانہ کعبہ پر گولیاں چلانے والوں میں ہمارے ہاں کے کچھ مسلم سپاہی بھی شامل تھے۔ برسوں بعد یہ کہانی پھر دہرائی گئی ہے۔ مکہ فتح ہوا تو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ قبیلہ تھا جس نے اہل اسلام پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے، جس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کو مدینہ میں بھی امن سے نہیں رہنے دیا تھا، جس نے بدر اور احد کی جنگوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزہ اور جید صحابہؓ کا لہو بہایا تھا۔ لیکن حکم صادر ہوا کہ ''جو کوئی حرم کعبہ میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہے۔'' پھر ایسا کیوں ہوا کہ فوج کو پوری قوت کے ساتھ مسجد اور مدرسہ پر حملہ آور ہونے کا فرمان جاری کر دیا گیا؟ 9 جولائی تک لال مسجد یا جامعہ حفصہؓ کے اندر سے ایک گولی تک نہیں چلی تھی، کسی کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ اُن کے تین بڑے ''جرائم'' سامنے آئے تھے...... آنٹی شمیم کا اغواء اور تلقین کے بعد رہائی، مساج سینٹر چلانے والی چینی خواتین کا اغواء اور تلقین کے بعد رہائی اور چلڈرن لائبریری پر قبضہ۔ انہوں نے کسی کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا۔ کسی کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا اور کسی کو ایذا نہیں پہنچائی۔ بحث کی غرض سے تسلیم کر لیتے ہیں کہ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مان لیتے ہیں کہ ملکی قانون ان اقدامات کو قابل سزا جرم قرار دیتا ہے لیکن کیا یہ اتنے بڑے اور ایسے قبیح جرائم تھے کہ سینکڑوں معصوم بچوں، خواتین اور نوجوانوں کو بھون دیا جائے؟ کراچی میں سارا دن بے گناہ لوگوں کے

خون سے ہولی کھیلنے والے کے خلاف ریاست کیوں حرکت میں نہیں آئی؟ وہاں تو اس متعفن اور انتہائی مکرہ کھیل کو ''عوامی طاقت کا مظاہرہ'' قرار دیا گیا۔ جناب صدر تک نے یہ فرمایا کہ کسی قسم کی تحقیقات کی ضرورت نہیں۔ ایک طرف دندناتا ہوا گروہ قاتلاں، حلقہ محبوباں قرار پایا اور دوسری طرف لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ کے محصور، جنہوں نے خونی آپریشن سے قبل کسی کے جسم پر خراش تک نہ ڈالی تھی، اتنے بڑے دہشت گرد اور مجرم کیسے بن گئے کہ انتہائی سفا کی کے ساتھ اُن کے چیتھڑے اُڑا دیئے گئے؟ اب تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مدرسہ یا مسجد میں کوئی جنگی مورچہ بندیاں، خندقیں اور سرنگیں نہ تھیں۔ آٹھ دس لائسنس یافتہ بندوقوں یا کلاشنکوفوں کے سوا کوئی اسلحہ نہ تھا۔ یہ بھی واضح ہوگیا کہ سکیورٹی اہلکار، کسی جارحانہ حملے کا نہیں، اُس وقت دفاعی فائرنگ کا نشانہ بنے جب وہ عمارت کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ یہ راز بھی کھل گیا کہ مدرسے میں موجود کسی طالب علم یا طالبہ کو یرغمال نہیں بنایا گیا تھا۔ باہر آ جانے والوں میں سے ہر ایک اپنے اساتذہ اور ساتھیوں کے لیے خون کے آنسو رو رہا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپریشن سے چار گھنٹے قبل سارے معاملات طے پا گئے تھے۔ محصور کر دیئے جانے والوں کے پاس خوراک کا ذخیرہ نہ تھا۔ وہ تربیت یافتہ جنگجو ہوتے اور کسی بڑے معرکے کا منصوبہ رکھتے تو مہینوں کا راشن جمع کر لیتے۔ بجلی بند، گیس بند، پانی بند۔ اب تو کوئی بتانے والا بھی نہیں بچا کہ اسیران کرب و بلا کے شب و روز کیسے کٹے؟ اُن میں بڑی تعداد یتیم بچوں اور بچیوں کی تھی۔ اُن میں وہ بھی تھے جن کے افلاس زدہ ماں باپ اُن کی کفالت نہ کر سکتے تھے۔ کوئی نہ جان پائے گا کہ بھوک اور پیاس کی شدت کو انہوں نے کیسے برداشت کیا؟ معاملات طے پا گئے تو مولانا غازی نے مولانا فضل الرحمٰن خلیل سے سب محصوران کے لیے کھانا تیار کرنے کو کہا۔ یہ وہ لمحے تھے جب وزراء صدارتی کیمپ میں بیٹھے طے شدہ معاہدے کی تفصیلات بتا رہے تھے۔ پھر وہ کچھ ہوا جو صدیوں تلک اُن سب کے دامن کا داغ بنا رہے گا، جن کا اس خونریزی سے دُور یا نزدیک کا تعلق رہا۔ غازی عبدالرشید شہید، صلح صفائی کے لیے کوشاں ہر شخص سے کہا کرتے تھے...... ''آپ نہیں جانتے، انہیں ہر قیمت پر ہمارا لہو چاہیے۔''

اور اب یہ سوال کروڑوں پاکستانیوں کے دل پر دہکتے انگارے کی طرح دھرا ہے کہ جامعہ حفصہؓ میں موجود پندرہ سو بیٹیاں کہاں گئیں؟ وہ ننھی منی پھول جیسی بچیاں کہاں ہیں جن کے لہو میں لتھڑے سلیپر اور پھٹے کپڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ اُن کی لاشیں کہاں ہیں؟ اب تک کسی ایک بچے، کسی ایک بچی، کسی ایک خاتون کی لاش سامنے نہیں آئی۔ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید کی والدہ کی نعش کہاں گئی؟ سپریم کورٹ کے جج، عزت مآب نواز عباسی نے کہا ہے کہ ''ہمیں پوری تفصیلات بتاؤ، مذاق نہ کرو۔'' عدالت عظمٰی نے جاں بحق ہونے والوں کی اصل تعداد کے حوالے سے کہا کہ یہ معاملہ کوئی انکوائری کمیٹی ہی دیکھ سکتی ہے۔ اِدھر حکمران جماعت کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کو

انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''بہائے جانے والے خون کی ذمہ داری لال مسجد والوں اور حکومت پر عائد ہوتی ہے۔'' لال مسجد والے تو اپنے لہو میں نہا گئے۔ حکومت کا محاسبہ کون کرے گا؟ کیا اتنے بڑے سیاسی طائفے میں کوئی ایک بھی نہیں جو مستعفی ہو کر اس قتل پیشہ بندوبست سے الگ ہو جائے۔ کیا انہیں یقین نہیں کہ ایک نہ ایک دن انہیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے؟ کیا وابستگان اقتدار میں سے کوئی ایک بھی نہیں جو لاپتا ہو جانے والی ''لاشوں'' کا مسئلہ اُٹھائے؟ جناب صدر کہتے ہیں ''میڈیا سے کچھ نہ چھپایا جائے۔'' اگر صدر مشرف کو معلوم ہے کہ آپریشن کے وقت جامعہ حفصہؓ میں موجود سینکڑوں طالبات پر کیا گزری اور اُن کی لاشیں کہاں پڑی ہیں تو وہ خود ہی قوم کو بتا دیں۔

میں نے اشفاق احمد کی ایک زندہ جاوید تحریر پڑھی تھی جو انہوں نے اپنی والدہ ''سرداراں بیگم'' کے بارے میں لکھی تھی۔ سرداراں بیگم اپنے کسی کارخیر، کسی بھلائی، کسی ہمدردی کا صلہ نہ چاہتی تھیں۔ اشفاق نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا تھا کہ مرنے کے کچھ ہی دن بعد ہم سب بھائی بہن قبرستان گئے تو قبر تلاش نہ کر سکے۔ ماں نے اپنی قبر ہی کہیں چھپالی تھی کہ ہمیں بار بار یہاں آنے، پھول چڑھانے، فاتحہ پڑھنے کی زحمت نہ ہو۔ غازی عبدالرشید کی عفت مآب ماں تو قبر میں جانے سے پہلے ہی گم ہو گئی۔ وہ جو عمر بھر سخت پردے میں رہی نہ جانے اُس کی میت کن ہاتھوں میں ہے؟ اُس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟ اُسے قبر سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں جو اسلام تو درکنار بنیادی تہذیبی اقدار کو بھی بے دردی کے ساتھ پامال کر رہے ہیں؟

پاکستان میں بیٹھا کوئی ایک شخص بھی اس جھوٹ پر یقین کرنے پر آمادہ نہیں کہ کوئی بچہ، کوئی خاتون اس خونی آپریشن کی نذر نہیں ہوئے۔ ایک نہ ایک دن یہ راز کھل ہی جانا ہے۔ ایسے بھید تو آسمان کا سینہ شق کر دیتے ہیں۔ کوئی کب تک چھپائے گا؟ لاشیں کہاں ہیں......؟ کے سوال کی گونج بڑھتی اور پھیلتی جائے گی، پھیلتی جائے گی۔ وہ دن دُور نہیں جب لاشیں چھپانے والے خود بول اُٹھیں گے...... کیا اب پاکستان میں بھی صدام حسین اور ملازوچ جیسی اجتماعی قبریں دریافت ہوں گی؟ یہ عہد روشن خیال ہمیں کہاں لیے جا رہا ہے؟

میں یہاں تک لکھ پایا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ غازی عبدالرشید کی بہن نبیلہ کی آواز شدت غم سے ٹوٹ رہی تھی۔ ''ان لوگوں نے ہماری امی کو چھپا دیا ہے...... خدا کے لیے ان سے کہیں کہ اُن کی میت تو دے دیں۔ ہم اپنی شہید ماں کے ماتھے پہ بوسہ تو دے سکیں۔ اُن کا چہرہ تو دیکھ سکیں۔ ہم نہتی لاچار سی عورتیں اتنی طاقت ور حکومت کا کیا بگاڑ یں گی...... کیا ان لوگوں کی مائیں نہیں؟ کیا انہیں اندازہ نہیں کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے؟'' غازی شہید کی بڑی بہن عائشہ نے کہا...... ''غازی نے آخری بار مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا...... عائشہ باجی! ایک وعدہ کرو، آخری وعدہ، امی شہید ہو گئی ہیں۔ میں بھی اب کسی لمحے شہید ہو جاؤں

گا۔ وعدہ کرو تم لوگوں نے رونا نہیں۔ غم نہیں کرنا، خوش ہونا ہے۔'' میری ہچکیاں بندھ گئیں اور میں نے کہا
''غازی! اپنی بہنوں سے اتنا بڑا وعدہ تو نہ لو......''

مولانا عبدالعزیز کا اکلوتا بیٹا، بیس سالہ حسان بھی شہید ہو چکا ہے اور اس وقت تک اُس کی لاش ورثا کو نہیں دی گئی۔ غازی عبدالرشید کے تین بیٹے اور ایک بیٹی جانے کہاں ہیں؟ وہ باپ کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ لیکن ان بچوں اور خواتین کی لاشیں کہاں گئیں جو آخری لمحے تک جامعہ حفصہؓ میں تھیں؟ کیا عدالت عظمیٰ کوئی کمیشن بنائے گی جو اس سانحے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے۔ جو بتائے کہ خونی آپریشن کس کی رعونت کو آسودگی بخش گیا؟ کس نے اپنی انا کی کلغی اُونچی رکھنے کے لیے مفاہمت کی آخری کوشش کو سبوتاژ کر دیا؟ دفن کر دیئے جانے والوں کو کہاں غسل دیا گیا؟ نماز جنازہ کہاں پڑھی گئی...... اور سب سے اہم بات یہ کہ جدید آتشیں ہتھیاروں کا لقمہ ہو جانے والی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی لاشیں کہاں ہیں؟

[15-07-2007]

---

# سانحہ در سانحہ

دیوار و در گنگ ہوتے ہیں۔ اگر وہ زبان رکھتے اور اگر وہ بول پاتے تو لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ کی چھلنی دیواریں، زخم خوردہ چھتیں، جھلسے ہوئے دروازے، پگھلے ہوئے دریچے اور ادھڑے ہوئے فرش ایسی کہانیاں سناتے کہ پتھروں کے سینے بھی شق ہو جاتے۔ اب کوئی نہیں بتا سکے گا کہ آپریشن کے وقت وہاں کتنے لوگ موجود تھے؟ کتنے دنوں سے روٹی کا ایک نوالہ اور پانی کا ایک قطرہ اُن کے منہ میں نہیں گیا تھا؟ سب کچھ لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ کے در و دیوار ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن وہ بول نہیں سکتے۔

مسجد حفصہؓ سے متصل گندے نالے میں ڈھیر کر دی جانے والی باقیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظلم و شقاوت جب ایک خاص انتہا کو پہنچتی ہے تو نہ صرف دل پتھر کے ہو جاتے ہیں بلکہ فہم و فراست پر بھی پانی پڑ جاتا ہے۔ طاقت کی نفسیات ریاستی و حکومتی اہلکاروں کو اس احساس سے بھی محروم کر دیتی ہے کہ تہذیب بھی کچھ قرینے رکھتی ہے اور اخلاقی اقدار بھی سلیقہ مانگتی ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں جنہیں ریاستی انتقام کی آتش غیظ و غضب میں بھسم ہو جانے والوں کی باقیات کو سمیٹنا اور سنبھالنا بھی نہیں آیا؟ سی ڈی اے کے چیئرمین کامران لاشاری اور اسلام آباد کے ڈپٹی کمشنر چودھری محمد علی اتنے ہی بے ہنر ہیں کہ ایسا حساس کام انہوں نے خاکروبوں کے حوالے کر دیا؟ پاکستان کے لوگ اس خبر سے لرز گئے کہ سیکٹر جی سیون کے بیچوں بیچ بہنے والے غلیظ نالے کے کنارے بھاری مقدار میں وہ ملبہ پڑا ہے جو جامعہ حفصہؓ سے نکال کر یہاں پھینک دیا گیا۔ اس ملبے میں قرآن کریم کے آدھ جلے اوراق، احادیث نبوی ﷺ کی پھٹی کتابیں، طالبات کی دریدہ کاپیاں، قلم، پنسلیں، کتابیں، رحل، امتحانی پرچے، ٹوٹے ہوئے برتن، بچوں کے کھلونے، خون آلود کپڑے، بالوں کے کلپ، دوپٹے، چادریں، برقعے، پرس، جوتے، لواحقین کو لکھے گئے خطوط، وصیت نامے اور ذاتی اشیا کے انبار تھے۔ اس انبار میں طالبات کی کٹی ہوئی اُنگلیاں، جسم کے مختلف اعضا، کھوپڑیوں کے ٹکڑے اور خون آلود کپڑے بھی تھے۔ جمعہ کی صبح جی سیون کے مکینوں نے یہ منظر دیکھا تو خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی۔ لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ وہ رو رہے تھے۔ بوڑھی خواتین زاری کر رہی تھیں۔ لوگ کتاب مقدس اور کتب احادیث کے اوراق سمیٹ رہے تھے۔ انسانی اعضا الگ کر رہے تھے۔ پھر مقامی انتظامیہ کو خبر ہوئی۔ اطلاع ہے کہ سارا ملبہ چار بڑے ٹرکوں میں بھر کر ایچ سیون کے جنگل میں پھیلا دیا گیا۔

یہ سب کیا ہے؟ اہل پاکستان کے جذبہ و احساس سے بیگانگی؟ پرلے درجے کی بے حکمتی؟ شرمناک

سنگ دلی؟ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ کیا یہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سولہ کروڑ انسانوں کے جذبات سے کھیل رہے ہیں؟ دوسروں کو انتہا پسندی کا طعنہ دینے والا یہ بندوبست کیسی بے رحم اور انسانیت سوز راہوں پہ چل نکلا ہے؟ سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جامعہ حفصہؓ اور لال مسجد آپریشن شروع ہی سے انتشار، خلفشار اور بکھراؤ کا شکار تھا۔ ربط و اشتراک کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کسی کو خبر نہیں کہ اس کی نگہبانی اور منصوبہ بندی کس کے ہاتھ میں تھی۔ صدر مشرف، وزیر اعظم شوکت عزیز، وزیر داخلہ، وزیر مذہبی اُمور، چودھری شجاعت حسین، انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کرتا دھرتا، کور کمانڈر، ڈی جی رینجرز اور نہ جانے کون کون اکھاڑے میں اُترے ہوئے تھے اور اپنا اپنا ہنر آزما رہے تھے۔ یہ تاثر بجا ہے کہ اپنے آپ کو دہشت گردی کی جنگ کا جانبار سپاہی ثابت کرنے والا ''بندوبست'' لال مسجد کے معاملے کو اپنے اہداف و مقاصد کے لیے اُچھالتا رہا۔ آخر خوں آشام آپریشن کا محرک بھی یہی حکمت عملی تھی کہ امریکہ کو اپنی وفاؤں کا یقین دلایا جائے۔ توقع کے عین مطابق صدر بش اور مغرب نے شاباش دی۔ بش نے اس آپریشن کو ''وار آن ٹیرز'' کا حصہ بتایا۔ 75 کروڑ ڈالر کی قسط کے اجرا کی نوید دی گئی۔ رچرڈ باؤچر نے مسرت سے سرشار لہجے میں کہا ''صدر مشرف نے لکیر عبور کر لی ہے اور اب وہ واپس نہیں آسکتے۔''

یہ سب کچھ بجا لیکن اس بھرے پرے بندوبست میں کوئی نہ تھا جو کم از کم انسانی اقدار ہی کا واسطہ دیتا؟ کیا قتل عام کے بعد معاملات کو زیادہ سنجیدگی، زیادہ عمدگی اور زیادہ فراست سے سنبھالا نہیں جا سکتا؟ وہ کون بے حمیت لوگ تھے جو مولانا عبدالعزیز کو پی ٹی وی لے گئے اور انہیں برقع پہنا کر فلم بندی کی؟ ایسا کس کے ایما، کس کے حکم پر ہوا؟ اس فلم کا ہدایت کار کون تھا؟ یہ مکروہ فلم کس کے حکم پر چلوائی گئی؟

آپریشن کی خوں آشامی سے قطع نظر، انسانی حوالے سے ایک ایسی دل خراش کہانی لکھی جا رہی ہے جو موجودہ بندوبست کے نامۂ اعمال کا سیاہ ترین ورق بن جائے گی۔ کوئی نہیں جانتا کتنے لوگ اس آپریشن کی نذر ہو گئے۔ جاں بحق ہونے والی خواتین اور بچوں کی مصدقہ تعداد اب تک سامنے نہیں آسکی۔ برآمد ہونے والی لاشوں کو جلد بازی میں دفنا دیا گیا۔ میڈیا نہ دیکھ پایا کہ انہیں کفن بھی پہنائے گئے یا نہیں؟ نماز جنازہ بھی پڑھی گئی یا نہیں؟ الم نصیب والدین اور لواحقین اسلام آباد کی سڑکوں پر رُل رہے ہیں۔ کوئی بتانے والا نہیں کہ اُن کے جگر گوشے زندہ بھی ہیں یا شہید ہو چکے ہیں۔ پولی کلینک سے پُراسرار انداز میں غائب ہو جانے والی ساٹھ طالبات کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ جن طلبا سے کہا گیا تھا کہ وہ ''سرنڈر'' کر دیں اور انہیں پانچ پانچ ہزار روپے دے کر گھروں کو بھیج دیا جائے گا، انہیں اڈیالہ جیل میں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ تقریباً سب کے سب بھیانک مقدمات میں ملوث کر دیئے گئے ہیں۔ ہسپتالوں میں پڑے شدید زخمی طلبا کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا ہے۔ غازی برادران کی والدہ کی لاش دو ہفتے گزر جانے کے بعد بھی نہیں مل سکی۔ سپریم کورٹ کے واضح حکم کے باوجود مولانا عبدالعزیز اور اُم احسان کو اپنے جواں سال بیٹے

کی تجہیز و تکفین میں شامل نہیں ہونے دیا گیا۔ مولانا عبداللہ شہید کی عفت مآب بیٹیاں جنہیں کبھی آسمان نے بھی آنکھ بھر کے نہیں دیکھا تھا، دہشت گردی کی عدالتوں میں ٹھوکریں کھا رہی ہیں۔ خود آپریشن کی تفصیلات پُر اسراریت کے دبیز پردوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ جامعہ حفصہؓ کے کھنڈر ابھی تک لاشیں اُگل رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ آپریشن کے دوران نہایت ہی بے دردی سے فاسفورس کا استعمال کیا گیا جس کی زد میں آنے والے انسان راکھ ہو گئے۔ کنکریٹ کے فولادی ڈھانچے تک پگھل گئے۔ اس سب کچھ کو چھپانے کے لیے جامعہ حفصہؓ کو فوری طور پر منہدم کیا جا رہا ہے تاکہ تمام آثار معدوم ہو جائیں، تمام شواہد مٹ جائیں۔

سپریم کورٹ کو بلا تاخیر ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم کرنا چاہیے۔ فوری طور پر حکم جاری کیا جانا چاہیے کہ جامعہ کو نہ گرایا جائے۔ عدالت عمارتی ڈھانچے کو اپنی تحویل میں بھی لے سکتی ہے۔ بلاشبہ یہ قومی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ ہے جس سے چشم پوشی اس سے بھی بڑا سانحہ ہوگا۔

در و دیوار گنگ ضرور ہوتے ہیں لیکن ان پر پہ رقم ہو جانے والی کہانیاں پڑھی جا سکتی ہیں۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

کیا ہی اچھا ہو کہ عدالت عظمیٰ اپنی آزادی اور حیات نو کے سفر کا آغاز اس سانحے کی ہمہ پہلو تحقیقات سے کرے تاکہ پاکستانی قوم جان سکے کہ "انتہا پسندی" زیادہ وحشت ناک ہوتی ہے یا "روشن خیالی"۔!!

[24-07-2007]

---

# فقط ایک ہی تصویر......!

لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ کے در و دیوار پہ رقم ہونے والی لرزہ خیز کہانی کو بیس دن ہو چلے۔ میں شعوری طور پر کوشش کر رہا ہوں کہ ذہن میں چنگاریاں سلگانے اور دلوں میں چھید کر دینے والی اس کہانی کو بھول جاؤں۔ خود کو فریب دینے اور اپنے آپ سے آنکھیں چرانے کے لیے بہانے تراشتا رہتا ہوں لیکن جونہی معمول کے دھندوں سے فراغت ملتی ہے، گرد و پیش کی چہل پہل ماند پڑ جاتی ہے اور میں آسودگی کی چند ساعتوں کی تلاش میں اپنے بستر پر نیم دراز سا ہوتا ہوں، یکا یک تیز آندھی کا ریلا کھٹاک سے میرے دل و دماغ کے سارے دروازے سارے دریچے کھول دیتا ہے اور جامعہ حفصہؓ میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ میں سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ لیکن جامعہ کی چھلنی دیواریں، جھلسے ہوئے دروازے، خون میں لت پت فرش، جلی ہوئی لاشیں اور دُھواں اُگلتی باقیات کے نقوش اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ پھر قرآن کریم کی تلاوت کا شیریں نغمہ میری رُوح سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ ایک مرمریں سا ارتعاش، ٹھنڈے میٹھے چشمے کے پانی کی طرح میری نس نس کی تشنگی بجھانے لگتا ہے۔ پھر مجھے علامہ اقبال کی ایک فارسی رُباعی یاد آتی ہے جو انہوں نے مسلم بیٹیوں کے لیے کہی تھی اور جس کا اشارہ حضرت عمر فاروقؓ کی عظیم بہن فاطمہؓ کی تلاوت قرآن کی طرف تھا، جسے سن کر حضرت عمرؓ ایمان لے آئے تھے۔

زشام ما بروں آور سحر را
زقرآں بازخواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرأتِ تو
دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

اسلام کی ایک بیٹی کی پُر سوز تلاوت نے عمر فاروقؓ جیسے انسان کی تقدیر بدل ڈالی تھی۔ یہاں تو سینکڑوں ہزاروں بیٹیاں صبح و شام اللہ کے کلام کی قرات میں مگن رہتی تھیں۔ میں جامعہ حفصہؓ کے آنگن، ڈیوڑھی، دالان، حجروں اور کمروں سے آتی اُن نورانی صداؤں کے سحر میں کھو جاتا ہوں۔ پھر کان کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکوں کی آوازیں آتی ہیں۔ خود کار ہتھیاروں کی لگا تار فائرنگ گونجتی ہے۔ تلاوت کی آوازیں چیخوں، آہوں اور زاریوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ پھر میں کسی بحر متلاطم میں غوطے کھانے

لگتا ہوں اور سب کچھ بکھر جاتا ہے۔

دل نہیں مانتا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ کم وبیش بیس دن گزر جانے کے باوجود ابھی تک یہ سب کچھ ڈراونا خواب لگتا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اپنے بیٹوں اور اپنی بیٹیوں کو اس سفا کی کے ساتھ قتل کرنے کا خیال کس کے ذہن میں پھوٹا، کس نے یہ سب کچھ کر گزرنے کا حکم دیا اور کون تھے جو یہ سب کچھ کر گزرے؟ کیا اس بے چہرہ بندوبست کو اندازہ ہے کہ اس نے اہل پاکستان کے دلوں پر کتنا کاری زخم لگایا ہے؟

میرے سامنے فوج کے ایک سابق سپہ سالار جنرل (ر) مرزا اسلم بیگ کا مضمون ہے۔ یہ مضمون متعدد اخباروں میں شائع ہو چکا ہے، اس لیے اس کے مندرجات دہرائے جاسکتے ہیں۔ جنرل صاحب کہتے ہیں:۔

"کیا فوج اور پاکستانی عوام کے نظریات اور ان کی سوچ کے درمیان ہم آہنگی باقی نہیں رہی؟ کیا وہ عبرتناک منظر ہماری قومی سوچ سے عبارت ہے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب ہمارے کمانڈوز کام مکمل کر کے جامعہ حفصہؓ سے نکلے تو اُن کے ہاتھوں سے بے گناہ اور معصوم بچوں کا خون ٹپک رہا تھا لیکن اُن کے چہروں پر ملال کے بجائے فتح وکامرانی کی چمک تھی اور اُن کے ہاتھ وکٹری کا نشان بنا رہے تھے۔ کیا واقعی ہماری فوج نظریاتی ٹکراؤ کا حصہ بن چکی ہے؟ یہ وہ تکلیف دہ منظر ہے جو ایک سوال بن کر ہمارے دل ودماغ پر ہتھوڑے برسا رہا ہے اور جواب کا منتظر ہے۔"

جنرل اسلم بیگ اِسی "شجر طیبہ" کی شاخ رہے ہیں۔ وہ ایسی باتیں لکھ سکتے اور ایسے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم افتادگان خاک کہاں جائیں؟ کس کا دامن پکڑیں؟ کس کی زنجیر عدل ہلائیں؟ کس سے خون بہا مانگیں؟

آج صبح اخبارات اُٹھائے تو مریم کی کہانی نے رُلا دیا۔ بی بی سی ڈاٹ کام کو قیامت کے رُوز وشب کی داستان سناتے ہوئے مریم نے دو معصوم بچیوں کا ذکر کیا ہے۔ "ہمارے ساتھ دو چھوٹی بچیاں تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ہمارے ابو نشہ کرتے ہیں اور امی، آنٹی کے ساتھ رہتی ہیں ور کپڑے وغیرہ سیتی ہیں۔ فارغ ہونے کے باوجود یہ دونوں بہنیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ انہیں بھوک بھی نہیں لگتی تھی۔ آنسو گیس کے گولے چلتے تو بھی یہ سکون سے سوئی رہتیں۔ ہم لوگ بے ہوش ہو جاتے، انہیں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے کبھی نہ کہا کہ بھوک لگی ہے۔ کبھی ضد نہ کی کہ ہمیں کچھ کھانے کو دو۔ کبھی اس بارے میں کوئی بات ہی نہ کی......"

میں نے ان دونوں بچیوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ جانے اُن کی لاشیں کہاں ہیں؟ بتایا جاتا ہے کہ بچوں

اور عورتوں کی ساری لاشیں کوئلہ بن گئیں۔ کچھ بھی شناخت کے قابل نہیں رہا۔ نہ معلوم وہ کہیں کسی شکل میں ہیں بھی یا کوئلے اور کوڑے کباڑ کے ڈھیر کا حصہ بن گئی ہیں۔ آج ہی کی خبر ہے کہ جناب اعجاز الحق لال مسجد میں نماز عصر ادا کرنے گئے اور صحافیوں کو جامعہ حفصہؓ کے کھنڈروں پہ نظر ڈالنے کا موقع مل گیا جہاں اب بھی ایک ادھ جلی جانماز اور پلاسٹک کی ایک گڑیا پڑی تھی۔ ممکن ہے یہ گڑیا اُن دونوں بہنوں میں سے کسی ایک کی ہو۔ ممکن ہے وہ اسی کے لیے آپس میں لڑتی ہوں۔ گہری نیند سونے والی وہ دونوں کم نصیب بچیاں ہمیشہ کی نیند سو گئیں۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا لیکن جانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے اُن کی شکلیں بھی میری دونوں بیٹیوں جیسی تھیں۔ جیسے انہیں بھی بھوک لگتی ہو گی لیکن بے پناہ غربت اور حالات کی سنگینی نے انہیں صابر شاکر بنا دیا ہو گا۔ وہ سو تھیں، یا دو سو یا ہزار سے زائد۔ وہ سب ہماری بیٹیاں تھیں۔ اُن کا دُکھ کم ہوتے ہوتے ہو گا، زخم بھرتے بھرتے بھرے گا۔ معلوم نہیں اُن دو بچیوں کی راکھ جی سیون کے نالے میں بہہ گئی یا مارگلہ کی شاداب پہاڑیوں سے آتی ہوائیں اُس راکھ کو کسی پوٹلی میں باندھ کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ یہ راکھ اپنا انتقام ضرور لے گی۔

علامہ نے جنگ طرابلس میں مسلمان مجاہدین کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو جانے والی نوعمر بچی فاطمہ کی شہادت کے حوالے سے کہا تھا:۔

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

جامعہ حفصہؓ میں تو کتنی ہی فاطمائیں، معصوم فاختاؤں کی طرح بھون ڈالی گئیں۔ اُن کی تو کوئی تربت ہی نہیں۔ اگر ہوتی بھی تو اس کے ہنگامے شاید ہی کسی ''قوم تازہ'' کی تخلیق کرتے۔ اگر اس قوم میں تازگی اور زندگی کی کوئی رمق ہوتی تو کس کی مجال تھی کہ دن دہاڑے جامعہ حفصہؓ کو قتل گاہ بنا دیتا۔ قاضی حسین احمد کا بیان آیا کہ اگر ایک ہزار علماء بھی اسلام آباد لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ کے سامنے جمع ہو جاتے تو یہ المیہ پیش نہ آتا۔ اب کوئی کس سے سوال کرئے کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔ جب لال مسجد کی بستی کرفیو میں جکڑی ہوئی تھی اور بارود کی گھٹائیں برسنے کو تھیں، تب علمائے کرام کہاں تھے؟

میں دو بچیوں کی کہانی سے توجہ ہٹانے کے لیے ایک اور اخبار اُٹھاتا ہوں تو نگاہیں ایک تصویر پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ یہ تصویر بھی جامعہ حفصہؓ کے ملبے کی ہے۔ اینٹ روڑوں کے ساتھ کسی طالبہ کے لمبے لمبے بال لپٹے ہوئے ہیں۔ اس کا سر اور کھوپڑی نہ جانے کہاں ہوں گے؟ کیا یہ سب کچھ رائیگاں چلا جائے گا؟ کیا ان یتیم اور بے بس و لاچار بچیوں کا خدا کوئی نہیں؟ دل سے اُٹھتی ٹیسوں کو تسلی دیں تو ایک نیا منظر آنکھوں میں دہکتی سلائیاں پھیرنے لگتا ہے۔ یہ ہم کس بستی میں آ گئے ہیں؟ یہ کیسے منظر ہمارا مقدر

ہو گئے ہیں؟

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا

[28-07-2007]

---

# ہمیں معاف کر دو......!

آہ یہ عہد خوں رنگ!!

انسانی لہو سے سیرابی و شادابی حاصل کرنے والا یہ عہد کب ختم ہوگا؟ شدت کرب سے لوگوں کے دل پھٹے جا رہے ہیں؟ گریہ و زاری کی سکت جاتی رہی۔ آنکھیں روتے روتے پتھر ہوگئیں۔ خلق خدا حیران ہے، دل کو روئے یا جگر کو پیٹے، اور اب تو کوئی نوحہ گر ملنا بھی میسر نہیں جسے ماتم کرنے کے لیے ساتھ رکھا جائے۔ سب سے اُونچی چوٹی پہ کھڑا شخص طعنہ دے رہا ہے "دیکھو میری پالیسیاں جاری ہیں۔" آج اُس کا دل اور بھی آسودہ ہوگا کہ اُس کی پالیسیوں کے بطن سے وہی نتائج پھوٹ رہے ہیں جو اُس کی آرزوؤں میں بسے رہتے ہیں۔

اسلام آباد میں کل جن کا لہو بہا، وہ سب میرے تھے۔ پولیس کی وردی والے بھی اور عام شہری بھی۔ سب اللہ اور اُس کے رسول مقبول ﷺ کا کلمہ پڑھنے والے تھے۔ وہ اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے تھے۔ اپنے بال بچوں کے لیے رزق روزی کی خاطر سرکار کی نوکری کر رہے تھے۔ سب معصوم، سب بے قصور تھے۔ ان کا خون بہانے سے نہ اسلام کا چہرہ گل رنگ ہوا، نہ شہدائے لال مسجد کی رُوحوں کو آسودگی ملی۔ نہ وہ خالق ارض و سما راضی ہوا جو ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل کہتا ہے۔ اس خونیں واردات نے پُر امن شہدائے لال مسجد کانفرنس کا تاثر زائل کر دیا۔ اُس اعلامیے کو بے رُوح کر دیا جس سے ایوانوں میں زلزلہ بپا ہو جاتا۔ اُس جذب وجنوں پر منوں مٹی ڈال دی جو کانفرنس کے دوران پنڈال میں دہک رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی کچھ پتا نہیں چلے گا کہ قاتل کون ہے؟ ہمیشہ کی طرح اب بھی سارا الزام کسی مفروضہ خودکش پہ تھوپ دیا جائے گا جس کا سر مل گیا اور دھڑ غائب ہوگیا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی اُس کا رشتہ "وار آن ٹیرر" سے جوڑ دیا جائے گا؟ وابستگان سرکار و دربار لگی لپٹی رکھے بغیر اس کے ڈانڈے لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ سے جوڑ دیں گے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی قاتل اندھیروں میں گم ہو جائے گا۔

انسانیت کشی جرم ہے۔ اس کا ارتکاب جس کسی نے بھی کیا اُسے کیفر کردار تک پہنچایا جانا چاہیے۔ کسی کو ایسے گروہ یا فرد سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو معصوم انسانوں کی زندگیوں سے کھیلے۔ لیکن یہ کام پولیس کے بس کا نہیں۔ یہ کام مخصوص ذہن رکھنے والے کسی سرکاری ادارے کا نہیں۔ یہ کام وہ محب وطن اور دیانت دار ماہرین کر سکتے ہیں جو ریٹائرمنٹ کی زندگیاں گزار رہے ہیں اور جنہیں تعریفی سندات، نقد انعامات، سنہری تمغوں اور ترقی درجات کی ضرورت نہیں۔ کیا سولہ کروڑ کی قوم میں ایسے چار، چھ افراد نہیں

مل سکتے جنہیں کامل اختیار دیا جائے کہ وہ جس سے چاہیں پوچھ گچھ کریں لیکن قاتل کو بے نقاب کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا اور اب بھی معاملہ کمال شاہ کے کمال فن پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو یقین جانیے اس بھیانک واردات کا تانا بانا بننے والے کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

واردات کی تفتیش کے لیے سب سے اہم اور پہلا نکتہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا فائدہ کسے ہوا یا اس کا نقصان کسے پہنچا؟ کم از کم شہدائے لال مسجد کانفرنس کو اس کارتی برابر فائدہ نہیں پہنچا اور تمام تر نقصان اُن کے حصے میں آیا۔ اُن کی اتنی محنت وریاضت سے منعقدہ عظیم الشان شہدا کانفرنس پس منظر میں چلی گئی۔ ہر مکتب فکر کے علماء کی تقاریر اخبارات میں نمایاں جگہ نہ پاسکیں۔ مستقبل کی حکمت عملی کے حوالے سے اُن کا پُرعزم اعلامیہ بے رنگ و بو ہو کر رہ گیا اور اُن کی بھرپور تگ ودو کے سارے اثرات پھیکے پڑ گئے۔ سو جس کسی نے بھی یہ کام کیا کم از کم وہ فکر لال مسجد کا ہمدرد و ہم نوا نہیں ہوسکتا۔ یہ پہلو تو اب بھلا ہی دیا گیا ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے اُس پار دہشت گردی اور تخریب کاری کے کتنے ''کارخانے'' قائم ہو چکے ہیں جو بھارت، اسرائیل اور افغان انتظامیہ کی سرپرستی میں ڈبل شفٹ پر کام کر رہے ہیں۔ پاکستان میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے والے حقیقی مجرموں کی حوصلہ افزائی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امریکی خوف کی وجہ سے پرویز مشرف بھارت، اسرائیل اور کرزئی کا نام لینے سے ڈرتے ہیں۔ اب بھی موصوف نے حکم صادر فرمایا ہے...... ''اِن کو مارو۔'' یہ ''اِن'' کون ہیں؟ صدر مشرف کے مطابق یہ صرف وہ لوگ ہیں جن کے چہروں پہ داڑھیاں اُگی ہیں۔ جن کے سروں پہ پگڑیاں ہیں اور جو امریکہ مردہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں۔

گزشتہ روز میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہ کالم جامعہ حفصہؓ کی اُن معصوم بچیوں کی نذر کروں گا جو اندھی اور سفاک بربریت کی بھینٹ چڑھا دی گئیں۔ یہ کالم میں لال مسجد کے اُن شہدا کی نذر کروں گا جو شرمناک درندگی کا نشانہ بن گئے۔ میں اُن قیامت آثار دنوں اور راتوں کو یاد کروں گا جب ایک مسجد اور ایک دینی مدرسے میں محفوظ میرے بیٹے اور بیٹیاں امریکی خوشنودی کی ڈور میں بندھی ایک کٹھ پتلی کی خونخواری کا رزق ہو گئیں۔ جامعہ حفصہ کی بچیوں کی یاد آتی ہے تو سینے میں انگارے سے دہک اُٹھتے ہیں۔ اُن میں سینکڑوں ایسی تھیں جو آزاد کشمیر کے زلزلے میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی تھیں۔ نہ ماں رہی نہ باپ، نہ بھائی، نہ سر پہ دست شفقت رکھنے والا کوئی سرپرست۔ جامعہ حفصہؓ نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ایک آفت سے زندہ بچ نکلنے کے بعد ایک بڑی آفت اُن کے انتظار میں ہے۔ 3 جولائی کو آپریشن شروع ہوا اور ہفتہ بھر بعد تمام ہو گیا۔ کاش جامعہ حفصہؓ کی جھلسی ہوئی دیواروں کی کسی اینٹ کو زبان مل جاتی، کاش جلی ہوئی چوکھٹوں کی کوئلہ ہو جانے والی کوئی لکڑی بول اُٹھتی، کاش اُن بچیوں کی نرم نازک کلائیوں میں گھومتی چوڑیوں کے کانچ کا کوئی ٹکڑا قوت گویائی پالیتا، کاش کپڑے کی چھوٹی چھوٹی دھجیوں سے بنی ہوئی گڑیا ہمیں بتا سکتی کہ قرآن مجید کی تلاوت اور درود و سلام میں مگن اُن بچیوں کو کتنے

دن کھانا نہیں ملا، کتنے دن وہ پانی کے ایک ایک گھونٹ کو ترستی رہیں، قیامت کی ان گھڑیوں میں وہ ایک دوسرے سے کیا باتیں کرتی تھیں، کس طرح ایک دوسرے کو تسلیاں دیتی تھیں، کیا مسلسل بھوک اور پیاس سے وہ نڈھال ہو چکی تھیں؟ جب فاتحین کے قدموں کی آہٹیں اور خودکار مشینوں کی فائرنگ کی آوازیں اُن کے کانوں تک آئیں تو انہوں نے کس کس کو پکارا ہوگا؟ کس کس کو آواز دی ہو گی؟ کس طرح ایک دوسرے سے لپٹی ہوں گی۔ اپنے ناتواں قدموں سے کس طرف کو دوڑی ہوں گی؟ اور جب فاسفورس کے بموں کے بھڑکتے شعلے اُن کے نحیف جسموں تک پہنچے ہوں گے تو بے پناہ خوف و دہشت سے اُن کے معصوم چہرے کس رُوپ میں ڈھل گئے ہوں گے......؟؟؟

''اسلامی جمہوریہ پاکستان''......!! جہاں اس صدی کے سب سے ہولناک جرم کی کوئی ایف آئی آر بھی نہیں کٹ سکی، جہاں تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ اس ظالمانہ اقدام کا حکم کس نے جاری کیا؟ جہاں آج تک یہ بھی تعین نہیں ہو سکا کہ جل کر بھسم ہو جانے والی بچیوں کی تعداد کتنی تھی؟ جہاں آج تک غازی عبدالرشید شہید اور مولانا عبدالعزیز کی والدہ کی میت نہیں ملی؟ دوسرے دن بلڈوزر چلا دیئے گئے۔ بچی کھچی ہڈیاں گندے نالوں میں بہادی گئیں......فتح مکمل ہوگئی۔ ایک سال تمام ہوگیا، خونیں کھیل کا تانا بانا بننے اور حکم صادر کرنے والے بدستور تخت حکمرانی پہ فروکش ہیں۔ مولانا عبدالعزیز ابھی تک جیل میں پڑے ہیں اور بدد ُعاؤں کا مارا ہوا ''عہدِ خوں رنگ'' پیہم انسانوں کا لہو پی رہا ہے۔

جنت کے جھروکوں سے جھانکتی جامعہ حفصہؓ کی معصوم بچیوں کی پاک باز رُوحو! ہمیں معاف کر دو۔ ہم تم سے شرمندہ ہیں۔ لازم تھا کہ تمہارے ساتھ ہم بھی بھسم ہو جاتے لیکن ہم بزدل نکلے۔ ہم سنگ دل نکلے۔ ہمیں معاف کر دو...... مجھے یقین ہے کہ تم نے معاف نہ کیا تو آگ، بارود اور لہو کا کھیل کبھی ختم نہیں ہوگا......ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی......ہم کبھی آسودگی نہ پاسکیں گے۔

[08-07-2008]

---

# آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

لاریب ساری دنیا کی مائیں ایک سی ہوتی ہیں۔ یقیناً وہ بھی ساری دنیا کی ماؤں جیسی ہی ہوگی لیکن وہ میری ماں تھی۔ پہلا بیٹا ہونے کے ناتے مجھے اُس کے دامانِ شفقت میں رہنے کا سب سے زیادہ موقع ملا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو گاؤں کے کچے گھر میں بسیرا کیے غربت کے میلے میلے سے صبح و شام میں اُسے مشقتوں میں جکڑے دیکھا۔ وہ چکی پیستی، برتن مانجھتی، گیلی لکڑیوں کو پھونکیں مار مار کر ہانڈی بناتی، تنور میں روٹیاں لگاتی، کمرے کا فرش لیپتی، دیواروں کو ''پوچا'' لگاتی، کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھا کر گاؤں کی ندی پر دھونے جاتی، میرے لیے کپڑے کی ''لیروں'' سے گیند بنا کر اُس پر سرخ دھاگے کے چوکور خانے بناتی، مجھے راستہ بھول کر جادونگریوں میں کھو جانے والے شہزادوں کی کہانیاں سناتی، صبح دم مجھے جگاتی، منہ ہاتھ دھلواتی، سکول جانے کے لیے تیار کرتی، گھی میسر ہوتا تو پراٹھا، نہ ہوتا تو خشک روٹی بنا کر اُس میں کبھی انڈا، کبھی آم کے اچار کی پھانک اور کبھی پیاز رکھ کر کپڑے کی ایک دھجی میں باندھ کر ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ رُخصت کرتی۔ وہ طلب، حرص، آرزو، خواہش اور تقاضے کے آشوب سے پاک تھی۔ ناآسودگی اعصاب کمزور کر دیتی ہے۔ گھر کو تناؤ، چڑچڑے پن، تند مزاجی اور تلخ نوائی جیسی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ عجب گھر تھا۔ میں نے کبھی اپنے والدین کو برہم نہ دیکھا۔ گالی گلوچ، تو تکار، مارکٹائی گاؤں کے ہر گھر کا کلچر تھا لیکن ہم ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہتے تھے۔ میرے والد نے کبھی میری ماں کو 'تو' یا 'تم' کہہ کے نہیں بلایا۔ میں کبھی کبھی حیران ہوتا تھا کہ والد صاحب بھی امی کو ''آپ'' اور ''تُسیں'' کہہ کے کیوں بلاتے ہیں؟

گاؤں کے بے ڈھب ماحول میں ماں کو دو باتوں کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ایک یہ کہ گلی محلے کے بچوں سے کھیلتے میں کوئی گالی نہ سیکھ لوں اور دوسری یہ کہ میری پڑھائی میں کوئی خلل نہ پڑے۔ رات کو مٹی کے دیے یا لالٹین کی روشنی میں مجھے سکول کا کام کرتے دیکھ کر انہیں بہت خوشی ہوتی۔ مجھے اپنے کچے گھر کے چھوٹے سے صحن میں اُترنے والی سہ پہر اور میری ماں کی آنکھوں میں جھلملا اُٹھنے والی وہ روشنی کبھی نہیں بھولے گی جب میرے چچا نے، جو مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے، میری ماں کو یہ خبر دی کہ مڈل کے امتحان کا فائنل نتیجہ آ گیا ہے اور عرفان پورے ضلع میں اوّل رہا ہے۔ میل ہا میل تک ہائی سکول نہ ہونے کے باعث میری ماں ہجرت کر کے اپنے والدین کے پاس پنڈی آ گئیں کہ میری پڑھائی کا سلسلہ نہ ٹوٹے لیکن میٹرک کے بعد سارے وسائل دم توڑ گئے۔ پھر محنت، مشقت اور تگ و دو کا ایک دشت بے اماں تھا

اور میں، میرے زادِ راہ میں صرف ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی جس میں میری ماں کا یہ خواب بندھا تھا کہ میں نے ہر حال میں پڑھائی جاری رکھنی ہے یا پھر دعاؤں کی ایک سبز رنگ کی چھتری جو صحرا کے اس لمبے سفر میں میرے سر پر تنی رہتی۔ میرے والد نے اس مشن میں میری ماں کا بھرپور ساتھ دیا۔ اپنے لیے کئی مشکلات برداشت کرلیں لیکن ہمارے مستقبل کے حوالے سے ہماری ماں کی آرزوؤں کی راہ میں کبھی کوئی روک نہ لگائی۔ انہیں ایک شاداب کھیت کی آرزو تھی اور ماں کھاد بن کر اس مٹی میں گھلی جا رہی تھی۔

نوکری اور پڑھائی کی متوازی پٹریوں پر چلتے چلتے میں نے ایم اے کیا۔ بی ایڈ کے لیے سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ کامرانی، آسودگی اور تشکر کے ملے جلے احساس سے پھوٹنے والی روشنی کا انعکاس میں نے دوسری بار اُس دن اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھا جس دن میں نے ''پاکستان ٹائمز'' کا پرچہ انہیں دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ خبر دیکھیں، آپ کے بیٹے نے پنجاب یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ پھر رحمت کے باب کھل گئے، دن پھرنے لگے۔ میرے بعد میرے بھائیوں اعجاز، انعام، شاہد، طاہر اور اکلوتی بہن تسمیہ، سب نے ماں کی متعین کردہ راہوں پر چلتے چلتے تعلیم بھی حاصل کی اور حصول رزق کے محترم وسائل سے بھی بہرہ مند ہوئے۔ 1985ء کے موسم بہار میں ہمارے والد محترم کا انتقال ہوگیا لیکن وہ طمانیت کے اس احساس کے ساتھ رُخصت ہوئے کہ موسم بدل چکا ہے اور صحرا کا سفر، شاداب جزیروں کی ہموار راہوں تک آ گیا ہے۔ گزشتہ اکیس برس کے دوراں ماں، مرکز و محور بنی رہی اور ہمیں گماں تک نہ گزرا کہ ''یتیم'' کیا ہوتا ہے؟ اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پانچوں بھائیوں کے لیے بھی ماں کا درجہ رکھتی تھیں کہ ہمارے نانی چوالیس برس پہلے انتقال کرگئی تھیں اور وہ سب بھائیوں سے بڑی تھیں۔ ہم سب اُن کی رہائش گاہ کو ''مرکز'' کہا کرتے تھے۔

میں ٹھکانے بدلتا ہوا اسلام آباد پہنچ گیا لیکن والدہ کا قیام راولپنڈی میں اپنے بیٹوں انعام اور طاہر کے ساتھ رہا۔ جب تک اُن کی صحت نے اجازت دی، وہ ہفتے عشرے میں ایک آدھ بار میرے ہاں آجاتیں۔ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے جگر کے عارضے نے انہیں نیم جاں کردیا تھا۔ وہ زبردست قوتِ مزاحمت کے ساتھ جگر کے موذی مرض کا مقابلہ کرتی رہیں لیکن ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ گھل رہی ہیں۔ کبھی کبھی بیماری شدت کے ساتھ انگڑائی لیتی اور ہمارے وسوسے بھی بڑھ جاتے۔ میں نے بیرون ملک کے سفر ترک کر رکھے تھے۔ اسلام آباد سے باہر جاتے ہوئے بھی ہول آنے لگا تھا۔ جس طرح وہ ہمیں تھپکیاں دے دے کر سلایا کرتی تھیں اُسی طرح انہوں نے ہمیں ہولے ہولے ایک بڑے صدمے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اکثر میں صبح صبح اپنی فیکس مشین تھیلے میں ڈال کر بستہ اُٹھائے، اُن کے ہاں پہنچ جاتا۔ میں نے سینکڑوں کالم اُن کی چارپائی کی پائنتی بیٹھ کر اس طرح لکھے کہ اُن کے پاؤں میری آغوش میں دھرے تھے۔ تین چار ماہ پہلے تک وہ میرے کالم خود پڑھتیں اور اُن پر تبصرہ کرتیں۔ محدود رسمی تعلیم کے باوجود

اقبال و غالب سے منیر نیازی اور اپنے جدامجد شاہ مراد سے میاں محمد بخش تک انہیں بیسیوں اشعار یاد تھے۔ کچھ دن قبل شاہد لاہور جانے لگا تو اُنہوں نے میاں محمد بخش کا شعر پڑھا:

؎ جا او یار حوالے رب دے، میلے چار دناں دے
اُس دن عید مبارک ہوسی، جس دن فیر ملاں گے

گزشتہ چار پانچ دنوں کے اندر سینکڑوں لوگوں نے مجھ سے تعزیت کی۔ میری ماں کے لیے دعائیں کیں، حرم کعبہ اور مدینہ منورہ میں اُن کے لیے عمرے، طواف اور نوافل ادا کیے۔ پاکستان کے کتنے ہی دینی مدارس میں اُن کے لیے قرآن کریم کے ختم ہوئے اور اس دوران آنے والوں نے ''ماں'' کے عظیم رشتے کے حوالے سے کیسی کیسی باتیں کیں۔ معروف قانون دان چودھری اکرام کہنے لگے...... ''وکالت کے ابتدائی دنوں کا ایک کیس نہیں بھولتا۔ فائل پڑھتے ہوئے میں نے استغاثہ کی کہانی دیکھی کہ ایک نیم پاگل سے بیٹے نے چھری گھونپ کر اپنی ماں کو ہلاک کر دیا۔ یہ وقوعہ گھر میں موجود کئی افراد نے دیکھا لیکن جب شدید ضرب سے جاں بہ لب ماں کی نبضیں ڈوب رہی تھیں اور دل کی دھڑکنیں بیٹھ رہی تھیں تو اُس نے پولیس کو اپنا بیان نزعی قلم بند کراتے ہوئے کہا 'مجھے میرے بیٹے نے نہیں مارا، یہ سب لوگ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں نے خود اپنے آپ کو چھری ماری ہے'۔'' مولانا سید عبدالمجید ندیم تشریف لائے تو کہنے لگے ''میری والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو میں آزاد کشمیر کے کسی دُور دراز علاقے میں تھا۔ خبر ہی نہ ہوئی، لوٹا تو اُن کی تدفین ہو چکی تھی۔ بہن نے بتایا کہ آپ کو یاد کرتی رہیں۔ وفات کے بعد ہم نے ہزار جتن کیے لیکن اُن کی آنکھیں بند نہ ہو سکیں۔ شاید وہ آپ کی راہ دیکھ رہی تھیں۔'' مجھے تین یا چار تعزیت کرنے والوں نے یہ شعر سنایا

؎ ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

وہ گزشتہ دو تین ہفتوں سے ہسپتال میں تھیں۔ عید بھی اِسی حال میں آئی۔ یہ ہم بہن بھائیوں کی پہلی عید تھی کہ ماں نے ہم میں سے کسی کو گلے لگایا، نہ دعائیں دیں نہ عیدی...... یہ پہلی عید تھی جو ہم نے مرکز میں نہ منائی۔ میں جمعرات کے روز سارا دن اُن کے پاس بیٹھ کر رات نو بجے کے لگ بھگ گھر آ گیا لیکن شب بھر سو نہ پایا۔ جمعۃ المبارک صبح سات بجے وہ محبتوں کے سارے رشتے توڑ کر وہاں چلی گئیں جہاں ساری مائیں چلی جایا کرتی ہیں۔

میں نے اُن کی آنکھوں میں اللہ کے بے پایاں احساس تشکر میں بھیگی آخری چمک اُس روز دیکھی تھی جس دن انہوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا کہ ''آج میں شادی کی تقریب میں گئی تو کتنی ہی

عورتیں مجھے ملنے آتی رہیں اور میرا تعارف یوں ہوتا رہا کہ یہ ''عرفان صدیقی کی والدہ ہیں''...... وہ اس پہلو سے بہت خوش بخت تھیں کہ ایک لہلہاتا ہوا چمن چھوڑ کر گئیں۔ ہمیں کوئی حسرت نہ رہی کہ اُن کا اچھے سے اچھا علاج معالجہ نہ کرا سکے اور کوئی ایسی آرزو نہ تھی جو اُن کے ہونٹوں پہ آئی ہو اور اُن کی سعادت مند اولاد نے اُسے پورا نہ کیا ہو۔ انعام، طاہر اور تسمیہ نے اُن کی خدمت کا حق ادا کر دیا اور بلاشبہ انہوں نے مجھ سے کہیں زیادہ سعادتیں سمیٹیں۔

جمعۃ المبارک کی شام ہم نے اپنے والد کی قبر کی پائنتی، چند قبریں چھوڑ کر، اپنی ماں کو منوں مٹی تلے دفن کر دیا۔ سورج، درختوں کے اُس پار، گھروں کے اُوپر سرکتا ہوا اُفق مغرب میں ڈوب رہا تھا کہ ہم نے قبر پر پھولوں کی ایک چادر بچھائی اور گھر کو چلے آئے۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے سورج سوا نیزے پہ کھڑا ہو اور ٹھنڈی چھاؤں کرنے والی سبز رنگ کی چھتری کہیں کھو گئی ہو، جیسے میں لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا ہوں۔ پھر یکا یک ایک غیر مرئی سے شفیق ہاتھ کی سکون بخش کلائی نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ میری سوچ میں وہ شام اُتر آئی جب میرے حضور ﷺ اندوہ کی تصویر بنے کھڑے تھے اور ابواء کی وادی میں بی بی آمنہؓ کی میت قبر میں اُتاری جا رہی تھی اور آپ ﷺ کے لبوں پر ایک معصوم سا سوال تھرکنے لگا تھا...... ''اماں آپ بولتی کیوں نہیں۔'' ہم کون اور ہماری اوقات کیا۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

[09-01-2007]

حضورؐ رحمت کون و مکاں ہے آپ کا نام
ہر اک درخت کا سایہ ہر ایک چھت کا ستوں
ہر ایک درد کا درماں ہر ایک غم کی دوا
ہر ایک آنکھ کی ٹھنڈک، ہر ایک دل کا سکوں
یہ تیرے دامن رحمت سے ہے بعید کہ میں
تری گلی سے تہی دست لوٹ کر جاؤں
حضورؐ آپ کی دہلیز پر کھڑا ہوں میں
جو آپ سے نہ کہوں حال دل تو کس سے کہوں
حضورؐ کب سے ہوں نا آشنائے لذتِ عشق
نہ میری آنکھ میں آنسو نہ میرا دل پُر خوں
نہ میں جنوں سے شناسا نہ شوقِ آبلہ پا
نہ چشم نم، نہ تمنائے غم، نہ سوزِ دروں
حضورؐ میری نظر خوگرِ تماشا ہے
حضورؐ آتشِ خاموش کو ترستا ہوں
حضورؐ بارگہِ فیض سے عطا ہو مجھے
وہ کیف و درد کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں
وہ آگ دے کہ پگھل جاؤں موم کی صورت
حریم دل کو اُجالوں مثالِ شمع جلوں
مرے وجود کی قاشیں بکھر بکھر جائیں
میں تیرے شہر کی گلیوں کی دُھول بن جاؤں
عطا ہو دولت عرفانؔ و آگہی مجھ کو
ہزار کوس پہ جا کر بھی تیرے پاس رہوں

## بڑا اجر ہے محمد مصطفیٰؐ سے وفا کرنے والوں کا...!

مکہ اور مدینہ...... دو شہر اللہ کے مصطفیٰؐ بندوں سے منسوب نور میں نہائی ہوئی دو بستیاں......کلمہ طیبہ کے دونوں جملوں...... لاالہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کی تعبیر و تفسیر...... قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے رخِ حیات، مرکز و محورِ کائنات اور صاحبِ نصیب وہ لوگ جوان زمینوں کی خاک پاک پہ سجدہ ریز ہوئے۔

اللہ کی اس زمین پر کوئی مقام ایسا نہیں کہ جہاں صبح و شام اپنے خالق و مالک کے حضور اتنی جبینیں خاک پر رکھی جاتی ہوں جو حرم کعبہ کا مقدر ٹھہرتی ہیں اور کوئی حجرۂ نور، ایسا نہیں کہ جہاں سلام گزارنے والے دل شکر گزار آنکھوں کے ساتھ ایسے ہجوم کرتے ہوں جیسے مدینے میں۔

اللہ کی اس زمین پر کیا کوئی خطۂ خاک ایسا ہے کہ جہاں خالق و مالک کائنات کے اطاعت گزار بندے اس کے ذکر کا اس طور اہتمام کرتے ہیں جو مکہ مکرمہ میں دیکھنے میں آتا ہے اور کیا کوئی اور امت ہے جو اپنے نبی کے آستانۂ قدس کی جانب اس وارفتگی و از خود رفتگی، اس شدتِ شوق اور اس تمام و کمال انہماک کے ساتھ سفر کرتی ہو، جس کی شہادت مدینہ منورہ کا ذرّہ ذرّہ فراہم کرتا ہے۔ مکہ اور مدینہ کیا ہیں؟ صراط مستقیم کے دو ایسے شاہد عادل کہ قرآن کریم ان زمینوں کی قسم کھاتا ہے۔

میرا ایمان بھی ہے اور مشاہدہ بھی کہ اذن و اجازت کے بغیر کوئی شخص حرمین کی سرزمین طاہر و مطہر پہ قدم نہیں رکھ سکتا۔ اللّٰھم لبیکّ کہنے کی توفیق اُدھر سے انعام ہوتی ہے تو دل میں حاضری اور حضوری کی امنگ جاگتی ہے۔ عرفان صدیقی خوش نصیب ہیں کہ انہیں حاضری اور حضوری کی سعادت نصیب ہوئی اور بار بار نصیب ہوئی۔ پیشِ نظر کتاب حج اور عمرے کے سفر کا ایک دلنواز اور موثر روداد نامہ ہے۔

عرفان صدیقی............ ذرائع ابلاغ عامہ کی خیرہ کردینے والی روشنیوں کے درمیان بھی دل کے اس نور کو محفوظ کرنے میں کامیاب رہے ہیں جو حسب توفیق اللہ کریم کی اطاعت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری سے ظہور میں آتا ہے۔

پیشِ نظر تحریریں انشا پردازی کے ہنر اور آرائش اسلوب کے سلیقے سے وجود میں نہیں آئی ہیں بلکہ ان کے سوتے اس چشمہ خیر کثیر سے پھوٹے ہیں جو دین کی اصل و اساس ہے۔ عرفان صدیقی کو جوہر تخلیق کی نعمت ارزانی کرنے والے نے ان کے لفظ کو تاثیر کی دولت بے بہا سے بھی مالا مال کر رکھا ہے۔ یہ تحریریں گریۂ نیم شبی کا اسلوب بھی رکھتی ہیں اور آدابِ سحرگاہی کے قرینوں سے بھی آگاہ ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی کرنے والا منادی کرے گا کہ ”ایک طرف کو ہو جائیں، وہ لوگ جو ظالم و جابر حکمرانوں کے لیے قلم تراشتے اور ان کی دواتوں کو روشنائی سے پُر رکھتے تھے“...... مجھے یقین ہے کہ عرفان صدیقی اس گروہ میں شامل نہیں ہوں گے کہ میں ایک زمانے سے انہیں ہر قیمت پر ہر موسم میں حرمتِ حرف کی سربلندی کے لیے اور کلمۂ حق کی سرفرازی کے لیے صف آرا دیکھتا ہوں یہ تحریریں اُن کے حرف و ہنر کی باریابی کی سند ہیں۔

میں نے عرفان صدیقی کے کالموں میں ان کے شوق سفروں کا حال کبھی گریہ بے اختیار کے ساتھ کبھی ضبط گریہ کی منزلوں سے گزرتے ہوئے پڑھا اور ان کے لیے دل سے دعائیں کیں۔ جانے کتنے لوگ ہوں گے جو سفر نامے کا احوال پڑھ کے سفر پر روانہ ہوئے ہوں گے۔ کیسے ہو سکتا ہے اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو کہ میں اگلی حاضری کے وقت عرفان صدیقی کے درجات دنیوی و اُخروی کی بلندی اور ایمان و آبرو کی سلامتی کی دُعا نہ کروں کہ یہ امر خود میرے لیے بھی ایک امر خیر کی صورت ہوگا۔

بڑا اجر ہے محمد مصطفیٰؐ سے وفا کرنے والوں کا اور یہ اجر ان شاء اللہ عرفان صدیقی کو ضرور ملے گا۔

افتخار عارف

ISBN: 978-969-573-183-3
9 789695 731833